حکمِ اذاں

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی

مجمع علمی اسلامی

یہ نغمہ فصلِ گل ولالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ اِلّا اللہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ اِلّا اللہ

لِاَکُوْنَ مَعَ الصَّادِقِیْنَ

یعنی

حُکمِ اذاں

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی
(تیونس)

مجمع علمی اسلامی

تہران — کراچی — بمبئی

خُطبۃ الکتاب

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ. اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ. اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ. وَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ. الَّذِیْ اَرْسَلْتَہٗ رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ. وَاَنْزَلْتَ عَلَیْہِ کِتَابًا لَّارَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ وَسَلِّمْ عَلٰٓی اَھْلِ بَیْتِہِ الْمُطَھَّرِیْنَ الَّذِیْنَ جَعَلْتَ صِرَاطَھُمْ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِالْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ.

فہرس

بِسْمِہٖ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی

گُفتارِ مؤلّف

میری پہلی کتاب ثُمَّ اھْتَدَیْتُ (جس کا اردو ترجمہ تجلّی ہے) کو قارئینِ کرام نے حُسنِ قبُول سے نوازا اور اس پر کئی اہم تبصرے بھی کیے۔ بعض نے اُن مسائل کے بارے میں جو اہلِ سُنّت اور اہلِ تشیّع میں اختلافی ہیں مزید وضاحت چاہی تاکہ دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ اور جو شخص تحقیق کرنا اور حقیقت سے واقف ہونا چاہے، اس کے لیے کوئی شک اور ابہام باقی نہ رہے۔

اِس لیے میں نے یہ ایک اور کتاب اُسی طرز پر لکھی ہے تاکہ انصاف پسند تحقیق کا طالب بہ آسانی حقیقت تک اُسی طرح رسائی حاصل کر سکے جیسے میں نے تفصیلی بحث و مُطالعہ کے بعد حاصل کی ہے۔ برکت کے لیے میں نے اس کتاب کا نام لِاَکُوْنَ مَعَ الصَّادِقِیْنَ رکھا ہے، جو اِس آیت کریمہ سے ماخوذ ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ۔ [1]

ظاہر ہے کہ حضرت رسولؐ اور ان کی آلِ پاکؑ سے بڑھ کر اور کون سچّا ہو سکتا ہے۔ مُسلمانوں میں سے جو بھی ان سچّوں کا ساتھ دینے سے انکار کرے گا وہ خُود کو راہِ راست سے دُور ہٹا ہوا پائے گا اور اس طرح یا تو مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کے زُمرے میں شامل ہو گا یا ضَالِّیْن کے زُمرے میں۔

مجھے ذاتی طور پر تو اس بات کا یقین اور اطمینان ہو گیا ہے۔ اب میری کوشش یہ ہے کہ جہاں تک بَن پڑے دُوسروں کے لیے بھی یہ بات واضح کر دوں مگر میں کسی پر اپنی رائے ٹھونسنا نہیں چاہتا بلکہ دوسروں کی رائے کا بھی احترام کرتا ہوں۔

---

[1] اے ایمان والو! تقویٰ اپناؤ اور سچّوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۱۹)

کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ میں نے اپنی پہلی کتاب کا نام: ثُمَّ اهْتَدَيْتُ کیوں رکھا؟ ان کا کہنا ہے کہ یہ اہلِ سُنّت کو اشتعال دلانا ہے، کیونکہ اگر انھوں نے ہدایت نہیں پائی تو مطلب یہ ہوا کہ وہ ضلالت میں مبتلا ہیں۔

میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ

☆ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن شریف میں ضلالت کا لفظ بھول چوک کے معنیٰ میں آیا ہے۔ ارشاد ہے: قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى[1]

ایک اور جگہ آیا ہے: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى[2]

اِسی طرح قرآنِ کریم میں ضلالت کا لفظ بحث و تفتیش کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اپنے پیارے رسولؐ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى[3] جیسا کہ معلوم ہے، بعثت سے قبل مکّے میں رسول اللہؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر کئی کئی راتیں حقیقت کی تلاش میں غارِ حرا میں بسر کیا کرتے تھے۔

اِنھی معنوں میں آپ کا یہ قول بھی ہے: اَلْحِكْمَةُ ضَآلَّةُ الْمُؤْمِنِ اَيْنَمَا وَجَدَهَا اَخَذَهَا[4]

پس کتاب کا نام اِن ہی معنوں پر محمول کیا جائے۔ ثُمَّ اهْتَدَيْتُ یعنی میں نے حقیقت کی تلاش کی اور اللہ نے مجھے اس تک پہنچا دیا۔

☆ دُوسری بات یہ ہے کہ جب ہم اللہ سُبحانہٗ کا یہ قول پڑھتے ہیں کہ

---

[1] اس کا علم میرے پروردگار کے پاس کتاب میں ہے۔ میرے پروردگار سے کبھی بھول چُوک نہیں ہوتی۔ (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۵۲)

[2] اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دِلا دے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۸۲)

[3] آپ کو حقیقت کی تلاش میں پایا تو آپ کو اس تک پُہنچا دیا۔ (سورۂ ضُحیٰ)

[4] حِکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے، جہاں ملتی ہے لے لیتا ہے۔

وَ اِنِّی لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی[1] تو ہمیں ہدایت نہ پانے والے کی گمراہی کا مُطلق اِحساس نہیں ہونے پاتا۔ کیونکہ جس نے توبہ کی، ایمان لایا اور نیک عمل کیے اسے ضالّ یا گمراہ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے ولایتِ اہلِ بیتؑ کی طرف ہدایت نصیب نہ ہوئی ہو۔

☆ تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ بالفرض جسے ولایتِ اہلِ بیتؑ کے قبول کرنے کی ہدایت نہیں ملی وہ ضالّ ہے اس معنیٰ میں کہ ضلالت ہدایت کی ضد ہے تو یُوں ہی سہی۔ یہ تو وہ حقیقت ہے جس سے اکثر لوگ بھاگتے ہیں، خُوشدلی سے اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتے اور حق کو خواہ کڑوا ہی کیوں نہ ہو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ورنہ اس حدیثِ رسولؐ کے کیا معنیٰ ہیں کہ تَرَکْتُ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا[2] جو اِن دونوں میں سے ایک کے ساتھ تمسُّک نہیں کرے گا اس کے ضال ہونے کے بارے میں یہ حدیث واضح اور صریح ہے۔

بہرحال مجھے تو یقین اور اطمینان ہے کہ میں بھٹکا ہُوا تھا اور اللہ کے فضل سے مجھے کتابِ خدُا اور عترتِ رسُولؐ سے تمسُّک کی ہدایت نصیب ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا۔

میری پہلی کتاب کی طرح اِس کتاب کا نام بھی قُرآنِ کریم سے ماخوذ ہے، جو سب سے سچّا اور سب سے اچھا کلام ہے۔ میں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اگر وہ مکمل طور پر حق نہیں بھی ہے، جب بھی وہ حق سے اِس قدر نزدیک ہے جتنا امکانی طور پر ہوسکتا ہے، کیونکہ اس میں اُن ہی باتوں کا تذکرہ ہے جن پر شیعہ اور سُنّی دونوں کا اتفاق ہے اور جو دونوں کے نزدیک ثابت اور صحیح ہیں۔

---

[1] میں یقیناً اس کو بخش دوں گا جس نے توبہ کی، ایمان لایا اور نیک عمل کیے اور پھر ہدایت پا گیا۔ (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۸۲)

[2] میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں: ایک اللہ کی کتاب اور دُوسری میری عترت، میرے اہلِ بیت۔ جب تک تم ان دونوں کا دامن تھامے رہو گے کبھی گمُراہ نہیں ہوگے۔

میں حریمِ اَقدسِ اِلٰہی میں دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہم مُسلمانوں کو خَیرُ الاُمَم بننے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم مہدیٔ برحق کی قیادت میں قافلۂ انسانیت کی نُور و ھدایت کی طرف رہنمائی کرسکیں، وہی مہدیؑ جن کے ظہور و انقلاب کی خبر دیتے ہوئے ان کے نانا رسول اللہؐ نے بتایا ہے کہ وہ ظُلم و جَور سے سسکتی بِلکتی اِس دُنیا میں ایسا عادلانہ نظام قائم کریں گے کہ ہر طرف انصاف کا دور دورہ ہوگا اور شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں گے۔

مؤلّف

اُسلوبِ تالیف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْمُرْسَلِیْنَ
سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ.

دین ومذہب کی بُنیاد عقائد پر ہوتی ہے جو اُن افکار وتصوّرات کے مجموعے کا نام ہے جس پر اس دین کے ماننے والے ایمان لاتے اور یقین رکھتے ہیں۔ بعض عقائد کو بغیر کسی علمی اور عقلی دلیل کے تسلیم کر لیا جاتا ہے، کیونکہ علم اور عقل دونوں محدود ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات زمان ومکان ہر لحاظ سے لامحدود ہے۔ اس کا احاطہ نہ عِلم کرسکتا ہے اور نہ عقل۔ اِس لیے ہر دین کے پیروکاروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کچھ ایسے اُمور پر بھی ایمان لائیں اور ان کی تصدیق کریں جو عِلم اور عقل کے معیار پر بظاہر پورے نہیں اُترتے۔ مثلاً آگ کا ٹھنڈک اور سلامتی کا مُوجب بن جانا جبکہ عِلم اور عقل کا اِس پر اتفاق ہے کہ آگ گرم اور مُہلک ہے۔ یا کسی پرندے کے ٹکڑے کرکے ان ٹکڑوں کو پہاڑوں پر بکھیر دینا اور پھر بُلانے پر ان پرندوں کا دوڑتے ہوئے آنا جبکہ عِلم اور عقل کے نزدیک یہ سب ناممکن ہے۔ یا اندھے، جُذامی اور پیدائشی نابینا کا حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ پھیر دینے سے اچھّا ہو جانا بلکہ مُردے کا بھی زندہ ہو جانا، جبکہ عِلم اور عقل ان باتوں کی توجیہ نہیں کرسکتے۔

آج زیادہ سے زیادہ عِلم اور عقل نے جو ترقی کی ہے اس سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ مُردہ آنکھ کو زندہ آنکھ سے اور مُردہ دل کو زندہ دل سے بدل دیا جائے، یعنی مُردہ عضو کی جگہ زندہ عضو لگا دیا جائے۔ جیسا کہ معلوم ہے ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ یہ مُردے کو زندہ سے بدلنا ہے اور وہ مُردے کو زندہ کرنا۔ بہ الفاظِ دیگر۔ ایک عمل اصلاح اور درستگی ہے اور دُوسرا تخلیق۔ اِسی لیے

اللہ تعالیٰ نے تحدّی کے ساتھ کہا ہے :

"اے لوگو! تمھارے لیے ایک مثال بیان کی جاتی ہے، اسے غور سے سُنو! جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پُکارتے ہو وہ سب مل کر بھی ایک مکھی تک تو پیدا کر نہیں سکتے"۔[1]

میں نے قصداً وہی مثالیں بیان کی ہیں جو عقل اور علم سے ماوراء ہیں اور جن پر مُسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں سب کا ایمان اور اتفاق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسُولوں کے ہاتھ سے مُعجزات اس لیے ظاہر کیے تاکہ لوگوں کو یہ سمجھایا جائے کہ ان کی عقلیں ہر چیز کا اِدراک اور اِحاطہ کرنے سے قاصر ہیں، کیونکہ اللہ سُبحانہٗ نے ان کو علم کا صرف تھوڑا سا حصّہ عطا کیا ہے اور شاید اسی میں ان کی بھلائی مُضمر تھی اور ان کے جُزوی کمال کے مناسب یہی صورت تھی کیونکہ بہت سُوں نے خدائے منعم کی نعمتوں کا انکار کیا ہے اور بہتوں نے تو خود اس کے وُجود ہی کا انکار کر دیا ہے اور بہت سے اپنے غیر معمولی علم اور عقل کی بِنا پر اتنے بڑے سمجھے گئے کہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر انھی کی پرستش کرنے لگے۔ یہ تو جب ہُوا جب انسان کا علم بھی کم تھا اور اس کی عقل بھی ناقص تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو ہر چیز کا علم عطا کر دیتا پھر تو نہ جانے کیا ہوتا۔

اس لیے میں نے اس کتاب میں اسلامی عقائد میں سے فی الجملہ ان ہی عقائد کو بیان کیا ہے جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں اور جن کے بارے میں مختلف اسلامی فرقوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان ہی کے زیرِ اثر علمِ کلام وجود میں آیا اور وہ فلسفی مکاتبِ فکر نمودار ہوئے جنھوں نے عربی ادبیات کو ایسی میراث کی شکل عطا کر دی جس کی نظیر دوسرے اَدیان میں شاید ناپید ہے۔ یہ کارنامہ تنہا عربوں کا نہیں بلکہ اس کا سہرا ان تمام مسلمانوں کے سر ہے جنھوں نے اپنی زندگی بحث، کھوج اور اسلامی عقائد کے دفاع میں صرف کر دی۔

---

[1] یَاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ. اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ... (سُورۂ حج - آیت ۷۳)

شاید اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ بیشتر اسلامی عقائد عِلم اور عقل دونوں کے لیے قابلِ قبول ہیں۔ میری اِس بات میں اور جو کچھ میں نے اُوپر کہا ہے، کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ ان تمام اُمور میں۔ جن کا اِدراک عِلم اور عقل کے اپنے معیار سے نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمان کا عِلم اور اس کی عقل نصوص قرآنی اور احادیثِ نبوی کے تابع ہیں۔

اِسی بنیاد پر میں نے اپنی کتاب میں سب سے اول ان عقائد سے بحث کی ہے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے اور اس کے بعد ان عقائد کو لیا ہے جن کی بابت فریقین میں اختلاف ہے اور ان کی وجہ سے بغیر کسی جواز کے ایک نے دوسرے پر اعتراض کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہم سب کو اپنی مرضیات پر عمل کی توفیق دے، اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرے۔

وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ

قرآن ۔ اہلِ سُنّت اور اہلِ تشیُّع کی نظر میں

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ باطل کبھی اس کے مُنہ نہیں آسکتا، نہ سامنے سے نہ پیچھے سے۔ احکام، عبادات اور عقائد کے بارے میں قرآن مسلمانوں کے لیے مرجعِ اعلیٰ ہے، جو اس میں شک کرے یا اس کی توہین کرے اسلام پر پھر اس کی کوئی ذمّہ داری نہیں۔ قرآن کے تقدس، اِحترام اور بغیر طہارت کے اس کو چھُونے کی ممانعت پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

لیکن اس کی تفسیر اور تاویل کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف ہے:

شیعوں کے نزدیک قرآن کی تفسیر اور تاویل کا حق صرف ائمّہ اہلِ بیت کو ہے۔ جبکہ اہلِ سُنّت اس سلسلے میں یا تو صحابہ پر اعتماد کرتے ہیں یا ائمّہ اربعہ میں میں سے کسی ایک پر۔

قُدرتی طور پر اس صورتِ حال کی وجہ سے احکام اور بالخصوص فقہی احکام میں اختلاف پیدا ہوا۔ کیونکہ خود اہلِ سُنّت کے چاروں مذاہب میں آپس میں کافی اختلاف ہے، تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ شیعوں اور سُنّیوں میں اور بھی زیادہ اختلاف ہو۔

میں نے کتاب کے شروع میں کہا ہے کہ اِختصار کے پیشِ نظر میں شاید چند ہی مثالیں دے سکوں۔ اِس لیے جو کوئی مزید تحقیق کا خواہشمند ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سمندر کی تہ میں غوطہ زن ہو تاکہ حسبِ توفیق کچھ جَواہر پارے اس کے ہاتھ آسکیں۔

اہلِ سُنّت اور اہلِ تشیُّع کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قرآن کے سب احکام بتلا دیئے ہیں اور اس کی تمام آیات کی تفسیر بیان کر دی ہے، لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ آپ کی وفات کے بعد قرآن کی تفسیر

اور تاویل کے لیے کس سے رجوع کیا جائے ؟

اہل سُنّت کہتے ہیں کہ سب صحابہ قرآن کی تفسیر کے بدرجۂ اولیٰ اہل ہیں اور ان کے بعد علماء اُمّتِ اسلامیہ۔ جہاں تک تاویل کا تعلق ہے تو اہلِ سُنّت کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ۔

بجز اللہ کے کسی کو اس کی تاویل کا علم نہیں۔

اِس موقع پر مجھے وہ گفتگو یاد آگئی جو ایک دفعہ میرے اور تیونس کے مشہور عالم شیخ زغوانی کے مابین ہوئی تھی۔ میں نے ان سے اِس حدیث کے بارے میں پوچھا تھا جو حضرت موسیٰؑ کے مَلکُ الموت کو تھپڑ مار کر ان کی آنکھ نکال دینے کے بارے میں بخاری اور مُسلم میں آئی ہے[1]

شیخ زغوانی بُخاری پڑھانے اور اس کی شرح کے ماہر سمجھے جاتے تھے انھوں نے فوراً جواب دیا: جی ہاں! یہ حدیث بُخاری میں موجود ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ بُخاری میں جو بھی حدیث ہے اس کی صحّت کے بارے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے کہا: میں سمجھا نہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اِس کی تشریح فرما دیں!

وہ: صحیح بُخاری کتابُ اللہ کی طرح ہے، جو سمجھ سکتے ہو اُسے سمجھ لو، جو نہیں سمجھ سکتے اُسے چھوڑ دو اور اس کا مُعاملہ خُدا کے سپرد کر دو۔

میں: صحیح بُخاری کس طرح قرآن کی طرح ہے؟ ہم سے تو قرآن کو بھی سمجھنے کے لیے کہا گیا ہے۔

وہ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ. هُوَ الَّذِيٓ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ. فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ.[2]

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ باب وفاتِ موسیٰؑ اور مُسلم جلد ۲ صفحہ ۳۰۰ باب فضائلِ موسیٰؑ۔

[2] وہ وہی اللہ ہے جس نے آپؐ پر کتاب اتاری۔ اس میں کچھ مُحکم آیتیں ہیں جن پر اصل کتاب

میں بھی شیخ زغوانی کے ساتھ ساتھ تلاوت کر رہا تھا، میں نے اِلَّا اللّٰہُ کے بعد پڑھا وَالرَّاسِخُونَ فِی العِلمِ تو انھوں نے چیخ کر کہا:

وہ: ٹھہرو! اَللّٰہُ کے بعد وقف لازم ہے۔

میں: حضرت! واوِ عاطِفہ ہے، اَلرَّاسِخُونَ فِی العِلمِ کا عطف اَللّٰہُ پر ہے۔

وہ: نہیں! یہ نیا جملہ ہے: وَالرَّاسِخُونَ فِی العِلمِ یَقُولُونَ اٰمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّن عِندِ رَبِّنَا[1] گو وہ اس کی تاویل سے ناواقف ہوں۔

میں: حضرت! آپ تو بڑے عالِم ہیں، آپ کیسے اس مطلب کو تسلیم کرتے ہیں؟

وہ: اس لیے کہ صحیح تفسیر یہی ہے۔

میں: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ سُبحانَہ، نے ایسا کلام نازل کیا ہو جس کا مطلب صرف وہی جانتا ہے۔ آخر اس میں کیا حکمت ہے۔ ہمیں تو قرآن پر غور کرنے اور اس کو سمجھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ قرآن نے تو لوگوں کو للکارا ہے کہ اگر ہوسکے تو اس جیسی کوئی آیت یا کوئی ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ اگر اللہ کے سوا کوئی قرآن کو سمجھتا ہی نہیں تو پھر اس چیلنج کا کیا مطلب؟

اِس پر شیخ زغوانی ان لوگوں کی طرف مُتوجّہ ہوئے جو مجھے ان کے پاس لیکر گئے تھے اور کہنے لگے: "تم میرے پاس ایسے آدمی کو لے کر آئے ہو جو مجھے صرف لاجواب کرنا چاہتا ہے، وہ کوئی سوال پوچھنا نہیں چاہتا۔" پھر انھوں نے ہمیں یہ کہتے ہوئے رخصت کر دیا: "میں بیمار ہوں، تم میری بیماری بڑھانے کی کوشش نہ کرو۔" جب ہم ان

کا مدار ہے اور کچھ مُتشابہ آیتیں ہیں۔ اب جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے اسی حصے کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مُتشابہ ہے۔ ان کا مقصد شورش پھیلانا اور مُتشابہ آیات کا غلط مطلب نکالنا ہے حالانکہ ان آیات کا صحیح مطلب کوئی نہیں جانتا سِوائے اللہ کے۔" (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۷)

[1] اور رَاسِخُون فِی العلم کہتے ہیں: "ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔"

کے پاس سے نکلے تو میرے ساتھیوں میں سے ایک تو مجھ سے سخت خفا تھا، باقی چار میرے طرفدار تھے اور کہہ رہے تھے کہ معلوم ہوگیا کہ بقول شخصے "شیخ بالکل کورے ہیں۔"

اب میں پھر اصل موضوع پر آتا ہوں۔ قرآن کی تاویل نہ کرنے پر سب اہلِ سُنّت کا اتفاق ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک قرآن کی تاویل کا علم صرف اللہ کو ہے۔

لیکن شیعہ کہتے ہیں کہ ائمۂ اہلبیتؑ قرآن کی تفسیر اور تاویل دونوں کے اہل ہیں اور راسخون فی العلم سے وہی مراد ہیں اور وہی وہ اہلِ ذکر ہیں جن سے رجوع کرنے کا اللہ نے ہمیں اس آیت میں حکم دیا ہے: فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [1] اور یہی وہ ہیں جن کو اللہ نے منتخب قرار دیا ہے اور اپنی کتاب کے علم کا وارث بنایا ہے۔ ارشاد ہے: ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا [2]

اِسی مقصد کے لیے رسول اللہؐ نے انھیں قرآن کا ہمدوش اور ثقلین میں سے ایک قرار دیا ہے اور ان سے تمسُّک کرنے کا سب مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَ بَيْتِيْ
مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ اَبَدًا. [3]

میں تمھارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، ایک تو اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت، میرے اہلِ بیت جب تک تم ان کا دامن تھامے رہو گے، میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے۔

مُسلم کے الفاظ ہیں: "کتابُ اللہ اور میرے اہلبیت۔ میں تمھیں اپنے اہلبیتؑ

---

[1] اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو (سورۂ نحل۔آیت ۴۳) تفسیر طبری جلد ۱۴ صفحہ ۱۰۹ تفسیر ابن کثیر جلد ۲۔

[2] پھر ہم نے وارث بنایا کتاب کا ان کو جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ (سورۂ فاطر آیت ۳۲)

[3] جامع ترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۹۔ حدیث ۳۸۷۴ مطبوعہ دارالفکر بیروت۔

کے بارے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں"۔ آپ نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔[1]

سچی بات یہ ہے کہ میرا رُجحان شیعہ قول کی طرف ہے کیونکہ وہ زیادہ سمجھ میں آنے والا ہے۔ قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اس کی تفسیر بھی ہے اور تاویل بھی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ صرف اہل بیتؑ ہی کو اس کے سب علوم سے واقف ہونا چاہیے کیونکہ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ اللہ سبحانہٗ سب لوگوں کو قرآن کی سمجھ عطا کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ۔ عُلمائے اسلام تک میں قرآن کی تفسیر میں اختلاف ہے، مگر جیساکہ خود اللہ نے گواہی دی ہے راسخون فی العلم قرآن کی تاویل سے واقف ہیں اس لیے ان کے مابین قرآن کی تفسیر میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔

یہ بھی بالبداہت معلوم ہے کہ اہلِ بیتؑ سب سے زیادہ عالِم، سب سے زیادہ پرہیزگار، سب سے زیادہ مُتّقی اور سب سے افضل تھے۔ فَرَزْدَق نے ان کے بارے میں کہا ہے ؎

وَاِنْ عُدَّ اَهْلُ التُّقٰی کَانُوْا اَئِمَّتَهُمْ

وَاِنْ قِيْلَ مَنْ خَيْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ قِيْلَ هُمْ

اگر اہلِ تقویٰ کو گِنوایا جائے تو یہ اُن سب کے امام ہیں۔

اور اگر پُوچھا جائے کہ دُنیا میں بہترین لوگ کون ہیں تو کہا جائے گا کہ یہی تو ہیں۔

میں اِس سلسلے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا جس سے ظاہر ہو جائیگا کہ شیعہ وہی کچھ کہتے ہیں جو قرآن کہتا ہے اور جس کی تائید سُنّتِ نبوی سے ہوتی ہے۔

آیئے یہ آیت پڑھیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۶۲ باب فضائل علی بن ابی طالبؑ۔

لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ .....

میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کی جگہ کی ، اور اگر تم سمجھو تو یہ ایک بڑی قسم ہے۔ واقعی یہ ایک قابلِ احترام قرآن ہے، ایک خفیہ کتاب میں ، جسے کوئی مَس نہیں کرسکتا سوائے ان کے جو پاک کیے گئے ہیں۔ (سورۃ واقعہ - آیات ۷۵تا ۷۹)

اِن آیات سے بغیر کسی ابہام کے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ اہلِ بیتؑ ہی ہیں جو قرآن کے چھپے ہوتے معنیٰ سمجھ سکتے ہیں۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ قسم جو ربُّ العزّت نے کھائی ہے واقعی ایک بڑی قسم ہے بشرطیکہ ہم سمجھیں۔ کیونکہ اللہ نے (دوسری سورتوں میں) قسم کھائی ہے عَصر کی ، قَلَم کی ، اِنجیر کی ، زیتُون کی ، ان کے مقابلے میں مَوَاقِعُ النجوم یعنی ستاروں کی جگھوں کی یا ستاروں کی مَنازل کی قسم ، ایک بڑی قسم ہے کیونکہ ستاروں کی منازل اللہ کے حُکم سے پراسرار طور پر کائنات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب اللہ قسم کھاتا ہے تو یہ قسم کسی بات کی ممانعت کے لیے نہیں ہوتی بلکہ کسی بات کی نفی یا اثبات کے لیے ہوتی ہے۔

قسم کے بعد اللہ سُبحانہٗ زور دے کر کہتا ہے کہ واقعی یہ قابلِ احترام قرآن ، ایک کتاب مَکنُون میں ہے اور مکنون خُفیہ یا چھپے ہوتے کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ . اس میں لَا صرف نفی کے لیے ہوسکتا ہے کیونکہ قسم کے بعد آیا ہے۔ یَمَسُّہٗ کے معنیٰ یہاں درک کرنے اور سمجھنے کے ہیں، ہاتھ سے چھُونے کے نہیں جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ دراصل مَسّ اور لَمس دو لفظ ہیں اور دونوں کے معنیٰ میں فرق ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ . [1]

---

[1] جو لوگ مُتّقی ہیں جب انھیں کوئی شیطانی خیال ستاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں جس سے انھیں یکایک سُجھائی دینے لگتا ہے۔ (سورۃ اعراف - آیت ۲۰۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِّ۔[1]

اِن آیات میں مَسّ کا تعلق دل و دماغ سے ہے ہاتھ سے چھُونے سے نہیں۔ ہم پوُچھتے ہیں یہ کیسی بات ہے کہ اللہ سُبحانہٗ تو قسم کھاکر کہتا ہے کہ قرآن کو کوئی چھُو نہیں سکتا بجُز اس کے جو پاک کیے گئے۔ جبکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بنی اُمیہّ کے حکمران اِفلاسِ ایمانی کے سبب توہینِ قرآن کے مُرتکب ہوتے رہے ہیں اور ولید بن مروان نے تو یہاں تک کہا تھا کہ

"تُو ہر جابر سرکش کو عذاب سے ڈراتا ہے اور میں بھی جابر اور سرکش ہوں، جا محشر میں اپنے رب سے کہہ دینا کہ ولید نے مجھے پھاڑ دیا تھا۔"

ہم نے خُود دیکھا ہے کہ جب اسرائیلیوں نے بیروت پر قبضہ کیا تو انھوں نے قرآن پاک کو اپنے پیروں تلے روندا اور جلایا۔ اس کی دل ہلا دینے والی تصویریں ٹیلیوژن پر دکھائی گئی تھیں[2]

اِس لیے یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ قسم کھائے اور پھر قسم توڑے۔ البتہ اللہ سُبحانہٗ نے اس کی نفی کی ہے کہ قرآنِ مَکنُون کے معانی کو کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے، بجُز اس کے اُن منتخب بندوں کے جنھیں اس نے چُن لیا ہے اور خوُب پاک کیا ہے۔

اس آیت میں مُطَهَّرُوْنَ اسم مفعول کا صیغہ ہے جس کے معنیٰ ہیں: "وہ جو پاک کیے گئے"۔ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ

---

[1] جو لوگ سُود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) ایسے اُٹھیں گے جیسے وہ اُٹھتا جو شیطان کے اثر سے خبطی ہوگیا ہو۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۷۵)

[2] پاکستان جیسے اسلامی ملک میں بھی مذہبی وسیاسی جھگڑوں میں قرآن جلائے جاتے ہیں اور مسجدوں کی بے حُرمتی کی جاتی ہے جو باعثِ شرم اور قابلِ مذمت ہے۔ (ناشر)

وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔

اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ اے اہلبیت تم سے رِجس[1] کو دُور رکھے اور تمھیں خُوب پاک کر دے۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۳۳)

سو اس آیت میں لَا یَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کے معنی ہیں کہ "قرآن کی حقیقت کو کوئی نہیں سمجھتا سوائے اہلِ بیتؑ کے۔" اسی لیے رسول اللہؐ نے ان کے بارے میں کہا ہے :

اَلنُّجُوْمُ اَمَانٌ لِاَهْلِ الْاَرْضِ مِنَ الْغَرَقِ ، وَاَهْلُ بَيْتِيْ اَمَانٌ لِاُمَّتِيْ مِنَ اخْتِلَافٍ فَاِذَا خَالَفَتْهَا قَبِيْلَةٌ مِّنَ الْعَرَبِ اخْتَلَفُوْا فَصَارُوْا حِزْبَ الْاِبْلِيْسِ ۔

ستارے زمین والوں کو ڈوبنے سے بچاتے ہیں اور میرے اہلبیتؑ میری اُمت کو اختلاف سے بچاتے ہیں۔ جب عرب کا کوئی قبیلہ میرے اہلبیت کی مخالفت کرتا ہے تو اس قبیلے میں پھُوٹ پڑ جاتی ہے اور وہ ابلیس کی جماعت بن جاتا ہے۔[2]

اس لیے شیعوں کا یہ کہنا کہ قرآن اہلبیتؑ ہی سمجھتے ہیں ایسی بات نہیں جیسا کہ اہلِ سُنّت دعویٰ کرتے ہیں کہ شیعہ تو جھوٹ بولتے ہیں اور اہلبیت کی محبت میں غلُوّ کرتے ہیں کیونکہ شیعوں کی تائید میں دلائل صِحاح سِتّہ میں موجود ہیں۔

سُنّتِ رسُولؐ ۔ اہلِ سُنّت اور اہلِ تشیّع کی نظر میں

سنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہر قول، فعل اور تقریر شامل ہے۔ یہ مسلمانوں کے نزدیک اعتقادات، عبادات اور احکامات کا دوسرا بڑا مآخذ ہے

---

[1] بُرائی اور بری چیز کو رِجس کہتے ہیں۔ رِجس کی مختلف اقسام ہیں :- کوئی چیز طبیعی طور پر بُری ہوتی ہے مثلاً مُردار۔ یا عقلی طور پر مثلاً جوا۔ اور یا شرعی پر بُری ہوتی ہے مثلاً شرک۔ (ناشر)

[2] یہ حدیث حاکم نے ابن عباسؓ کے حوالے سے مُستدرک علی الصحیحین جلد ۳ میں بیان کی ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اَسناد صحیح ہیں مگر بُخاری اور مُسلم نے یہ حدیث روایت نہیں کی۔

اہل سُنّت والجماعت سُنّتِ نبوی کے ساتھ خلفائے راشدین یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کی سُنّت کا بھی اضافہ کرتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں ایک حدیث ہے کہ

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ مِنْ بَعْدِي عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔ [1]

اس کی ایک بہت واضح مثال نماز تراویح ہے جس سے رسول اللہ ص نے منع کردیا تھا، [2] مگر سُنّی، سُنّتِ عمر کی پیروی میں یہ نماز پڑھتے ہیں۔

بعض اہل سُنت والجماعت سُنّتِ رسول ص کے ساتھ سُنّتِ صحابہ (تمام صحابہ بغیر کسی تفریق کے) کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں ایک روایت ہے کہ

اَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِاَيِّهِمِ اقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ۔ [3]

حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں کہ حدیث اَصْحَابِي كَالنُّجُومِ شیعہ حدیث [4] اَلْاَئِمَّةُ مِنْ اَهْلِ بَيْتِي كَالنُّجُومِ بِاَيِّهِمِ اقْتَدَيْتُمِ اهْتَدَيْتُمْ کے مقابلے پر وضع کی گئی ہے۔ شیعہ حدیث کی معقولیت میں تو اس لیے شک نہیں کیونکہ ائمہ اہلبیت ع علم وزہد اور ورع وتقویٰ کے اعلیٰ ترین معیار پر تھے۔ ان کے پیروکاروں کو تو چھوڑیئے، اس کی گواہی تو ان کے دشمن بھی دیتے ہیں اور پوری تاریخ اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے۔

لیکن حدیث اَصْحَابِي كَالنُّجُومِ ایسی حدیث ہے جسے عقل سلیم قبول نہیں کرتی، کیونکہ صحابہ میں تو وہ لوگ بھی ہیں جو رسول اللہ ص کے بعد مُرتد ہوگئے تھے [5] نیز

---

[1] تم میری سُنّت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین کی سُنّت کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔ (مسندِ امام احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۲۶)

[2] صحیح بخاری جلد ۷ صفحہ ۹۹ باب مَا يَجُوزُ مِنَ الْغَضَبِ وَالشِّدَّةِ لِاَمْرِ اللّٰهِ۔

[3] میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی پیروی کرلوگے ہدایت پاجاؤ گے۔ (صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ اور مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۹۸)

[4] قاضی نعمان بن محمد دعائم الاسلام جلد ا صفحہ ۸۶ مطبوعہ دار المعارف، مصر۔

[5] جیسے اہلِ رِدّہ جن سے حضرت ابوبکر نے جنگ کی تھی۔

یہ کہ اصحاب بہت سے امور میں ایک دوسرے کے خلاف تھے اور ایک دوسرے میں کیڑے نکالتے تھے[1] ایک دُوسرے پر لعنت کرتے تھے[2] بلکہ ایک دوسرے کے خلاف لڑتے تھے[3] حتّٰی کہ بعض صحابہ پر تو شراب نوشی، زنا اور چوری وغیرہ کے الزام میں حد جاری کی گئی تھی۔ ان حالات میں کیسے کوئی عاقل اس حدیث کو قبول کرسکتا ہے جس میں ایسے لوگوں کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور کیسے کوئی امام علیؑ کے خلاف جنگ میں مُعاویہ کی پیروی کرسکتا ہے جبکہ رسول اللہؐ نے مُعاویہ کو اِمَامُ الْفِئَۃِ الْبَاغِیَۃِ کہا تھا[4]۔ وہ شخص کیسے ہدایت یافتہ ہوسکتا ہے جو عَمرو بن عاص، مُغیرہ بن شعبہ اور بُسر بن ابی ارطاۃ کی پیروی کرے جنھوں نے اُموی اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔

کوئی بھی باشعور قاری جب حدیث اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ پڑھے گا تو اسے معلوم ہوجائے گا کہ یہ گھڑی ہوئی حدیث ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے مخاطب صحابہ ہیں۔ اور رسول اللہؐ یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ "اے میرے اصحاب! میرے اصحاب کا اتباع کرنا۔ لیکن دوسری حدیث کہ "اے میرے اصحاب! ان ائمہ کا اتباع کرنا جو میرے اہلبیت میں سے ہیں کیونکہ میرے بعد وہ تمھاری رہنمائی کریں گے" بالکل حق ہے۔ اس میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کے متعدد شواہد سُنّتِ رسولؐ میں پائے جاتے ہیں۔

شیعہ کہتے ہیں کہ حدیث عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ مِنْ بَعْدِیْ سے مُراد ائمۂ اِثنا عشر ہیں۔ ان ہی سے تمسُّک اور ان ہی کا اتباع، کلامُ اللہ سے تمسّک اور کلام اللہ کے اتباع کی طرح ہے[5]

---

[1] جیسے اکثر صحابہ حضرت عثمان پر طعن کرتے تھے، یہاں تک کہ عُثمان کو قتل کردیا گیا۔

[2] جیسے مُعاویہ نے امام علیؑ پر لعنت کرنے کا حکم دیا تھا۔

[3] جیسے جنگ جَمَل، جنگ صِفّین اور جنگ نہروان وغیرہ۔

[4] حدیث کہ "عمّارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔"

[5] صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۸۔ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۶۲ خصائص امیرالمومنینؑ، امام نسائی۔ کنزالعمال جلد ۱ صفحہ ۴۴۔ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۸۹۔ مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۴۸۔ صواعق محرقہ صفحہ ۱۴۸۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹۴۔ الطبرانی جلد ۱ صفحہ ۱۳۱۔

میں نے عہد کر رکھا ہے کہ جن روایات سے شیعہ استدلال کرتے ہیں میں ان میں سے صرف وہی روایات نقل کروں گا جو اہلِ سُنّت والجماعت کی صِحاح میں پائی جاتی ہیں، ورنہ شیعوں کی کتابوں میں تو اس سے کئی گُنا زیادہ احادیث موجود ہیں اور ان کی عبارت بھی زیادہ واضح اور صاف ہے[1]

یہ بھی واضح کر دوں کہ شیعہ یہ نہیں کہتے کہ ائمہؑ اہلبیتؑ کو تشریع کا حق حاصل ہے یا ان کی سُنّت ان کا اپنا اجتہاد ہے بلکہ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ ائمہؑ کے بیان کیے ہوتے سب احکام یا تو قرآن سے ماخوذ ہیں یا اس سُنّت سے جس کی تعلیم رسول اللہؐ نے امام علیؑ کو دی تھی اور انھوں نے اپنی اولاد کو۔ اِس طرح ائمہؑ کا علم مُتوارث ہے۔

اس ضمن میں شیعوں کے پاس بہت سے دلائل ہیں جن کی بنیاد ان روایات پر جو علمائے اہل سُنّت نے اپنی صِحاح، مَسانید اور تاریخوں میں نقل کی ہیں — یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے جو بار بار ذہن میں آتا ہے کہ اہل سُنّت والجماعت کیوں ان آیات کے مضمون پر عمل نہیں کرتے جو خود ان کے نزدیک صحیح ہیں ؟؟؟

پھر جس طرح اہل سُنّت اور اہلِ تشیُّع کے درمیان قرآن کی تفسیر میں اختلاف ہے اسی طرح ان کے درمیان احادیث کے معانی میں بھی اختلاف ہے۔ مثلاً خلفائے راشدین کے الفاظ آئے ہیں اور اس حدیث کو فریقین نے صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن اہل سُنّت کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین سے مراد وہ چار خلیفے ہیں جو رسول اللہؐ کے بعد مسند خلافت پر بیٹھے۔ اور شیعہ کہتے ہیں کہ ان سے مُراد بارہ خلفاء ہیں اور وہ ائمہؑ اہلِ بیتؑ ہیں۔

یہی اختلاف ان تمام اشخاص کے بارے میں ہے جن کو قرآن یا رسولؐ نے پاک قرار دیا ہے اور مُسلمانوں کو ان کے اتّباع کا حکم دیا ہے۔ اس کی مثال رسول اللہؐ

---

[1] میں صرف ایک مثال دوں گا۔ شیخ صدوقؒ نے اِکمال الدین میں بسندِ امام صادق عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ ایک روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"میرے بعد بارہ امام ہوں گے: پہلے امام علیؑ اور آخری امام قائم ہوں گے یہ سب میرے خلیفہ اور وصی ہوں گے"

کا یہ قول ہے کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ اَفْضَلُ مِنْ اَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَاءِیْلَ (میری اُمّت کے عُلماء بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے افضل ہیں) یا یہ قول کہ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ (عُلماء انبیاء کے وارث ہیں) [1]

اہلِ سُنّت کے نزدیک یہ حدیث عام ہے اور اس کا مصداق سب علمائے اُمّت ہیں۔ جبکہ شیعوں کے نزدیک یہ حدیث صرف بارہ اماموں سے مخصوص ہے اور اسی بنا پر وہ ائمہؑ اِثناعشر کو اُولُوالعزم انبیاءؑ کو چھوڑ کر سب انبیاء سے افضل قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل کا رُجحان بھی اسی تخصیص کی طرف ہے:

اوّل تو اس لیے کہ کلامِ الٰہی کے مطابق قرآن کی تاویل کا علم صرف رَاسِخُون فِی الْعِلْم سے مخصوص ہے۔ اسی طرح قرآن کے علم کا وارث بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے چیدہ وچُنیدہ بندوں کو ہی قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تخصیص ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اہلِ بیتؑ کو سَفِیْنَۃُ النَّجَاۃِ۔ اَئِمَّۃُ الْھُدٰی اور مَصَابِیحُ الدُّجیٰ کہا ہے اور وہ ثَقَلِ ثَانِی قرار دیا ہے جو گمراہی سے بچانے والا ہے۔

دُوسرے اِس لیے کہ اہلِ سُنّت والجماعت کا قول اس تخصیص کے منافی ہے جو قرآن اور حدیثِ نبوی سے ثابت ہے۔ عقل بھی اس قول کو قبول نہیں کرتی کیونکہ اس میں ابہام ہے اس لیے کہ اس میں حقیقی علماء اور بناوٹی علماء میں فرق نہیں کیا گیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ یہاں وہ عُلماء بھی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہمہ اقسامِ رِجس سے پاک رکھا ہے اور وہ عُلماء بھی ہیں جنھیں اُموی اور عبّاسی حکمرانوں نے اُمّت پر سوار کر دیا تھا۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دو قسم کے علماء ہیں: ایک وہ جن کو علم لَدُنّی عطا ہوا ہے۔ اور دُوسرے وہ جنھوں نے اُستادوں سے راہِ نجات کی تعلیم حاصل کی۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تاریخ کسی ایسے اُستاد کا ذکر نہیں کرتی جس سے ائمہؑ اہلبیت نے تعلیم حاصل کی ہو۔ بجز اس کے کہ بیٹے نے باپ سے علم حاصل کیا ہے۔ اس کے باوجود خود عُلمائے اہلِ سُنّت نے اپنی کتابوں میں ان ائمہؑ کی علمیت کی حیرت انگیز داستانیں بیان کی ہیں خصوصاً امام باقرؑ، امام صادقؑ

---

[1] صحیح بخاری جلد اول کتاب العلم اور صحیح ترمذی کتاب العلم۔

اور امام رضاؑ سے متعلق۔ امام رضاؑ کا تو ابھی لڑکپن ہی تھا جب انھوں نے اپنی کثرتِ معلومات سے چالیس قاضیوں کو مبہوت کر دیا تھا جنھیں مامون نے ان کے مقابلے کے لیے جمع کیا تھا۔[1]

اسی سے یہ راز بھی آشکارا ہو جاتا ہے کہ سُنّیوں کے مذاہبِ اربعہ کے اماموں میں تو ہر مسئلے میں اختلاف ہے اور اہل بیت کے بارہ اماموں میں کسی ایک مسئلہ میں بھی اختلاف نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر اہل سنت کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ یہ آیات اور احادیث بلا امتیاز سب علمائے اُمت کے بارے میں ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ آرا۔ اور مذاہب کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ شاید علمائے اہلِ سُنّت نے اپنی رائے کی اسی کمزوری کو بھانپ لیا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے عقیدے کی تفریق سے بچنے کی خاطر ائمۂ اربعہ کے وقت سے ہی اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا۔

اس کے برعکس، شیعوں کا نظریہ اتّفاق اور ان ائمہؑ سے وابستگی کی دعوت دیتا ہے، جنھیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے خصوصی طور پر ان سب عُلوم و معارف سے نوازا ہے جن کی ہر زمانے میں مسلمانوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اب یہ کسی مُدّعی کی مجال نہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے کوئی غلط بات منسوب کر کے کسی نئے مذہب کی بُنیاد ڈالے اور لوگوں کو اس کے اتباع پر مجبور کرے۔

اس مسئلے میں شیعہ، سُنّی اختلاف کی نوعیت بالکل وہی ہے جو مہدئ موعود سے متعلق احادیث کے بارے میں ان کے اختلاف کی ہے۔ مہدئ موعود سے متعلق حدیث کی صحّت کے دونوں فریق قائل ہیں۔

شیعوں کے یہاں مہدی کی شخصیت معلوم ہے۔ یہ بھی علم ہے کہ ان کے باپ دادا کون ہیں۔ لیکن اہلِ سُنّت کے خیال میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں کہ مہدی کون صاحب ہوں گے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ آخری زمانے میں پیدا ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک

---

[1] العقد الفرید ابن عبدربہ اور الفصول المہمہ ابن صبّاغ مالکی جلد ۳۔

بہت سے لوگ مہدی ہونے کا دعویٰ کر چکے ہیں۔ خود مجھ سے مدنیہ سلسلے کے شیخ اسماعیل ہادفی نے کہا کہ وہ مہدی منتظر ہیں۔ یہ بات انھوں نے میرے ایک دوست کی موجودگی میں کہی جو اس وقت ان کا مرید تھا، بعد میں شیعہ ہوگیا۔

بہت سے اہلِ سُنّت اپنے بچّے کا نام مہدی اس امید میں رکھتے ہیں کہ شاید وہی امامِ منتظَر و موعود ہو۔ لیکن شیعوں کے یہاں یہ ممکن ہی نہیں کہ اب پیدا ہونے والا کوئی شخص ایسا دعویٰ کر سکے۔ کچھ لوگ اپنے بچّوں کا نام مہدی برکت کے لیے ضرور رکھتے ہیں جیسے بعض لوگ اپنے بیٹے کا نام محمد یا احمد یا علی رکھتے ہیں۔ شیعوں کے نزدیک مہدی کا ظہور خود ایک معجزہ ہے کیونکہ وہ اب سے بارہ سو سال پہلے پیدا ہوتے تھے، اس کے بعد غائب ہوگئے۔ اِس طرح شیعہ خود بھی آرام سے ہوگئے اور انھوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے بھی راستہ بند کر دیا۔

اِسی طرح بہت سی صحیح احادیث کے معنی میں بھی شیعوں اور سُنّیوں کے درمیان اختلاف ہے۔ حتّیٰ کہ ایسی احادیث کے معنی میں اختلاف ہے جن کا تعلق اشخاص سے نہیں مثلاً ایک حدیث ہے:

اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ

سُنّی کہتے ہیں: اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی فقہی مسئلہ میں فقہاء کے مابین اختلاف مسلمان کے لیے رحمت ہے کیونکہ اس طرح وہ مسئلہ کا وہ حل اختیار کر سکتا ہے جو اس کے حالات کے مناسب ہو اور اسے پسند ہو۔ مثلاً اگر کسی مسئلہ میں امام مالک کا فتویٰ سخت ہو تو وہ مالکی ہونے کے باوجود امام ابوحنیفہ کی تقلید کر سکتا ہے اگر اسے ان کا مذہب سہل اور آسان معلوم ہو۔

مگر شیعہ اس حدیث کا مطلب کچھ اور بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں روایت ہے کہ جب امام صادق علیہ السلام سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے کہا کہ رسول اللہ صؐ نے صحیح فرمایا۔ سائل نے پوچھا کہ اگر اختلاف رحمت ہے تو کیا اتفاق مصیبت ہے؟ امام صادقؑ نے کہا: نہیں! یہ بات نہیں، تم غلط راستے پر چل پڑے اور اکثر لوگ اس حدیث کا مطلب غلط سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ صؐ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "حصولِ علم کے لیے ایک دوسرے کے پاس جانا اور سفر کرنا رحمت ہے"۔ آپ نے

اپنے قول کی تائید میں یہ آیت پڑھی :

"فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ."

ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر جماعت میں سے ایک گروہ تحصیل علم کے لیے نکلا کرے تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرے، پھر اپنی قوم کے لوگوں کے پاس واپس آکر ان کو ڈرائے۔ کیا عجب کہ وہ غلط کاموں سے بچیں[1]

پھر فرمایا کہ اگر لوگ دین میں اختلاف کریں گے تو وہ شیطانی جماعت بن جائیں گے۔

جیسا کہ ظاہر ہے، یہ تفسیر اطمینان بخش ہے کیونکہ اس میں عقائد میں اختلاف کے بجائے اتحاد کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ نہیں کہ لوگ جماعتوں اور گروہوں میں بٹ جائیں ایک اپنی رائے کے مطابق کسی چیز کو حلال قرار دے تو دوسرا اپنے قیاس کی بنا پر اسی چیز کو حرام قرار دے دے۔ ایک اگر کراہت کا قائل ہو تو دوسرا استحباب کا اور تیسرا وجوب کا[2]

عربی زبان میں دو مختلف ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں :

اِخْتَلَفْتُ اِلَيْكَ اور اِخْتَلَفْتُ مَعَكَ .

دونوں کے معنیٰ میں واضح فرق ہے۔ اِخْتَلَفْتُ اِلَيْكَ کے معنیٰ ہیں: "میں تیرے پاس آیا۔" اور اِخْتَلَفْتُ مَعَكَ کے معنیٰ ہیں "میں نے تیری رائے سے اختلاف کیا۔"

اِس کے علاوہ، اہل سُنّت والجماعت نے حدیث کا جو مفہوم اختیار کیا ہے وہ اس لحاظ سے بھی نامناسب ہے کہ اس میں اختلاف اور تفرقہ کی دعوت ہے جو قرآن کریم کی اس تعلیم کے منافی ہے جس میں اتحاد و اتفاق اور ایک مرکز پر جمع ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

---

[1] سورۂ توبہ آیت ۱۲۲۔

[2] مالکیوں کے نزدیک نماز میں بسم اللہ پڑھنا مکروہ ہے۔ شافعیوں کے نزدیک واجب ہے۔ حنفیوں اور حنبلیوں کے نزدیک مستحب ہے مگر کہتے ہیں کہ جہری نماز میں بھی آہستہ پڑھی جاتے۔

وَاِنَّ هٰذِہٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ.

اور یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں اس لیے مجھ سے ڈرتے رہو۔ (سورۃ مومنون۔ آیت ۵۲)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا.

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور نااتفاقی نہ کرو۔

(سورۃ آل عمران۔ آیت ۱۰۳)

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ.

آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ ناکام رہوگے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (سورۃ انفال۔ آیت ۴۶)

اِس سے بڑھ کر اور کیا پھوٹ اور تفرقہ ہوگا کہ اُمّتِ واحدہ ایسے مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹ جائے جو ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہوں، ایک دوسرے کا مذاق اُڑاتے ہوں بلکہ ایک دوسرے کو کافر کہتے ہوں یہاں تک کہ ایک دُوسرے کا خُون بہانا جائز سمجھتے ہوں۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں بلکہ مختلف ادوار میں فی الواقع ایسا ہوتا رہا ہے جس کی سب سے بڑی گواہ تاریخ ہے اور اُمّت میں پھوٹ کے اسی انجام سے خود اللہ تعالیٰ نے ڈرایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ۔

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو دلائل آجانے کے باوجود آپس میں بٹ گئے اور ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے۔

(سورۃ آل عمران۔ آیت ۱۰۵)

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ.

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ بٹ گئے ان سے تم کو کچھ کام نہیں۔ (سورۃ انعام۔ آیت ۱۶۰)

وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ

وَ کَانُوا شِیَعًا. کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ.

مشرکوں میں سے نہ بن جاؤ اور نہ ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقے فرقے ہو گئے۔ سب فرقے اسی سے خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔ (سورۂ روم۔ آیت ۳۱۔۳۲)

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ لفظ شِیَعًا کا شیعہ سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ ایک سادہ لوح شخص نے سمجھا تھا جو ایک دفعہ میرے پاس آکر مجھے نصیحت کرنے لگا:

"بھائی جان! خدا کے واسطے ان شیعوں کو چھوڑیے، اللہ ان سے نفرت کرتا ہے اور اس نے اپنے رسولؐ کو متنبہ کیا تھا کہ ان کے ساتھ نہ ہوں"۔

میں نے کہا: یہ کیسے؟

اس نے یہ آیت پڑھ دی: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ.

میں نے اسے سمجھانے کی بہتیری کوشش کی کہ شِیَعًا کے معنی ہیں گروہ، جماعتیں پارٹیاں۔ اس کا شیعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ شیعہ کا لفظ تو اچھے معنی میں آیا ہے مثلاً

وَ اِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرَاھِیْمَ اِذْ جَاءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ.

یا حضرت موسیٰؑ کے قصے میں آیا ہے کہ

فَوَجَدَ فِیْھِ رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلَانِ ھٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَ ھٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ.

مگر افسوس! یہ شخص کسی طرح میری بات مان کر نہ دیا کیونکہ اسے تو مسجد کے امام صاحب نے شیعوں کے خلاف سکھا پڑھا دیا تھا۔ پھر وہ کوئی اور بات کیوں سنتا؟

اب میں اصل موضوع کی طرف پلٹتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں شیعہ ہونے سے پہلے سخت شش و پنج میں تھا۔ جب میں یہ حدیث پڑھتا تھا کہ اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ اور اس کا مقابلہ اس دوسری حدیث سے کرتا تھا جس میں آیا ہے کہ "میری امت بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جو ایک کو چھوڑ کر سب جہنم میں جائیں گے"[۱] تو میں دل ہی دل

---

[۱] سنن ابن ماجہ کتاب الفتن جلد ۲۔ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۲۰۔ جامع ترمذی کتاب الایمان۔

میں حیران ہوتا تھا کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو امّت کا اختلاف رحمت ہو اور ساتھ ہی وہ دُخولِ جہنّم کا مُوجب بھی ہو ؟؟

پھر جب میں نے اس حدیث کی وہ تشریح پڑھی جو امام جعفر صادقؑ نے کی ہے تو میری حیرت دور ہوگئی کیونکہ معمّا حل ہوگیا تھا۔ اس وقت میں سمجھا کہ ائمّہ اہلِ بیتؑ واقعی بہترین رہنما، اندھیروں میں چراغ اور صحیح معنیٰ میں قرآن و سُنّت کے ترجمان ہیں۔ جب ہی تو رسول اللہؐ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے :

مَثَلُ اَھْلُ بَیْتِی فِیکُمْ کَسَفِیْنَۃِ نُوحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا غَرِقَ . لَا تَتَقَدَّمُوھُمْ فَتَھْلِکُوا وَلَا تَتَخَلَّفُوا عَنْھُمْ فَتَھْلِکُوا ، وَلَا تُعَلِّمُوھُمْ فَاِنَّھُمْ اَعْلَمُ مِنْکُمْ .

میرے اہلِ بیت کی مثال سفینۂ نوحؑ کی سی ہے جو اس پر سوار ہوگیا بچ گیا اور جو اس سے بچھڑ گیا ڈوب گیا۔ ان سے نہ تو آگے نکلو نہ ان سے پیچھے رہو ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے۔ انھیں کچھ سکھانے کی کوشش نہ کرو کہ وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔[1]

امام علیؑ نے بھی ان کے حق میں فرمایا ہے :

"اپنے نبی کے اہلِ بیت پر نظر جمائے رکھو، ان ہی کے رُخ پر ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہو وہ تمھیں راستے سے بھٹکنے نہیں دیں گے نہ تمھیں کسی گڑھے میں گرنے دیں گے۔ اگر وہ کہیں ٹھہریں تو تم بھی ٹھہر جاؤ اور اگر وہ اُٹھیں تو تم بھی اُٹھ کھڑے ہو۔ ان سے آگے نہ نکلو ورنہ گمراہ ہوجاؤ گے اور نہ ان سے پیچھے رہو ورنہ تباہ ہوجاؤ گے۔[2]

ایک اور خطبے میں اہلِ بیتؑ کی قدر و منزلت بیان کرتے ہوئے امام

---

[1] صواعق محرقہ ابن حجر عسقلانی - جامع الصغیر سیوطی جلد ۲ صفحہ ۱۵۷ - مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۷ اور جلد ۴ صفحہ ۳۶۶ -

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۹۵ -

علیؑ نے فرمایا :

"وہ علم کی زندگی اور جہالت کی موت ہیں۔ ان کا حلم ان کے علم کی اور ان کا ظاہر ان کے باطن کی خبر دیتا ہے۔ ان کی خاموشی ان کی عاقلانہ گفتگو کی غمازی کرتی ہے۔ وہ نہ حق کے خلاف کرتے ہیں اور نہ امرِ حق میں اختلاف کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے ستون ہیں۔ تعلّق مَعَ اللہ ان کی فطرت ہے۔ ان کی وجہ سے حق کا بول بالا ہوا، باطل کی جڑیں کٹ گئیں اور اس کی زبان گدّی سے کھنچ گئی ان کے پاس وہ عقل ہے کہ انھوں نے دین کو سمجھا اور برتا، یہ نہیں کہ سُنا اور بیان کر دیا۔ علم کو بیان کرنے والے بہت ہیں اور اسے سمجھنے اور برتنے والے کم ہیں"۔ [1]

جی ہاں سچ فرمایا امام علیؑ نے، کیونکہ وہ شہرِ علم کا دروازہ ہیں۔ بڑا فرق ہے اس عقل میں جو دین کو سمجھتی اور برتتی ہے اور اس عقل میں جو سُنتی اور بیان کر دیتی ہے۔ سُننے اور بیان کر دینے والے بہت ہیں۔ کتنے صحابہ ہیں جنھیں رسول اللہؐ کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہے۔ وہ احادیث سنتے تھے اور بغیر سمجھے بُوجھے نقل کر دیتے تھے جس سے حدیث کے معنیٰ کچھ کے کچھ ہو جاتے تھے بلکہ بعض دفعہ تو مطلب بالکل اُلٹا ہو جاتا تھا یہاں تک کہ صحابی کے سخن شناس نہ ہونے اور اصل مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے بات کُفر تک جا پہنچی۔ [2]

لیکن جو علم پر پوری طرح حاوی ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ آدمی اپنی پوری

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۳۶۔

[2] اس کی مثال ابوہریرہ کی یہ روایت ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ۔ اس کی وضاحت امام جعفر صادقؑ نے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہؐ نے سُنا کہ دو آدمی ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ ایک نے کہا: "تیری شکل پر پھٹکار اور تیرے جیسی جس کی شکل ہو اس پر بھی پھٹکار"۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ مطلب یہ کہ اس کی شکل تو حضرت آدمؑ جیسی ہے۔ گویا تو حضرت آدمؑ کو گالی دے رہا ہے کیونکہ اُن کی شکل اس جیسی تھی۔

عُمر تحصیلِ علم میں صرف کر دیتا ہے لیکن بسا اوقات اسے بہت ہی کم عِلم حاصل ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ وہ علم کی کسی ایک شاخ یا کسی ایک فن میں مہارت حاصل کر پاتا ہے لیکن علم کی تمام شاخوں پر حاوی ہو جانا یہ بالکل ناممکن ہے مگر جیسا کہ معلوم ہے آئمّہ اہلِ بیتؑ مختلف علوم سے کَمَا حَقُّہٗ واقف تھے اور ان میں مہارت رکھتے تھے۔ اِس چیز کو امام علیؑ نے ثابت کر دیا تھا جس کی شہادت مورخین نے بھی دی ہے۔ اسی طرح امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے ہزاروں علماء کو مختلف علوم میں تلمّذ حاصل تھا، جیسے فلسفہ، طب، کیمیا اور طبیعیات وغیرہ۔

شیعہ اور سُنّی عقائد

جس بات سے مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ شیعہ امامیہ ہی نجات پانے والا فرقہ ہے، وہ یہ ہے کہ شیعہ عقائد فراخ دلانہ، آسان اور ہر ہوشمند اور باذوق شخص کے لیے قابلِ قبول ہیں۔ شیعوں کے یہاں ہر مسئلے اور ہر عقیدے کی مناسب اور اطمینان بخش وضاحت موجود ہے جو ائمہؑ اہلِ بیت میں سے کسی نہ کسی سے منسوب ہے جب کہ ممکن ہے کہ ایسی کافی و شافی وضاحت اہلِ سُنّت اور دُوسرے فرقوں کے یہاں نہ مل سکے۔

میں اِس فصل میں فریقین کے بعض اہم عقائد کے بارے میں گفتگو کروں گا اور کوشش کروں گا کہ ان کے متعلق اپنی سوچی سمجھی رائے ظاہر کروں۔ قارئین کو آزادی اور اختیار ہے کہ وہ میری رائے کو مانیں یا نہ مانیں، مجھ سے اتفاق کریں یا اختلاف۔

میں یہاں اِس طرف توجّہ دلانا چاہتا ہوں کہ بُنیادی عقیدہ سب مسلمانوں کا ایک ہے۔ سب مسلمان اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے رسولوں میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔

اِسی طرح سب مسلمان اس پر متفق ہیں کہ جہنّم حق ہے، جنّت حق ہے، اللہ سب مُردوں کو زندہ کرے گا اور انھیں محشر میں حساب کتاب کے لیے جمع کرے گا۔

اسی طرح قرآن پر بھی اتفاق ہے اور سب کا ایمان ہے کہ حضرت محمّد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے رسولؐ ہیں۔ سب کا قبلہ ایک ہے، ان کا دین ایک ہے، لیکن ان عقائد کے مفہوم میں اختلاف ہو گیا۔ اور اِس طرح یہ عقائد مختلف کلامی

فقہی اور سیاسی مکاتب فکر کی جولان گاہ بن گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق فریقین کا عقیدہ

اس سلسلے میں ایک اہم اختلاف رؤیت باری تعالیٰ کے متعلق ہے:۔

اہلِ سُنّت والجماعت کہتے ہیں کہ جنّت میں سب مؤمنین کو رؤیت باری تعالیٰ نصیب ہوگی۔ ان کی حدیث کی مستند کتابوں مثلاً بخاری اور مسلم وغیرہ میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ یہ رؤیت مجازی نہیں بلکہ حقیقی ہوگی[۱]۔ بلکہ ان میں ایسی روایات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے گویا خدا انسانوں کے مشابہ ہے، وہ ہنستا ہے[۲]، آتا جاتا ہے، چلتا پھرتا ہے اور ساتویں آسمان سے پہلے آسمان پر اُترتا ہے[۳]۔ حتیٰ کہ اپنی پنڈلی کھولتا ہے جس پر شناختی علامت بنی ہوئی ہے[۴]۔ اور یہ کہ جب وہ اپنا ایک پاؤں دوزخ میں رکھے گا تو دوزخ بھر جائے گی۔ غرض ایسی باتیں اور ایسے اوصاف حق تعالیٰ سے منسوب کیے گئے ہیں جن سے وہ پاک اور منزّہ ہے[۵]۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار کینیا (مشرقی افریقہ) کے شہر لامو سے میرا گزر ہوا۔ وہاں مسجد میں ایک وہّابی امام صاحب نمازیوں کو خطاب کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں، دو پاؤں ہیں، دو آنکھیں اور چہرہ ہے۔ جب میں نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے اپنی تائید میں قرآن کی کچھ آیات پڑھیں، فرمایا:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ

۱ـ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۴۷۔ جلد ۵ صفحہ ۱۷۸ اور جلد ۶ صفحہ ۳۳۔

۲ـ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۲۲۵۔ جلد ۵ صفحہ ۴۷، ۴۸۔ صحیح مسلم جلد ا صفحہ ۱۱۴، ۱۲۲۔

۳ـ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۹۷۔ ۴ـ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۸۲۔

۵ـ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۸۷، صفحہ ۲۰۲ سے ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ہاتھ اور انگلیاں ہیں۔

نوٹ: واضح ہو کہ یہ تو خدا کو حادث ماننا ہوا جبکہ وہ قدیم ہے۔ (ناشر)

وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ ...

یہود کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ تو بندھا ہوا ہے۔ بندھیں ان کے ہاتھ! اور لعنت ہو ان پر اس کہنے کی وجہ سے۔ اللہ کے ہاتھ تو کھلے ہیں۔"

اس کے بعد دو آیتیں اور پڑھیں:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا

ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بناؤ۔

اور: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

جو مخلوق بھی زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے اور تمھارے پروردگار کا چہرہ جو صاحبِ جلال و عظمت ہے باقی رہے گا۔

میں نے کہا: بھائی صاحب! جو آیات آپ نے پڑھی ہیں مجاز ہیں حقیقت نہیں۔

کہنے لگے سارا قرآن حقیقت ہے اس میں مجاز کچھ نہیں۔

اِس پر میں نے کہا: پھر اس آیت کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں:

وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ؟

کیا آپ آیت کو اس کے حقیقی معنیٰ میں لیں گے؟ کیا واقعی دنیا میں جو بھی اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا؟

امام صاحب نے جواب دیا: ہم اللہ کے ہاتھ، اللہ کی آنکھ اور اللہ کے چہرے کی بات کر رہے ہیں، اندھوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ (فکری جمود کی انتہا ملاحظہ ہو۔)

میں نے کہا: اچھا اندھوں کو چھوڑیے! آپ نے جو آیت ابھی پڑھی ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔ اس کی تشریح آپ کیسے کریں گے؟

امام صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا: کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو اس

آیت کا مطلب نہ سمجھتا ہو؟ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ یہ بالکل ویسی ہی آیت ہے جیسی كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔

میں نے کہا: آپ نے اور بھی گڑبڑ کر دی۔ بھائی صاحب میرا آپ کا اختلاف قرآن کے بارے میں ہے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں مجاز نہیں سب حقیقت ہے، میں کہتا ہوں مجاز بھی ہے خصوصاً ان آیات میں جن سے تجسیم یا تشبیہ کا شبہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اپنی رائے پر اصرار ہے تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاتھ پاؤں اور اس کا پورا جسم فنا ہو جائے گا اور صرف چہرہ باقی بچے گا۔ (نعوذ باللہ) پھر میں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا: کیا آپ کو یہ تفسیر منظور ہے؟

پورے مجمع پر سکوت طاری ہو گیا اور امام صاحب کو بھی ایسی چپ لگ گئی جیسے منہ میں گھنگھنیاں بھری ہوں۔ میں انھیں رخصت کر کے یہ دعا کرتا ہوا چلا آیا کہ اللہ انھیں نیک ہدایت کی توفیق دے۔

جی ہاں! یہ ہے ان کا عقیدہ جو اُن کی معتبر کتابوں میں اور جو اُن کے مواعظ و خطبات میں بیان کیا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کچھ علمائے اہلِ سنّت اس کے انکاری نہیں ہیں لیکن اکثریت کو یقین ہے کہ آخرت میں اللہ کا دیدار ہو گا اور وہ اس کو اسی طرح دیکھیں گے جس طرح چودھویں کا چاند دیکھتے ہیں۔ ان کا استدلال اس آیت سے ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔[1]

کچھ چہرے اس دن ہشّاش بشّاش اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

جیسے ہی آپ کو اس بارے میں شیعوں کا عقیدہ معلوم ہو گا آپ کے دل کو اطمینان ہو جائے گا اور آپ کی عقل اسے تسلیم کر لے گی۔ کیونکہ شیعہ ان قرآنی آیات کی جن میں

---

[1] سورۂ قیامۃ - آیت ۲۲ - ائمۂ اہلبیتؑ نے "اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے" کی تفسیر یہ کی ہے کہ اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار ہوں گے۔

تجسیم یا تشبیہ کا شبہ ہوتا ہے تاویل کرتے ہیں اور انھیں مجاز پر محمول کرتے ہیں، حقیقت پر نہیں۔ اور وہ مطلب نہیں لیتے جو ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، یا جیسا بعض دُوسرے لوگ سمجھتے ہیں۔

اِس سلسلے میں امام علی علیہ السلام کہتے ہیں:

"ہمت کتنی ہی بلند پروازی سے کام لے اور عقل کتنی ہی گہرائی میں غوطے لگائے، اللہ کی ذات کا اِدراک ناممکن ہے۔ اس کی صِفات کی کوئی حد نہیں اور نہ اس کی تعریف ممکن ہے نہ اس کا وقت متعین ہے اور نہ زمانہ مقرر ہے۔"[1]

امام محمد باقر علیہ السلام تجسیم الٰہی کی تردید کرتے ہوئے کتنی فلسفیانہ، علمی، نازک اور جچی تُلی بات کہتے ہیں:

"ہم چاہے جس چیز کا تصوّر ذہن میں لائیں اور اس کے بارے میں جتنا بھی سوچیں ہمارے ذہن میں جو بھی تصویر اُبھرے گی وہ ہماری طرح کی مخلوق ہوگی۔"[2]

جو عقل میں گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہُوا
جو سمجھ میں آگیا، وہ خُدا کیوں کر ہُوا
(اکبر الٰہ آبادی)

تجسیم اور تشبیہ کی رد میں، ہمارے لیے تو اللہ پاک کا اپنی کتابِ مُحکم میں یہ قول کافی ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ اور لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ.

اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ اور۔ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔

جب حضرت موسیٰؑ نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور کہا: رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ تو جواب ملا لَنْ تَرٰىنِيْ تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ اور بقولِ زمخشری

---

[1] نہج البلاغہ۔ پہلا خطبہ

[2] عقائد الامامیہ۔ شیخ مظفر۔ یہ کتاب جامعہ تعلیمات اسلامی نے مکتبِ تشیع کے نام سے شائع کی ہے۔

لَن کے مفہوم میں تابید شامل ہے۔ یعنی اَبد تک کبھی بھی نہیں دیکھ سکو گے۔

یہ سب شیعہ اقوال کی صحت کی دلیلِ قاطع ہے۔ بات یہ ہے کہ شیعہ اُن ائمۂ اہلِ بیتؑ کے اقوال نقل کرتے ہیں جو سرچشمۂ علم تھے اور جنھیں کتابُ اللہ کا علم میراث میں ملا تھا۔

جو شخص اس موضوع سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہے وہ اس موضوع پر مفصل کتابوں کی طرف رُجوع کرے۔ مثلاً المُراجعات کے مولف سیّد شرف الدین عاملی کی کتاب کلمۃ حول الرُّؤیہ۔

نبوّت کے بارے میں فریقین کا عقیدہ

نبوّت کے بارے میں شیعہ سُنّی اختلاف کا موضوع عِصمت کا مسئلہ ہے۔ شیعہ اس کے قائل ہیں کہ انبیاء بِعثت سے قبل بھی معصوم ہوتے ہیں اور بعثت کے بعد بھی۔ اہلِ سُنّت کہتے ہیں کہ جہاں تک کلامُ اللہ کی تبلیغ کا تعلّق ہے، انبیاء بے شک معصوم ہیں لیکن دوسرے مُعاملات میں وہ عام انسانوں کی طرح ہیں۔ اس بارے میں حدیث کی کتابوں میں متعدد روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے کئی موقعوں پر غلط فیصلہ کیا اور صحابہ نے آپ کی اصلاح کی۔ جیساکہ جنگ بدر کے قیدیوں کے مُعاملے میں ہوا جہاں اللہ کے رسولؐ کی رائے درست نہیں تھی اور عُمر کی رائے صحیح تھی۔[۱]

اِسی طرح جب رسول اللہؐ مدینہ آئے تو آپ نے وہاں لوگوں کو دیکھا کہ کھجور کے درخت میں گابھا دے رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: گابھا دینے کی ضرورت نہیں، ایسے بھی کھجوریں لگیں گی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ لوگوں نے آپ سے آکر شکایت کی تو آپ نے کہا: "تم اپنے دنیا کے کاموں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے کہا: میں بھی انسان ہوں، جب میں تمھیں دین کی کوئی بات بتاؤں تو اس پر ضرور عمل کرو۔ مگر جب میں کسی دُنیاوی معاملے میں اپنی رائے دوں

---

[۱] البِدایہ والنِہایہ کے علاوہ صحیح مسلم۔ سُنن ابوداؤد۔ جامع ترمذی۔

تو میں محض انسان ہوں [1]

یہ بھی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ پر جادو کیا گیا، جادو کے اثر سے آپ کو یہ نہیں پتہ چلتا تھا کہ آپ نے کیا کیا۔ بعض دفعہ یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ نے ازواج سے صُحبت کی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا تھا [2] یا کسی اور کام کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ یہ کام کیا ہے مگر دراصل وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا [3] اہلِ سُنّت کی ایک اور روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ کو نماز میں سَہو ہو گیا۔ یہ یاد نہیں رہا کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں [4] ایک دفعہ آپ نماز میں بے خبر سو گئے، یہاں تک کہ لوگوں نے آپ کے خرّاٹے کی آواز سُنی، پھر جاگ گئے اور وضو کی تجدید کے بغیر نماز پوری کی [5]

اہلِ سُنّت یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ بعض دفعہ کسی پر بلاوجہ ناراض ہو جاتے، اسے بُرا بھلا کہتے اور اس کو لعنت ملامت کرتے تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا: یا الٰہی! میں انسان ہوں، اگر میں کسی مُسلمان کو لعنت ملامت کروں یا بُرا بھلا کہوں تو تُو اسے اُس کے لیے رحمت بنا دے [6]

اہلِ سُنّت کی ایک اور روایت ہے کہ ایک دن آپ حضرت عائشہ کے گھر میں لیٹے ہوئے تھے اور آپ کی ران کھُلی ہوئی تھی، اتنے میں ابوبکر آئے، آپ اسی طرح لیٹے ہوئے ان سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد عُمر آئے تو آپ ان سے بھی اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ جب عُثمان نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو آپ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور کپڑے ٹھیک کر لیے۔ جب عائشہ نے اس بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا: میں کیوں نہ اُس شخص سے حیا کروں جس سے مَلائکہ بھی شرماتے ہیں [7]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الفضائل جلد ۷ صفحہ ۹۵۔ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۶۲ اور جلد ۳ صفحہ ۱۵۲۔

[2] صحیح بُخاری جلد ۷ صفحہ ۲۹۔

[3] صحیح بُخاری جلد ۴ صفحہ ۶۸۔

[4] صحیح بُخاری جلد ۱ صفحہ ۱۲۳۔

[5] صحیح بُخاری جلد ۱ صفحہ ۳۷ و صفحہ ۴۴ و صفحہ ۱۷۱۔

[6] سنن دارمی کتاب الرِقاق۔ [7] صحیح مسلم باب فضائل عثمان جلد ۷ صفحہ ۱۱۷۔

اہلِ سُنت کے ہاں ایک روایت یہ بھی ہے کہ رَمَضانُ المبارک میں آپ جُنُب ہوتے تھے اور صبح ہوجاتی تھی اور آپ کی نماز فوت ہوجاتی تھی[1]

اِسی طرح اور جھُوٹ ہیں جن کو نہ عقل قبول کرتی ہے، نہ دین اور نہ شرافت۔ اس کا مقصد رسول اللہ ص کی توہین کرنا اور آپ کی شان میں گستاخی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ اہلِ سُنّت ایسی باتیں رسول اللہ ص سے منسوب کرتے ہیں جو خود اپنے سے منسوب کرنا پسند نہیں کرتے۔

اس کے برخلاف شیعہ ائمۂ اہلبیت کے اقوال سے استدلال کرتے ہوئے انبیاء کو ان تمام لغویات سے پاک قرار دیتے ہیں خصوصاً ہمارے نبی محمّد علیہ افضلُ الصّلاۃِ وَاَزکَی السَّلام کو۔

شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ تمام خطاؤں، لغزشوں اور گناہوں سے پاک ہیں چاہے وہ گُناہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اِس طرح آپ پاک ہیں ہر غلطی اور بھُول چُوک سے، جادُو کے اثر سے اور ہر اُس چیز سے جس سے عقل مُتاثر ہوتی ہو۔ آپ پاک ہیں ہر اُس چیز سے جو شرافت اور اخلاقِ حمیدہ کے مُنافی ہو جیسے راستے میں کچھ کھانا یا ٹھٹھا مارنا یا ایسا مذاق کرنا جس میں جھُوٹ کی آمیزش ہو۔ آپ پاک ہیں ہر اُس فِعل سے جو عُقلاء کے نزدیک ناپسندیدہ ہو یا عُرفِ عام میں اچھّا نہ سمجھا جاتا ہو۔ چہ جائیکہ آپ دُوسروں کے سامنے اپنا رُخسار بیوی کے رُخسار پر رکھیں اور اس کے ساتھ حبشیوں کا ناچ دیکھیں[2] یا بیوی کو کسی جنگ کے موقع ساتھ لے کر جائیں اور وہاں اس کے ساتھ دوڑ لگائیں کہ کبھی وہ آگے نکل جائے اور کبھی آپ اور اس پر آپ کہیں کہ "یہ اُس کے بدلے میں"[3]

شیعہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی ساری روایات جو عِصمتِ انبیاء سے متناقض ہیں اُمویوں اور ان کے حامیوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ مقصد ان کے دو ہیں:

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۲ صفحہ ۲۳۲-۲۳۴ ۔ نوٹ: یہ اور ایسی بے شمار روایتیں راجپال کو رنگیلا رسول رشدی ملعون کو SATANIC VERSES اور مستشرقین کو ہتکِ رسول کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں۔ (ناشر)

[2] [3] صحیح بُخاری جلد ۳ صفحہ ۲۲۸ ۔ [4] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۷۵۔

ایک تو رسول اللہ ص کی عزت و توقیر کو کم کرنا تاکہ اہلِ بیتؑ کی وقعت کو گھٹایا جا سکے۔ دُوسرے اپنے ان افعالِ بد کے لیے وجہ جواز تلاش کرنا جن کا ذکر تاریخ میں ہے۔ اب اگر رسول اللہ ص بھی غلطیاں کرتے تھے اور خواہشاتِ نفسانی سے مُتاثر ہوتے تھے جیسا کہ اس قصّے میں بیان کیا گیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ جب زینب بنتِ جحش ابھی زید بن حارثہ کے نکاح میں تھیں، آپ انھیں بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے دیکھ کر ان پر فریفتہ ہو گئے تھے، اس وقت آپ کی زبان سے نکلا تھا: سُبحَانَ اللّٰہِ مُقَلِّبَ القُلُوبِ[1]

ایک اور سُنّی روایت کے مُطابق آپ کی طبیعت کا زیادہ جُھکاؤ حضرت عائشہ کی طرف تھا اور بقیہ ازواج کے ساتھ ویسا سلوک نہیں تھا۔ چنانچہ ازواج نے ایک دفعہ حضرت فاطمہ زہرا کو اور ایک دفعہ زینب بنتِ جحش کو عدل کا مُطالبہ کرنے کے لیے آپ کے پاس اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا[2]

اگر خُود رسول اللہ ص کی یہ حالت ہو تو مُعاویہ بن ابی سفیان، مَروان بن حکم، عَمرو بن عاص، یزید بن مُعاویہ اور ان تمام اُموی حکمرانوں کو کیا الزام دیا جا سکتا ہے جنھوں نے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا اور بے گناہوں کو قتل کیا۔ بقول شخصے، اگر گھر کا مالک ہی طبلہ بجا رہا ہو تو اگر بچّے ناچنے لگیں تو اُن کا کیا قصور!

ائمہ اہلبیتؑ جو شیعوں کے ائمہ ہیں وہ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عِصمت کے قائل ہیں اور ظاہر ہے کہ گھر والوں سے زیادہ گھر کا حال کون جان سکتا ہے؟ اِسی لیے وہ ان تمام آیاتِ قرآنی کی تاویل کرتے ہیں جن سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالی اپنے نبی کو عتاب کر رہا ہے جیسے عَبَسَ وَتَوَلّٰی یا جن سے گناہوں کے اقرار کا مفہوم نکلتا ہے جیسے لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ یا ایک دُوسری آیت لَقَدْ تَّابَ اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ یا عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ۔

---

[1] تفسیر جلالین وَتُخْفِی فِی نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ کی تفسیر کی ذیل میں۔
[2] صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۱۳۶ باب فضائل عائشہ۔

ان تمام آیات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عِصمت مجروح نہیں ہوتی۔ اِس لیے کہ بعض آیات آپ سے متعلق ہی نہیں ہیں، اور بعض آیات ظاہری الفاظ پر محمول نہیں ہیں بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے مَجَازاً کہا گیا ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے: "اے پڑوسن سُن لے یہ بات تیرے لیے ہے"۔ مجاز کا استعمال عربی زبان میں کثرت سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس کا استعمال قرآن مجید میں کیا ہے۔

جو شخص تفصیل معلوم کرنا اور حقیقتِ حال سے آگاہی حاصل کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ شیعہ تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کرے جیسے علامہ طباطبائی کی المیزان، آیتُ اللہ خوئی کی البیان، محمد جواد مغنیہؒ کی الکاشف، علامہ طبرسی کی الاِحتجاج، وغیرہ وغیرہ۔

میں اختصار سے کام لے رہا ہوں کیونکہ میرا مقصد صرف عمومی طور پر فریقین کا عقیدہ بیان کرنا ہے۔ اِس کتاب سے میرا مقصد صرف ان اُمور کا بیان کرنا ہے جن سے مجھے ذاتی طور پر اطمینان نصیب ہوا اور انبیاء اور ان کے بعد اوصیاء کی عِصمت کا مجھے یقین ہو گیا۔ میرا شک اور حیرت یقین میں بدل گئے اور ان شیطانی وسوسوں کا ازالہ ہو گیا جن کی وجہ سے کبھی کبھی میری خطائیں، میرے گناہ اور میرے غلط اعمال مجھے اچھے، صحیح اور درست معلوم ہوتے تھے۔ کبھی تو مجھے افعال واقوالِ رسولؐ میں بھی شک ہونے لگتا تھا اور آپ کے بتلاتے ہوئے احکام پر بھی اطمینان نہیں ہوتا تھا بلکہ نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ بعض دفعہ اللہ کے اِس قول میں بھی شک ہونے لگتا تھا کہ

وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

رسول تمھیں جو بتلائیں اس پر عمل کرو اور جس سے منع کریں اُس سے رُک جاؤ۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کلام اللہ نہ ہو رسول کا اپنا ہی کلام ہو!

سُنّیوں کا یہ کہنا کہ "رسول اللہؐ صِرف اللہ کے کلام کی تبلیغ کی حد تک معصوم ہیں" بالکل بیکار بات ہے۔ اِس لیے کہ اس کی کوئی پہچان نہیں کہ اس قسم کا کلام تو اللہ کی طرف سے ہے اور اس طرح کا کلام خُود آپ کی اپنی طرف سے، تاکہ یہ کہا جا سکے کہ اِس کلام میں تو آپ معصوم ہیں اور اُس میں معصوم نہیں، اِس لیے یہاں غلطی کا

احتمال ہے۔

اللہ کی پناہ اس متضاد قول سے! اس سے تو رسول اللہ ص کی شانِ تقدس میں شک پیدا ہوتا ہے اور آپ کی شان میں طعن کی گنجائش نکلتی ہے۔

اِس پر مجھے وہ گفتگو یاد آگئی جو میرے شیعہ ہوجانے کے بعد میرے اور چند دوستوں کے درمیان ہوئی تھی۔ میں انھیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ رسول اللہ ص ہر بات میں معصوم ہیں اور وہ مجھے سمجھا رہے تھے کہ آپ صرف قرآن کی تبلیغ کی حد تک معصوم ہیں۔ ان میں ایک توزر کے پروفیسر تھے۔ توزر منطقۂ جرید کا ایک شہر ہے[1] یہاں کے لوگ علم وفن، ذہانت وفطانت اور لطیفہ گوئی کے لیے مشہور ہیں۔

یہ پروفیسر صاحب ذرا دیر سوچتے رہے، پھر کہنے لگے: حضرات! اس مسئلے میں میری بھی ایک رائے ہے۔ ہم سب نے کہا: تو پھر فرمایئے۔ کہنے لگے: بھائی تیجانی شیعوں کی طرف سے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے، ہمارے لیے یہی ضروری ہے کہ رسول اللہ ص کے علی الاطلاق معصوم ہونے کا عقیدہ رکھیں ورنہ تو خود قرآن میں شک پڑ جائے گا۔ سب نے کہا: وہ کیسے؟ پروفیسر صاحب نے فوراً جواب دیا: کیا تم نے دیکھا ہے کہ کسی سورت کے نیچے اللہ تعالیٰ کے دستخط ہوں۔ دستخط سے ان کی مراد وہ مہر تھی جو دستاویزات اور مراسلات کے آخر میں اس لیے لگائی جاتی ہے تاکہ یہ شناخت ہو سکے کہ یہ کس کی طرف سے ہے۔ سب لوگ اس لطیفے پر ہنسنے لگے مگر یہ لطیفہ بڑا معنی خیز ہے، کوئی بھی غیر متعصب انسان اگر اپنی عقل استعمال کر کے غور کرے گا تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آئے گی کہ قرآن کو کلامِ الٰہی تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صاحبِ وحی کی عصمتِ مطلقہ کا بھی عقیدہ بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے رکھا جائے کیونکہ یہ تو کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو بولتے ہوئے سنا ہے یا جبریل ع کو وحی لاتے ہوئے دیکھا ہے۔

---

[1] منطقۂ جرید تیونس کے جنوب میں قفصہ سے ۹۲ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ عربی کے مشہور شاعر ابوالقاسم شابی اور خضر حسین کا جائے ولادت ہے۔ خضر حسین جامعہ ازہر کے شیخ الجامعہ تھے۔ تیونس کے علماء میں سے بہت سے علماء اسی علاقے میں پیدا ہوتے ہیں۔

خُلاصۂ کلام یہ ہے کہ "عِصمتِ انبیاءؑ" کے بارے میں شیعہ عقیدہ ہی وہ محکم اور مضبوط عقیدہ ہے جس سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور تمام نفسانی و شیطانی وسوسوں کی جڑ کٹ جاتی ہے اور مُفسِدوں خصوصاً یہودیوں، عیسائیوں اور دشمنانِ دین کا راستہ بند ہوجاتا ہے جو ہر وقت اِس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کہیں سے راستہ ملے تو اندر گُھس کر ہمارے مُعتقدات کو بھک سے اُڑا دیں اور ہمارے دین میں عیب نکالیں۔ ایسے راستے انھیں صرف اہلِ سُنّت ہی کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر و بیشتر ہمارے خلاف ان ہی اقوال و افعال سے دلیل لاتے ہیں جو بُخاری و مُسلم میں غلط طور پر رسول اللہؐ سے منسوب کیے گئے ہیں[1]

اب ہم انھیں کیسے یقین دلائیں کہ بُخاری و مُسلم میں بعض غلط روایات بھی ہیں۔ یہ بات قدرتی طور پر خطرناک ہے کیونکہ اہلِ سُنّت والجماعت اسے کبھی نہیں مانیں گے۔ ان کے نزدیک تو بُخاری کتابِ باری کے بعد صحیح ترین کتاب ہے اور اِسی طرح مُسلم بھی۔

فریقین کے نزدیک اِمامت کا عقیدہ

اس بحث میں اِمامت سے مُراد مسلمانوں کی امامتِ کُبریٰ ہے، یعنی خِلافت، حُکومت، قِیادت اور وِلایت کا مجموعہ۔ اِمامت سے مُراد محض نماز کی اِمامت نہیں جیساکہ آجکل اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔

چونکہ میری کتاب میں بحث کا مدار مذہبِ تسنُّن اور مذہبِ تشیُّع کے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۳ باب شہادۃ الاعمیٰ میں عُبَید بن مَیمُون کی سند سے روایت ہے کہ "رسول اللہؐ نے مسجد میں ایک نابینا شخص کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سُنا تو فرمایا: اللہ اس پر رحم کرے اس نے مجھے فلاں سُورت کی فلاں فلاں آیتیں یاد دلادیں جو میں بھول گیا تھا۔

آپ یہ روایت پڑھیے اور حیرت کیجیے کہ رسول اللہؐ آیات بھول گئے اور اگر یہ نابینا شخص وہ آیات یاد نہ دلاتا تو وہ آیات غائب ہی ہوگئی ہوتیں۔ حد ہے اِس لغویت کی!

تقابل پر ہے، اس لیے میرے لیے ضروری ہے کہ میں یہ ظاہر کردوں کہ امامت کے اصول کی فریقین کے نزدیک کیا نوعیت ہے تاکہ قارئین کو یہ علم ہو سکے کہ فریقین کے نقطۂ نظر کی بنیاد کیا ہے اور ضمناً یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کس یقین اور اطمینان نے مجھے اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔

شیعوں کے نزدیک امامت اپنی زبردست اہمیت کے باعث اصولِ دین میں شامل ہے۔ اِمامت خیرُ الامم کو قیادت فراہم کرتی ہے۔ اس قیادت کے متعدد فضائل ہیں اور اس کی خصوصیات میں سے قابلِ ذکر ہیں: عِلم، حِلم، شجاعت، نزاہت، عِفّت، زُہد، تقویٰ وغیرہ وغیرہ

شیعوں کا اعتقاد ہے کہ امامت ایک خُدائی منصب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے جسے منتخب کرتا ہے، اسے عطا کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنا اہم کردار ادا کرے اور یہ کردار نبی کے بعد دُنیا کی قیادت ہے۔

اِسی اُصول کی بنیاد پر امام علی بن ابی طالبؑ مسلمانوں کے امام تھے۔ انھیں اللہ نے منتخب کیا تھا اور اس نے بذریعہ وحی اپنے رسولؐ سے کہا تھا کہ علیؑ کا منصبِ امامت پر تقرر کر دیں چنانچہ رسول اللہؐ نے ان کا تقرر کیا اور حجۃُ الوداع کے بعد غدیرِ خُم کے مقام پر اُمّت کو اس تقرر کی اطلاع دی، اس پر لوگوں نے امام علیؑ کی بیعت کر لی۔ "یہ شیعہ کہتے ہیں"۔

جہاں تک اہلِ سُنت کا تعلق ہے وہ بھی اُمّت کی قیادت کے لیے امامت کے ضروری ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کے مطابق اُمّت کو حق ہے کہ وہ جس کو چاہے اپنا امام اور قائد بنا لے چنانچہ مُسلمانوں نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اُبوبکر بن ابی قُحافہ کو امام مُنتخب کیا تھا۔ خود رسول اللہؐ نے خلافت کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا تھا بلکہ اس کا فیصلہ شوریٰ پر چھوڑ دیا تھا۔ "یہ اہلِ سُنّت والجماعت کہتے ہیں"۔

حقیقت کیا ہے؟

تحقیق کرنے والا اگر غیر جانبداری کے ساتھ فریقین کے دلائل پر غور کرے تو یقیناً وہ حقیقت تک رسائی حاصل کر لے گا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے چونکہ

یہ کتاب میرے ہدایت پانے اور مذہب بدلنے کا قصّہ بیان کرتی ہے اِس لیے میرے لیے ضروری ہے کہ میں قارئینِ کرام کے سامنے اپنا نقطۂ نظر اور اپنا عقیدہ واضح کردوں۔ اب یہ قارئین پر ہے کہ وہ اسے قبول کریں یا ردّ کردیں کیونکہ آزادیٔ فکر ہر دُوسری چیز سے زیادہ اہم ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۔

کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (سورۂ فاطر۔ آیت ۱۸)

اور

کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ۔

ہر شخص کا دارومدار اس کے اعمال پر ہے۔

(سورۂ مدّثّر۔ آیت ۳۸)

شروع کتاب سے ہی میں نے اپنے اُوپر یہ پابندی عائد کی ہے کہ میں قُرآن اور مُتّفق بَیْنَ الفرِیقَین احادیث سے تجاوُز نہیں کروں گا اور اس سارے عمل میں کوئی خلافِ عقل بات تسلیم نہیں کروں گا کیونکہ عقلِ سلیم متضاد اور متناقض باتوں کو نہیں مانتی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۔

اگر قرآن غیراللہ کے پاس سے آیا ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔ (سورۂ نساء۔ آیت ۸۲)

امامت قُرآن کی رُو سے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۔
قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۔
قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۔

جب ابراہیمؑ کو اُس کے رب نے کچھ باتوں سے جانچا اور

ابراہیمؑ نے ان کو پورا کر دیا تو اللہ نے کہا: میں تمھیں لوگوں کا
امام بنا رہا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا: اور میری اولاد میں سے ؟
اللہ تعالیٰ نے کہا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچتا۔
(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

یہ آیتِ کریمہ ہمیں بتلاتی ہے کہ اِمامت ایک خُدائی منصب ہے اور خُدا
یہ منصب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے کیونکہ وہ خُود کہتا ہے:

اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا.
میں تمھیں لوگوں کا امام بنا رہا ہوں۔

اِس آیت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امامت اللہ کی طرف سے ایک عہد
ہے جو صرف اللہ کے ان نیک بندوں تک پہنچتا ہے جنھیں وہ خاص طور پر اس
مقصد کے لیے چُن لیتا ہے کیونکہ یہ صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ظالم اللہ کے اِس عہد
کے مستحق نہیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَاھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ
فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءَ الزَّکٰوۃِ وَکَانُوْا
لَنَا عَابِدِیْنَ۔

ہم نے ان میں سے امام بنائے جو ہمارے حُکم سے ہدایت
کرتے تھے اور ہم نے ان کو وَحی بھیجی کہ نیک کام کریں، نماز قائم
کریں اور زکات دیں۔ اور وہ ہماری عبادت کرتے تھے۔
(سورۂ انبیاء۔ آیت ۷۳)

ایک اور آیت ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا
وَکَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ.

ہم نے ان میں سے امام بنائے جو ہمارے حُکم سے ہدایت
کرتے تھے کیونکہ وہ صابر تھے اور ہماری نشانیوں پر یقین

رکھتے تھے۔ (سورۂ سجدہ۔ آیت ۲۴)

ایک اور آیت ہے:

وَ نُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِیْنَ.

ہم چاہتے ہیں کہ ان پر احسان کریں جنھیں دُنیا میں کمزور سمجھ لیا گیا ہے، ان کو امام بنائیں اور انھیں (زمین کا) وارث بنائیں۔ (سورۂ قصص۔ آیت ۵)

ممکن ہے کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیاتِ قرآن سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ یہاں اِمامت سے مُراد نبوّت ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ امامت کا مفہوم زیادہ عام ہے، ہر رسول اور نبی امام ہوتا ہے لیکن ہر امام رسول یا نبی نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں واضح کر دیا ہے کہ اس کے نیک بندے اس منصب کے لیے اس سے دُعا کر سکتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کی ہدایت کا شرف حاصل کر سکیں اور اس طرح اَجرِ عظیم کے مُستحق ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا. وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا. وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا.

وہ لوگ جو جھُوٹی گواہی نہیں دیتے، جب انھیں بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔ اور جب انھیں ان کے پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو ان پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ غور سے سُنتے ہیں) اور وہ لوگ جو ہم سے دُعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔ (سورۂ فرقان۔ آیات ۷۲ تا ۷۴)

اسی طرح قرآنِ کریم میں ائمہ کا لفظ ان ظالم سرداروں اور حکمرانوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو اپنے پیرو کاروں اور اپنی قوموں کو گمراہ کرتے، فساد پھیلانے میں ان کی رہنمائی کرتے اور دُنیا و آخرت کے عذاب کی انھیں دعوت دیتے ہیں۔

فرعون اور اس کے لشکریوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے :

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ. وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا یُنْصَرُوْنَ. وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ.

ہم نے اُسے اور اس کے لشکریوں کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا۔ پھر دیکھو ظالموں کا کیا انجام ہوا۔ ہم نے انھیں ایسے امام بنایا جو جہنّم کی دعوت دیتے تھے اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ اس کے بعد ہم نے اس دُنیا میں ان پر لعنت بھیجی اور قیامت میں وہ ان میں سے ہوں گے جن کا ہولناک انجام ہوگا۔ (سورۂ قصص۔ آیت ۴۰)

اس بُنیاد پر شیعہ جو کچھ کہتے ہیں وہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ اِمامت ایک مِنْ جانبِ اللہ منصب ہے جو اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، وہ اللہ کا عہد ہے جس کا اطلاق ظالموں پر نہیں ہوتا۔ چونکہ ابُوبکر، عُمر اور عُثمان کی عمروں کا بڑا حصّہ شرک کی حالت میں گزرا کیونکہ وہ بتوں کو پوجتے رہے تھے اس لیے وہ اس کے مستحق نہیں۔ اس طرح شیعوں کا یہ قول درست ہے کہ تمام صحابہ میں صرف امام علی بن ابی طالبؑ ہی امامت کے مستحق ہیں اور امامت کے متعلق اللہ کے دعوے کا اطلاق صرف انھی پر ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی بُتوں کے آگے سجدہ ریز نہیں ہوتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام لانے کے بعد اس سے پہلے کے سب گناہ محو ہو جاتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ یہ واقعی صحیح ہے، لیکن پھر بھی بڑا فرق ہے اس شخص میں جو پہلے مُشرک تھا بعد میں اس

نے توبہ کرلی اور اس شخص میں جس کا دامن شروع سے شرک کی آلائش سے پاک صاف رہا اور جس نے بجز اللہ کے کبھی کسی کے سامنے جبینِ نیاز خم نہیں کی۔

امامت سُنّتِ نبوی کی رُو سے

اِمامت کے بارے میں رسول اللہ صلعم کے متعدد اقوال ہیں جن کو شیعوں اور سُنّیوں دونوں نے اپنی احادیث کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے کہیں اسے اِمامت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور کہیں خِلافت کے لفظ سے، کہیں وِلایت کے لفظ سے اور کہیں امارت کے لفظ سے۔

امامت کے بارے میں ایک حدیثِ نبوی ہے:

خِیَارُ اَئِمَّتِکُمُ الَّذِیْنَ تُحِبُّوْنَھُمْ وَیُحِبُّوْنَکُمْ وَ تُصَلُّوْنَ عَلَیْھِمْ وَیُصَلُّوْنَ عَلَیْکُمْ. وَشَرَارُ اَئِمَّتِکُمُ الَّذِیْنَ تُبْغِضُوْنَھُمْ وَیُبْغِضُوْنَکُمْ وَتَلْعَنُوْنَھُمْ وَ یَلْعَنُوْنَکُمْ. قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللہِ اَفَلَا نُنَابِذُھُمْ بِالسَّیْفِ فَقَالَ لَا مَا اَقَامُوْا فِیْکُمُ الصَّلٰوۃَ.

تمھارے اماموں میں سب سے بہتر وہ ہیں جن سے تم محبّت کرو اور وہ تم سے محبّت کریں، تم ان کے لیے دُعا کرو، وہ تمھارے لیے دُعا کریں۔ اور بدترین ائمہ وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں، جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔ صحابہ نے پُوچھا: تو کیا ہم تلوار سے ان کا مقابلہ نہ کریں رسول اللہ صلعم نے فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں[1]

رسول اللہ صلعم نے یہ بھی فرمایا ہے:

یَکُوْنُ بَعْدِیْ اَئِمَّۃٌ لَّا یَھْتَدُوْنَ بِھُدَایَ وَلَا یَسْتَنُّوْنَ بِسُنَّتِیْ وَسَیَقُوْمُ فِیْھِمْ رِجَالٌ قُلُوْبُھُمْ قُلُوْبُ الشَّیَاطِیْنِ

---

[1] صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۲۴ باب خِیارُ الائمۃِ وشرارُھم۔

فِیْ جُثْمَانِ اِنْسٍ .

میرے بعد کچھ ایسے امام ہوں گے جو نہ میری روش پر چلیں گے اور نہ میری سُنّت کا اِتّباع کریں گے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے جسم تو انسانوں کے سے ہوں گے مگر دل شیطانوں کے سے[1]

خلافت کے بارے میں حدیثِ نبوی ہے :

لَا یَزَالُ الدِّیْنُ قَآئِمًا حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَةُ اَوْ یَكُوْنَ عَلَیْكُمْ اثْنَا عَشَرَ خَلِیْفَةً كُلُّهُمْ مِّنْ قُرَیْشٍ .

دین اس وقت تک قائم رہے گا جب تک قیامت نہ آجائے یا بارہ خلیفہ نہ ہوجائیں جو سب قریش میں سے ہوں گے[2]

جابر بن سَمُرہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو سُنا، کہ آپ فرماتے تھے :

لَا یَزَالُ الْاِسْلَامُ عَزِیْزًا اِلَی اثْنَیْ عَشَرَ خَلِیْفَةٍ ، ثُمَّ قَالَ كَلِمَةً لَمْ اَفْهَمْهَا فَقُلْتُ لِاَبِیْ: مَا قَالَ ؟ فَقَالَ: كُلُّهُمْ مِّنْ قُرَیْشٍ .

بارہ خُلفاء تک اسلام کی عزّت باقی رہے گی۔ پھر کچھ فرمایا جو میں نہیں سُن سکا۔ میں نے اپنے والد سے پُوچھا کہ کیا فرمایا تھا؟ انھوں نے کہا کہ یہ فرمایا تھا کہ وہ سب خُلفاء قُریش میں سے ہوں گے[3]

امارت کے بارے میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

سَتَكُوْنُ اُمَرَاءُ فَتَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ فَمَنْ عَرَفَ

---

[1] صحیح مُسلم جلد ۶ صفحہ ۲۰ باب اَلْاَمْرُ بِلُزُوْمِ الْجَمَاعَةِ عِنْدَ ظُهُوْرِ الْفِتَنِ۔

[2] صحیح مُسلم جلد ۶ صفحہ ۴ باب اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَیْشٍ وَالْخِلَافَةُ فِیْ قُرَیْشٍ۔

[3] صحیح بُخاری جلد ۸ صفحہ ۱۰۵ - اور صفحہ ۱۲۸ - صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۳ -

بَرِئَ وَمَنْ اَنْكَرَ سَلِمَ وَلٰكِنْ مَنْ رَضِیَ وَتَابَعَ، قَالُوا اَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ قَالَ: لَا مَا صَلَّوْا.

جلد ہی کچھ اُمراء ہوں گے جن کو تم میں سے کچھ پہچانیں گے، کچھ نہیں۔ جس نے پہچانا بچ گیا، جس نے نہیں پہچانا محفوظ رہا مگر جس نے خوشی سے ان کا اتّباع کیا ..... لوگوں نے پوچھا کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟ آپ نے فرمایا: جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں اس وقت تک نہیں [1]

اِمارت سے متعلق ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

یَکُوْنُ اِثْنَا عَشَرَ اَمِیْرًا کُلُّھُمْ مِّنْ قُرَیْشٍ.

میرے بعد بارہ امیر ہوں گے جو سب قریش میں سے ہوں گے [2]

آپ نے اپنے اصحاب کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

سَتَحْرِصُوْنَ عَلَی الْاِمَارَةِ وَسَتَکُوْنُ نَدَامَةً یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَنِعْمَ الْمُرْضِعَةُ وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ.

تمھیں جلد امارت حاصل کرنے کا لالچ ہوگا لیکن یہ امارت قیامت کے دن باعثِ ندامت ہوگی۔ امارت دودھ پلانے والی تو اچھی ہے مگر دودھ چھڑانے والی اچھی نہیں [3]

ولایت کا لفظ بھی حدیث میں آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ وَّالٍ یَّلِیْ رَعِیَّةً مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَیَمُوْتُ وَھُوَ غَاشٌّ لَّھُمْ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ.

---

[1] صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۲۳ باب وُجوب الانکارِ علی الاُمراء۔

[2] صحیح بخاری جلد ۴ کتاب الاحکام۔

[3] صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۲۷ باب الاستخلاف۔

جس مُسلمان وَالی نے مُسلمان رعایا پر حکومت کی لیکن وہ انھیں
دھوکا دیتا رہا تو مرنے کے بعد اُس پر جنّت حرام ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں آپ فرماتے ہیں :

لَا یَزَالُ اَمْرُ النَّاسِ مَاضِیًا مَا وَلِیَھُمْ اثْنَا عَشَرَ رَجُلًا کُلُّھُمْ مِّنْ قُرَیْشٍ.

لوگوں کا کام اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک ان کے والی بارہ اشخاص ہوں گے جو سب قریش میں سے ہوں گے۔[2]

اِمامت اور خلافت کے مفہوم کا یہ مختصر سا جائزہ میں نے قرآن وسُنّت سے بغیر کسی تشریح اور توضیح کے پیش کیا ہے بلکہ میں نے سب احادیث کے لیے اہلِ سُنّت کی صِحاح پر اعتماد کیا ہے اور شیعہ کتابوں سے کوئی روایت نہیں لی، کیونکہ شیعوں کے نزدیک تو یہ بات یعنی بارہ خلفاء کی خلافت جو سب قریش میں سے ہوں گے مُسلّمات میں سے ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں اور جس کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ بعض اہلِ سُنّت والجماعت عُلماء کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ

یَکُوْنُ بَعْدِی اثْنَا عَشَرَ خَلِیْفَةً کُلُّھُمْ مِّنْ بَنِیْ ھَاشِمٍ.

میرے بعد بارہ خلیفہ ہوں گے جو سب بنی ہاشم میں سے ہوں گے۔ (ینابیعُ المودّة جلد ۳ صفحہ ۱۰۴)۔[3]

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۸ صفحہ ۱۰۶ باب مَایُکرہ مِن الحِرصِ علَی الاِمارۃ۔ [2] صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۳ باب الخلافۃ فی قُریش۔
[3] امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں :

اِنَّ الْاَئِمَّةَ مِنْ قُرَیْشٍ غُرِسُوْا فِیْ ھٰذَا الْبَطْنِ مِنْ ھَاشِمٍ، لَا تَصْلُحُ عَلٰی سِوَاھُمْ وَلَا تَصْلُحُ الْوُلَاةُ مِنْ غَیْرِھِمْ۔

بلاشبہ امام قریش میں سے ہوں گے جو اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی ہاشم کی کشت زار سے اُبھریں گے نہ امامت کسی اور کو زیب دیتی ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی اس کا اہل ہو سکتا ہے۔ (ناشر)

شعبی سے روایت ہے کہ مسروق نے کہا: ایک دن ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوتے انھیں اپنے مَصَاحِف دکھا رہے تھے کہ اتنے میں ایک نوجوان نے ان سے پوچھا: کیا آپ کے نبی نے آپ کو کچھ بتلایا ہے کہ ان کے بعد کتنے خلیفہ ہوں گے ابن مسعود نے اس شخص سے کہا: تم ہو تو نوعمر، لیکن تم نے بات ایسی پوچھی ہے جو تم سے پہلے کسی نے مجھ سے نہیں پوچھی۔ ہاں! ہمارے نبی نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے نقیبوں کی تعداد کے برابر ان کے بھی بارہ خُلفاء ہوں گے[1]

اب ہم اس مسئلے سے متعلق فریقین کے اقوال پر غور کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ جن صریح نصوص کو دونوں فریق تسلیم کرتے ہیں، وہ کس طرح ان کی تشریح و توضیح کرتے ہیں، کیونکہ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جو اُس دن سے جس دن رسول اللہ ؐ نے وفات پائی آجتک مسلمانوں میں نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ اسی مسئلے سے مسلمانوں میں وہ اختلاف پیدا ہوتے جن کی وجہ سے وہ مختلف فرقوں اور اعتقادی و فکری دبستانوں میں تقسیم ہو گئے حالانکہ اس سے پہلے وہ ایک اُمّت تھے۔

ہر اختلاف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا خواہ وہ فِقہ کے بارے میں ہو، قرآن کی تفسیر کے بارے میں ہو یا سُنّتِ نبوی کو سمجھنے کے بارے میں ہو، اس کا منشا اور اس کا سبب مسئلۂ خلافت ہی ہے۔

آپ مسئلۂ خلافت کو کیا سمجھتے ہیں؟

سقیفہ[2] کے بعد خلافت ایک "اَمرِ واقعہ" بن گئی اور اس کی وجہ سے بہت سی صحیح احادیث اور صریح آیات ردّ کی جانے لگیں اور ایسی احادیث گھڑی جانے لگیں، جن کی صحیح سُنّتِ نبوی میں کوئی بُنیاد نہیں تھی۔

اِس پر مجھے اسرائیل اور "اَمرِ واقعہ" کا قصہ یاد آگیا۔ عرب بادشاہوں اور سربراہوں کا اجلاس ہوا اور اس میں اتفاقِ رائے سے طے پایا کہ اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا،

---

[1] ینابیعُ المودۃ جلد ۳ صفحہ ۱۰۵

[2] سَقیفۂ بنی ساعِدہ: یہ سَعد بن عُبادہ انصاری کی بیٹھک تھی جس میں اہلِ مدینہ اکثر اپنے مُعاشرتی مسائل حل کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ (ناشر)

اس کے ساتھ مذاکرات نہیں کیے جائیں گے، صُلح نہیں ہوگی کیونکہ جس چیز پر طاقت کے زور سے قبضہ کرلیا گیا ہے وہ طاقت استعمال کیے بغیر واپس نہیں مل سکتی۔ چند سال بعد ایک اور اجلاس ہوا، اس میں فیصلہ ہوا کہ مصر سے تعلّقات منقطع کرلیے جائیں کیونکہ اس نے صہیونی ریاست کو تسلیم کرلیا ہے۔ چند سال اور گزر گئے۔ عرب سربراہانِ مملکت پھر جمع ہوئے۔ اِس بار انھوں نے مصر سے پھر تعلّقات قائم کرلیے۔ اور سب نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرلیا۔ حالانکہ اسرائیل نے فلسطینی قوم کے حق کو تسلیم نہیں کیا تھا اور نہ اپنے موقف میں کوئی تبدیلی پیدا کی تھی بلکہ اس کی ہٹ دھرمی بڑھ گئی تھی اور فلسطینی قوم کو کچلنے کی کارروائیوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اِس طرح تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ امرِ واقعہ کو تسلیم کرلینا عربوں کی عادت ہے۔

خلافت کے بارے میں اہلِ سُنّت کی رائے

اِس بارے میں اہلِ سُنّت کی رائے سب کو معلوم ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں کسی کو خلافت کے لیے نامزد نہیں کیا۔ لیکن صحابہ میں سے اہلِ حلّ و عقد سَقِیفۂ بنی ساعِدہ میں جمع ہوئے اور انھوں نے ابُوبکر صدّیق کو اپنا خلیفہ چُن لیا کیونکہ ایک تو ابُوبکر رسول اللہؐ سے بہت نزدیک تھے، دوسرے انھی کو رسول اللہؐ نے اپنے مرض الوفات میں نماز پڑھانے کے لیے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اہلِ سُنّت کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ابوبکر کو ہمارے دین کے کام کے لیے پسند کیا تو ہم انھیں اپنے دنیا کے کام کے لیے کیوں پسند نہ کریں۔

اہلِ سُنّت کے نقطۂ نظر کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

(۱) رسول اللہؐ نے کسی کو نامزد نہیں کیا۔ اِس سلسلے میں کوئی نص نہیں۔
(۲) خلیفہ کا تعیّن صرف شورٰی سے ہوتا ہے۔
(۳) ابوبکر کو کبارِ صحابہ نے خلیفہ منتخب کیا تھا۔

یہی میری خُود اپنی رائے تھی اس وقت جب کہ میں مالکی تھا۔ اس رائے کا دفاع میں پوری طاقت سے کیا کرتا تھا اور جن آیات میں شورٰی کا ذکر ہے انھیں میں

اپنی رائے کے ثبوت میں پیش کرتا۔ میں جہاں تک ہو سکتا تھا، فخریہ کہا کرتا تھا کہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو جمہوری نظامِ حکومت کا قائل ہے۔ اسلام نے اس انسانی اصول کو جس پر دُنیا کی ترقی یافتہ اور مہذّب قومیں فخر کرتی ہیں اوروں سے پہلے اپنالیا تھا۔ مغرب میں جو جمہوری نظام انیسویں صدی میں مُتعارف ہوا اسلام اس سے چھٹی صدی ہی میں واقف ہو چکا تھا۔

لیکن شیعہ علماء سے ملاقات کرنے، ان کی کتابیں پڑھنے اور ان کے اطمینان بخش دلائل معلوم کرنے کے بعد میں نے اپنی پہلی رائے بدل دی۔ اب حقیقت ظاہر ہو چکی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ اللہ سُبحانہٗ کی شان کے مُناسب نہیں کہ وہ کسی بھی اُمّت کو بغیر امام کے چھوڑ دے۔ جب کہ وہ خُود فرماتا ہے:

اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ.

آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہے۔ (سورۂ رعد۔ آیت ۷)

اسی طرح کیا رسول اللہ صؐ کی رحمت و رافت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ اپنی اُمت کو بغیر کسی سرپرست کے چھوڑ دیں خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ آپ کو خود اپنی اُمّت میں تفرقہ کا اندیشہ تھا[1] اور یہ ڈر تھا کہ کہیں لوگ اُلٹے پاؤں نہ پھر جائیں[2] دنیا کے حصول میں ایک دوسرے پر بازی لیجانے کی کوشش نہ کرنے لگیں[3] ایک دُوسرے کی گردن نہ مارنے لگیں[4] اور یہود و نصاریٰ کے طور طریقوں کی پیروی نہ کرنے لگیں[5]۔

یہ بھی یاد رہے کہ جب عُمر بن الخطّاب زخمی ہو گئے تو اُمّ المؤمنین عائشہ نے آدمی

---

[1] جامع ترمذی۔ سُنن ابو داؤد۔ سُنن ابن ماجہ۔ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۳۲۔

[2] صحیح بُخاری جلد ۷ صفحہ ۲۰۹ بابُ الحوض اور جلد ۵ صفحہ ۱۹۲۔

[3] صحیح بُخاری جلد ۴ صفحہ ۶۳۔

[4] صحیح بُخاری جلد ۷ صفحہ ۱۱۲۔

[5] صحیح بُخاری جلد ۴ صفحہ ۱۴۴۔

بھیج کر انھیں کہلوایا تھا کہ: اپنے بعد اُمّتِ محمّدیہ کا کوئی خلیفہ مقرر کر دیجیے اور اسے اپنے بعد بے یار و مددگار نہ چھوڑیے، کیونکہ مجھے فتنے کا اندیشہ ہے۔[1]

اِسی طرح حضرت عُمر کے زخمی ہو جانے کے بعد عبداللہ بن عُمر نے بھی اپنے والد سے کہا تھا کہ: لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کر رہے ہیں لیکن اگر آپ کا کوئی اُونٹ یا بھیڑیں چرانے والا ہو اور وہ گلے کو چھوڑ کر آپ کے پاس چلا آئے تو کیا آپ یہ نہیں سمجھیں گے کہ اس نے گلے کو کھو دیا۔ انسانوں کی دیکھ بھال تو اور بھی زیادہ ضروری ہے۔[2]

حضرت ابوبکر نے جن کو مسلمانوں نے شوریٰ کے ذریعے خلیفہ بنایا تھا خود ہی اس اُصول کو توڑ دیا تاکہ اس طرح مسلمانوں میں اِختلاف، تفرقہ اور فتنہ کے امکان کا سدِباب کیا جا سکے۔ یہ توجیہ اس صورت میں ہوگی جب ہم حُسنِ ظن سے کام لیں ورنہ امام علیؑ نے جو اس قضیے میں تمام پہلوؤں سے سب سے زیادہ واقف تھے، پہلے ہی پیشین گوئی کر دی تھی کہ ابوبکر کے بعد خلافت عُمر بن الخطاب ہی کے پاس جائے گی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب عُمر نے امام علیؑ پر ابوبکر کی بیعت کرنے کے لیے زور ڈالا تھا۔ امام علیؑ نے کہا تھا:

اِحْلِبْ حَلْبًا لَّكَ شَطْرُهٗ وَ اشْدُدْ لَهُ الْيَوْمَ يَرُدُّهٗ عَلَيْكَ غَدًا.

آج دُودھ دوہ لو، کل تمھیں اس کا آدھا حصّہ مل جائے گا۔
آج تم اس کی حیثیت مضبوط کر دو، کل وہ تمھیں واپس لوٹا دیگا۔[3]

میں کہتا ہوں کہ جب اُبوبکر ہی کو شوریٰ کے اُصول پر یقین نہیں تھا تو ہم کیسے مان لیں کہ رسول اللہؐ نے یہ مُعاملہ کسی کو خلیفہ نامزد کیے بغیر ایسے ہی چھوڑ دیا ہوگا۔ کیا آپ کو اس مصلحت کا عِلم نہیں تھا جس کا عِلم اُبوبکر، عائِشہ اور عبداللہ بن عُمر کو

---

[1] ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ جلد ۱ صفحہ ۲۸۔

[2] ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ جلد ۱ صفحہ ۱۸ اور مابعد۔

[3] صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۵ باب الاستخلاف و ترکہ۔

تھا اور جس سے سب لوگ صاف طور پر واقف تھے کہ اگر انتخاب کا اختیار عوام کو دیدیا جائے گا تو اس کا نتیجہ اختلاف کی شکل میں ظاہر ہوگا خاص کر جب معاملہ حکومت اور خلافت کا ہو۔ خود حضرت ابوبکر کے انتخاب کے موقع پر سقیفہ میں ایسا ہو بھی چکا تھا۔ انصار کے سردار سعد بن عبادہ، ان کے بیٹے قیس بن سعد، علی بن ابی طالب، زبیر ابن العوام[1]، عباس بن عبدالمطلب اور دوسرے بنی ہاشم اور بعض دوسرے صحابہ نے جو خلافت کو علیؑ کا حق سمجھتے تھے[2] مخالفت کی تھی اور وہ علیؑ کے مکان پر جمع ہو گئے تھے جہاں ان کو جلا دیے جانے کی دھمکی دی گئی تھی[3]

اس کے علاوہ ہم نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہؐ نے اپنی پوری عملی زندگی میں کبھی ایک دفعہ بھی کسی غزوہ یا سریہ کے کمانڈر کے تعین کے وقت اپنے اصحاب سے مشورہ کیا ہو۔

اسی طرح مدینہ سے باہر جاتے وقت کسی سے مشورہ کیے بغیر جس کو مناسب سمجھتے تھے اپنا جانشین مقرر کر جاتے تھے۔ جب آپ کے پاس وفود آتے تھے اور اپنے اسلام کا اعلان کرتے تھے اس وقت بھی ان سے مشورہ کیے بغیر ان میں سے جس کو چاہتے تھے ان کا سربراہ مقرر کر دیتے تھے۔

آپ نے اپنے اس طریق کار کو اس وقت مزید واضح کر دیا جب آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسامہ بن زید کو لشکر کا امیر مقرر کیا حالانکہ ان کی نوعمری اور صغر سنی کی وجہ سے کچھ لوگوں نے اعتراض بھی کیا مگر آپ نے اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے ان لوگوں پر لعنت کی جو اس لشکر میں شامل ہونے سے گریز کریں[4] اور واضح کر دیا کہ امارت، ولایت اور خلافت میں لوگوں کی مرضی داخل نہیں، یہ معاملہ رسولؐ کے حکم سے طے ہوتا ہے اور رسول کا حکم اللہ کا حکم ہے۔

جب صورت یہ ہو تو ہم کیوں نہ دوسرے فریق کے دلائل پر بھی غور کریں دوسرے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۶ باب رجم الحبلیٰ من الزنا۔

[2] و [3] ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ جلد اول صفحہ ۱۸ اور مابعد۔

[4] الملل والنحل، شہرستانی۔

فریق سے میری مُراد شیعہ ہیں جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ رسول اللہ صؐ نے امام علیؑ کو خلیفہ مقرر کیا تھا اور مختلف موقعوں پر اس کی تصریح بھی کر دی تھی جن میں سب سے مشہور "غدیرِ خُم" کا جلسہ ہے۔

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اختلاف کی صُورت میں آپ اپنے مخالف کی رائے اور دلیل کو سُنیں، خصُوصاً ایسی حالت میں جب کہ مخالف ایسے حقائق سے استدلال کر رہا ہو جن کو آپ بھی تسلیم کرتے ہوں[1]

شیعوں کی دلیل میں کوئی واہی یا کمزور بات نہیں جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔ بلکہ مُعاملہ قرآنی آیات کا ہے جو اس بارے میں نازل ہوئی ہیں جن کو خُود رسول اللہ صؐ نے جو اہمیت دی وہ اس قدر مشہور و معروف اور زبان زدِ خاص و عام ہے کہ حدیث اور تاریخ کی کتابیں اس سے بھری ہوئی ہیں اور راوی اسے نَسلاً بَعدَ نَسلٍ نقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔

(۱) ولایتِ علیؑ قرآن کریم میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ. وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ.

تمہارے ولی تو بس اللہ اور اس کا رسُول اور وہ مُومنین ہیں جو پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، رُکوع کی حالت میں زکوٰت دیتے

---

[1] قرآن کریم بھی ہمیں انصاف سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے:

اے ایمان والو! ..... لوگوں کی دشمنی تمھیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ (سورہ مائدہ - آیت ۸)

واضح رہے کہ شیعوں کی کوئی دلیل ایسی نہیں جس کی اصل اہلِ سُنّت کی کتابوں میں موجود نہ ہو۔

ہیں۔ جو کوئی اللہ، اس کے رسول اور ان مومنوں کی ولایت قبول کرے گا (وہ اللہ کی جماعت میں داخل ہوگا) بے شک اللہ ہی کی جماعت غلبہ پانے والی ہے۔ (سورۂ مائدہ - آیت ۵۵-۵۶)

ابو اسحاق ثعلبی[۱] نے اپنی تفسیر کبیر میں اپنی اسناد سے ابوذر غفاری سے یہ روایت بیان کی ہے۔ ابوذر کہتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے ان کانوں سے سُنا، نہ سُنا ہو تو یہ کان زنپٹ بہرے ہو جائیں اور اپنی ان آنکھوں سے دیکھا، نہ دیکھا ہو تو یہ ٹم اندھی ہو جائیں۔ آپؐ فرماتے تھے کہ "علیؑ نیکیوں کو رواج دینے والے اور کفر کو مٹانے والے ہیں۔ کامیاب ہے وہ جو ان کی مدد کرے گا اور ناکام ہے وہ جو ان کی مدد چھوڑ دے گا۔ ایک دن میں رسول اللہؐ[۲] کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک مانگنے والا مسجد میں آگیا، اسے کسی نے کچھ نہیں دیا۔ علیؑ نماز پڑھ رہے تھے، انھوں نے اپنی چھوٹی انگلی سے انگوٹھی اتار لی۔ اس پر رسول اللہؐ نے عاجزی سے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور کہا: یا الٰہی! میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے دُعا کی تھی اور کہا تھا: "اے میرے پروردگار! میرا سینہ کھول دے اور میرا کام آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ لیں، اور میرے اپنوں میں سے میرے بھائی ہارونؑ کو میرا مددگار بنا دے تاکہ میں تقویت حاصل کر سکوں اور انھیں میرا شریکِ کار بنا دے تاکہ ہم کثرت سے تیری تسبیح کریں اور بکثرت تجھے یاد کیا کریں"۔ تب تو نے انھیں وحی بھیجی کہ اے موسیٰ! تمھاری دُعا قبول ہوگئی۔ اے اللہ! میں تیرا بندہ اور نبی ہوں، میرا بھی سینہ کھول دے، میرا کام بھی آسان کر دے اور میرے اپنوں میں سے علیؑ کو میرا مددگار بنا دے تاکہ میں اس سے اپنی کمر مضبوط کر سکوں"۔ ابوذر کہتے ہیں کہ ابھی رسول اللہؐ نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ جبرئیلِ امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ۔[۲]

---

[۱] ابو اسحاق احمد بن محمد بن ابراہیم نیشاپوری، ثعلبی المتوفی ۴۲۷ھ۔ ابنِ خلکان کہتے ہیں کہ علمِ تفسیر میں یکتائے زمانہ تھے، روایت میں ثقہ اور قابلِ اعتماد تھے۔

[۲] الجمع بین الصحاح الستہ، سُنن نسائی، مسند امام احمد بن حنبل، صواعقِ محرقہ ابن حجر عسقلانی - شرح نہج البلاغہ۔

شیعوں میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت امام علی بن ابی طالبؑ کی شان میں اُتری ہے۔ اس کی توثیق ائمۂ اہلِ بیتؑ کی روایت سے ہوتی ہے جو شیعوں کے نزدیک قطعاً مُسلَّمُ الثبوت روایت ہے اور ان کی متعدد معتبر کتابوں میں موجود ہے جیسے :

(۱) اِثباتُ الہُداۃ - علامہ محمد بن حسن عاملی ۱۱۰۴ھ
(۲) بحارُالانوار - علامہ محمد باقر مجلسی ۱۱۱۱ھ
(۳) تفسیر المیزان - علامہ محمد حسین طباطبائیؒ ۱۴۰۲ھ
(۴) تفسیر الکاشف - علامہ محمد جواد مغنیہؒ
(۵) الغدیر - علامہ عبدالحسین احمد امینی ۱۳۹۰ھ

عُلمائے اہلِ سُنّت کی بھی ایک بڑی تعداد نے اِس آیت کے علی بن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں نازل ہونے کے متعلق روایت بیان کی ہے۔ میں ان میں سے فقط عُلمائے تفسیر کا ذکر کرتا ہوں :

(۱) تفسیر کشّاف عن حقائق التنزیل - جار اللہ محمود بن عمر زمخشری ۵۳۸ھ جلد ۱ صفحہ ۶۴۹
(۲) تفسیر جامع البیان - حافظ[1] محمد بن جریر طبری ۳۱۰ھ جلد ۶ صفحہ ۲۸۸
(۳) تفسیر زادُالمسیر فی علم التفسیر - سبط ابن جوزی ۶۵۴ھ جلد ۲ صفحہ ۳۸۳
(۴) تفسیر الجامع لاحکام القرآن - محمد بن احمد قرطبی ۶۷۱ھ جلد ۶ صفحہ ۲۱۹
(۵) تفسیر کبیر - امام فخرالدین رازی شافعی ۶۰۶ھ جلد ۱۲ صفحہ ۲۶
(۶) تفسیر القرآن العظیم - اسماعیل بن عمر المعروف ابن کثیر ۷۷۴ھ جلد ۲ صفحہ ۷۱
(۷) تفسیر القرآن الکریم - ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی ۷۰۱ھ جلد ۱ صفحہ ۲۸۹
(۸) تفسیر شواہدُ التنزیل لقواعد التفصیل و التاویل - حافظ حاکم حسکانی جلد ۱ صفحہ ۱۶۱
(۹) تفسیر دُرِّ منثور - حافظ جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ جلد ۲ صفحہ ۲۹۳

---

[1] اہلِ سُنّت میں راویانِ حدیث کے القاب کی درجہ بندی مندرجہ ذیل ہے :
۱- مُحدِّث : جسے درایتِ حدیث پر عبور ہو ۲- حَافِظ : جسے ایک لاکھ حدیثیں یاد ہوں
۳- حُجّت : جسے تین لاکھ حدیثیں یاد ہوں ۴- حَاکِم : جسے سب حدیثیں یاد ہوں۔ (ناشر)

(۱۰) اسبابُ النزول - امام ابوالحسن واحدی نیشاپوری ۴۶۸ھ صفحہ ۱۴۸
(۱۱) احکامُ القرآن - ابوبکر احمد بن علی الجصاص حنفی ۳۷۰ھ جلد ۴ صفحہ ۱۰۳
(۱۲) التسہیل لِعُلومِ التنزیل - حافظ کلبی غرناطوی ۷۴۱ھ جلد ۱ صفحہ ۱۸۱

عُلمائے اہلِ سُنّت میں سے جن کے نام میں نے لیے ہیں، ان سے زیادہ وہ ہیں جن کے نام میں نے نہیں لیے۔ لیکن وہ عُلمائے شیعہ سے اس پر متفق ہیں کہ یہ آیت وِلایتِ علی بن ابی طالبؑ کی بابت نازل ہوئی ہے۔

(۲) آیۂ تبلیغ کا تعلّق بھی وِلایتِ علی سے ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ.

اے رسولؐ! جو حکم تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس آیا ہے اُسے پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تمھیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ (سورۂ مائدہ - آیت ۶۷)

بعض اہلِ سُنّت مُفسّرین کہتے ہیں کہ یہ آیت بِعثت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہؐ قتل اور ہلاکت کے خوف سے اپنے ساتھ محافظ رکھتے تھے جب آیت نازل ہوئی کہ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تو آپ نے اپنے محافظوں سے کہا: تم جاؤ، اب اللہ نے میری حفاظت کا ذمّہ لے لیا ہے۔

ابنِ جریر اور ابنِ مَردُوَیہ نے عبداللہ بن شقیق سے روایت بیان کی ہے کہ کچھ صحابہ رسول اللہؐ کے ساتھ سائے کی طرح رہتے تھے۔ جب آیت نازل ہوئی وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تو آپ نے باہر نکل کر فرمایا: لوگو! اپنے گھر والوں کے پاس چلے جاؤ، اللہ نے میری حفاظت کا ذمّہ لے لیا ہے۔

(تفسیر دُرِّ مَنثور - سُیوطی جلد ۳ صفحہ ۱۱۹)

ابنِ حبّان اور ابن مَردُوَیہ نے ابُوہریرہ سے روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جب ہم کسی سفر میں رسول اللہؐ کے ساتھ ہوتے تھے تو سب سے بڑا اور سایہ دار درخت ہم آپ کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ آپ اسی کے نیچے اُترتے تھے۔ ایک دن آپ ایک درخت کے نیچے اُترے اور اس پر اپنی تلوار لٹکا دی۔ ایک شخص آیا اور اس نے وہ تلوار اُٹھالی۔ کہنے لگا: "محمدؐ! بتاؤ اب تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟" آپ نے فرمایا: "اللہ بچائے گا تُو تلوار رکھ دے۔" اُس نے تلوار رکھ دی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ [1]

ترمذی، حاکم اور ابونُعیم نے عائشہ سے روایت کی ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہؐ کے ساتھ مُحافظ رہتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تو آپ نے قُبّہ سے سر نکال کر کہا: تم لوگ چلے جاؤ، اللہ نے میری حفاظت کا ذمّہ لے لیا ہے۔

طَبرانی، ابونُعیم، ابن مَردُوَیہ اور ابنِ عَساکِر نے ابن عبّاس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ کے ساتھ مُحافظ رہتے تھے۔ آپ کے چچا ابوطالِب ہر روز بنی ہاشم میں سے کسی شخص کو آپ کے ساتھ رہنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ پھر آپ نے ان سے کہہ دیا: چچا جان! اللہ نے میری حفاظت کا ذمّہ لے لیا ہے اب کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

جب ہم ان احادیث پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مضمون آیتِ کریمہ کے ساتھ میل نہیں کھاتا اور نہ اس کے سِیاق وسَباق کے ساتھ ٹھیک بیٹھتا ہے۔ اِن سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بِعثت کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئی ہے۔ ایک روایت میں تو تصریح ہے کہ یہ واقعہ ابُوطالب کی زندگی کا ہے یعنی ہجرت سے کئی سال قبل کا۔ خُصوصاً ابُوہریرہ تو یہ تک کہتے ہیں کہ جب ہم سفر میں رسول اللہؐ کے ہمراہ ہوتے تھے تو ان کے لیے سب سے بڑا درخت چھوڑ دیتے تھے ظاہر ہے کہ یہ روایت موضوع ہے کیونکہ ابوہُریرہ جیسا کہ وہ خُود اعتراف کرتے ہیں

---

[1] تفسیر دُرِّ منثور، سُیوطی

نسـہ ہجری سے قبل اسلام اور رسول اللہ کو جانتے بھی نہیں تھے[1] عائشہ اُس وقت تک یا تو پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں یا ان کی عمر دو سال سے زیادہ نہیں تھی کیونکہ یہ معلوم ہے کہ ان کا نکاح رسول اللہ ص سے ہجرت کے بعد ہوا اور اس وقت ان کی عُمر زیادہ سے زیادہ باختلافِ روایت گیارہ سال تھی۔ پھر یہ روایتیں کیسے صحیح ہو سکتی ہیں؟ تمام سُنّی اور شیعہ مُفسّرین کا اس پر اتفاق ہے کہ سُورۂ مائدہ مَدَنی سُورت ہے، اور یہ قرآن کی سب سے آخری سورت ہے جو نازل ہوئی۔

احمد اور ابو عُبید اپنی کتاب فضائل میں، نحّاس اپنی کتاب ناسخ میں، نسائی، ابنِ مُنذر، حاکم، ابن مَردُویہ اور بیہقی اپنی سُنن میں جُبیر بن نفیر سے روایت کرتے ہیں کہ جُبیر نے کہا: میں حج کرنے گیا تو حضرت عائشہ سے بھی ملنے گیا۔ انھوں نے کہا: جُبیر! تم نے سورۂ مائدہ پڑھی ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگیں کہ یہ آخری سُورت ہے جو نازل ہوئی۔ اس میں تم جس چیز کو حلال پاؤ اُسے حلال سمجھو اور جسے حرام پاؤ اُسے حرام سمجھو[2]

احمد اور ترمذی نے روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح اور حسَن کہا ہے ابنِ مَردُویہ اور بیہقی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن عُمر نے نزُول کے اعتبار سے سُورۂ مائدہ کو آخری سورت بتایا ہے[3]

ابو عُبید نے محمد بن کعب قرظی کے حوالے سے روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سُورۂ مائدہ رسول اللہ ص پر حجۃُ الوَداع میں اُتری۔ اُس وقت آپ مکّہ اور مدینہ کے درمیان ایک اُونٹنی پر سوار تھے، وحی کے بوجھ سے اُونٹنی کا کندھا ٹوٹ گیا تو آپ اُتر گئے[4]

ابن جریر نے ربیع بن اَنَس سے روایت کی ہے کہ جب سُورۂ مائدہ رسول اللہ ص پر نازل ہوئی اس وقت آپ اپنی سواری پر سوار تھے۔ وحی کے بوجھ سے اُونٹنی بیٹھ گئی

---

[1] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۱ - البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۰۲ - سِیَرُ اَعلامِ النُّبَلاء، ذہبی جلد ۲ صفحہ ۴۳ الاِصابہ، ابنِ حجر جلد ۳ صفحہ ۲۸۷ -

[2] تا [4] تفسیر دُرِّ منثور، سُیوطی جلد ۳ صفحہ ۳ -

تھی [1]

ابو عُبید نے ضمرہ بن حبیب اور عطیہ بن قیس سے روایت کی ہے، وہ دونوں کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: نزول کے اعتبار سے مائدہ آخری سورت ہے جو اس میں حلال ہے اُسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام ہے، اُسے حرام سمجھو [2]

اب اِن تمام روایات کی موجودگی میں کوئی انصاف پسند سمجھ دار شخص کیسے یہ دعویٰ تسلیم کر سکتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت بعثتِ رسولؐ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی۔ جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے ان میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ نزول کے اعتبار سے سورۂ مائدہ قرآن کی آخری سورت ہے اور خاص کر آیۂ تبلیغ حجۃ الوداع کے بعد ۱۸ ذی الحجہ کو امام علیؑ کے منصبِ امامت پر تقرر سے پہلے غدیرِ خُم میں نازل ہوئی۔ اُس دن جمعرات تھی، پانچ ساعت دن گزر جانے کے بعد جبریلؑ نازل ہوئے اور آنحضرت سے بولے: اے محمدؐ! اللہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ.

اللہ تعالیٰ کا وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ کہنا واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ یا تو رسالت کا کام ختم ہو چکا ہے یا ختم ہونے کے قریب ہے اور صرف ایک اہم کام باقی رہ گیا ہے جس کے بغیر دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

اِس آیتِ کریمہ سے یہ بھی تاثر ملتا ہے کہ رسول اللہؐ کو یہ اندیشہ تھا کہ جب وہ اِس اہم کام کی طرف لوگوں کو بُلائیں گے تو لوگ اُن کو جھٹلائیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو تاخیر کی اجازت نہیں دی کیونکہ وقتِ موعود نزدیک تھا اور یہ اِس کام کے لیے بہترین موقع تھا، آپ کے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ اصحاب موجود تھے جنھوں نے ابھی ایک ہفتہ پہلے آپ کے ساتھ حج کیا تھا، ابھی تک ان کے قلوب مراسمِ حج کے نور سے معمور تھے، اُنھیں یہ بھی یاد تھا کہ رسول اللہؐ نے انھیں اپنی وفات کے قریب

---

[1] و [2] سیوطی، تفسیر دُرِّ منثور جلد ۳ صفحہ ۳۔

ہونے کی خبر دی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا :

لَعَلِّی لَا اَلْقَاکُمْ بَعْدَ عَامِی ھٰذَا وَیُوشَکُ اَنْ یَّاْتِی رَسُوْلُ رَبِّیْ وَاُدْعٰی فَاُجِیْبَ.

شاید اس سال کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں۔ وہ وقت قریب ہے جب میرے پروردگار کا بُلاوا آجائے گا اور مجھے جانا ہوگا۔

اب وہ وقت بھی قریب تھا جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لیے منتشر ہونے والے تھے۔ شاید پھر اتنے بڑے مجمع سے ملاقات کا موقع نہ مل سکے۔ غدیرِ خُم کئی راستوں کے سنگم پر واقع تھا۔ رسول اللہ صلعم کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی طرح بھی ایسے سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے دیں۔ اور کیسے جانے دے سکتے تھے جب وحی آچکی تھی جس میں ایک طرح کی تنبیہ بھی تھی اور کہا گیا تھا کہ آپ کی رسالت کا دار و مدار اسی پیغام کو پہنچانے پر ہے۔ اللہ سُبحانہٗ نے آپ کو لوگوں کے شر سے بچانے کی ضمانت بھی دیدی تھی اور کہہ دیا تھا کہ تکذیب سے خوف کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ آپ سے پہلے بھی کتنے ہی رسول جھٹلائے جا چکے ہیں لیکن اس کی وجہ سے جو پیغام ان کو دیا گیا تھا وہ اس کو پہنچانے سے باز نہیں رہے، اِس لیے کہ رسول کا فریضہ ہی پہنچانا ہے۔ مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ۔ گو اللہ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اکثر لوگ حق کو پسند نہیں کرتے[1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: گو اللہ کو معلوم ہے کہ ان میں جھٹلانے والے ہیں[2] جب بھی اللہ انھیں حُجّت قائم کیے بغیر چھوڑنے والا نہیں۔ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَکَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا.[3]

اِس کے علاوہ آپ کے سامنے ان رسولوں کی مثال تھی جن کو ان کی قوموں نے جُھٹلایا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَاِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ وَقَوْمُ اِبْرَاهِیْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحَابُ مَدْیَنَ وَکُذِّبَ مُوْسٰی فَاَمْلَیْتُ لِلْکَافِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ

---

[1] سورۂ زُخرُف - آیت ۷۸ [2] سورۂ الحاقّہ - آیت ۴۹ [3] سورۂ نساء - آیت ۱۶۵-

فَكَيفَ كَانَ نَكِيرِ.

اگر یہ لوگ تم کو جھٹلاتے ہیں تو کیا ہوا، ان سے پہلے قومِ نوح اور عاد و ثمود اور قومِ ابراہیم، قومِ لوط اور اہلِ مَدیَن بھی تو اپنے اپنے پیغمبروں کو جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰ بھی تو جھٹلائے جا چکے ہیں۔ چنانچہ پہلے تو میں کافروں کو مہلت دیتا رہا پھر میں نے انہیں پکڑ لیا۔ سو دیکھو میرا عذاب کیسا ہوا۔ (سورۂ حج۔ آیت ۴۲ تا ۴۴)

اگر ہم تعصّب اور اپنے مذہب کی حِمیت سے مَحبّت کا خیال چھوڑ دیں تو یہ تشریح زیادہ سمجھ میں آنے والی ہے اور اِس آیت کے نُزول سے پہلے اور بعد میں جو واقعات پیش آئے ان سے بھی زیادہ ہم آہنگ ہے۔

علمائے اہلسُنّت کی ایک بڑی تعداد نے اِس آیت کے امام علیؑ کے تقرر کے بارے میں غدیرِ خُم کے مقام پر نازل ہونے کی روایت بیان کی ہیں اور ان کو صحیح کہا ہے اور اس طرح اپنے شیعہ بھائیوں کے ساتھ اتفاق رائے کا مُظاہرہ کیا ہے۔ ہم مثال کے طور پر ذیل میں چند عُلمائے اہلِ سُنّت کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) حافظ ابونُعیم اصفہانی متوفی ۴۳۰ھ نُزولُ القرآن

(۲) امام ابُوالحسن واحدی نیشاپوری متوفی ۴۶۸ھ اسبابُ النزول صفحہ ۱۵۰

(۳) امام ابواسحاق ثعلبی نیشاپوری، متوفی ۴۲۷ھ تفسیر الکَشفُ وَالبیان

(۴) حافظ حاکمِ حسکانی حنفی شَواھِدُ التنزیل لقواعِدِ التفصیلِ والتأویل جلد ۱ صفحہ ۱۸۷

(۵) امام فخرالدین رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ تفسیر کبیر جلد ۱۲ صفحہ ۵۰

(۶) حافظ جلال الدین سیوطی شافعی ۹۱۱ھ تفسیر الدر المنثور جلد ۳ صفحہ ۱۱۷

(۷) مفتی شیخ محمد عَبدُہ ۱۳۲۳ھ تفسیر المنار جلد ۲ صفحہ ۸۶ وجلد ۶ صفحہ ۴۶۳

(۸) حافظ ابوالقاسم ابنِ عساکر شافعی ۵۷۱ھ تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۸۶

(۹) قاضی محمد بن علی شوکانی ۱۲۵۰ھ تفسیر فتحُ القدیر جلد ۲ صفحہ ۶۰

(۱۰) ابن طلحہ شافعی ۶۵۲ھ مَطالبُ السُّئول جلد ۱ صفحہ ۴۴

(۱۱) حافظ سلیمان قندوزی حنفی ۱۲۹۴ھ ینابیعُ المودّة صفحہ ۱۲۰

(۱۲) محمد عبدالکریم شہرستانی شافعی ۵۴۸ھ المِلَلُ وَالنحل جلد ۱ صفحہ ۱۶۳

(۱۳) نورالدین ابن الصباغ مالکی ۸۵۵ھ الفصول المھمہ صفحہ ۲۵
(۱۴) حافظ محمد بن جریر طبری ۳۱۰ھ کتاب الولایہ
(۱۵) حافظ ابوسعید سجستانی ۴۷۷ھ کتاب الولایہ
(۱۶) بدرالدین ابن عینی حنفی ۸۵۵ھ عمدۃ القاری فی شرح البخاری جلد ۸ صفحہ ۵۸۴
(۱۷) سیّد عبدالوہاب البخاری ۹۳۲ھ تفسیر القرآن
(۱۸) سیّد شہاب الدین آلوسی شافعی ۱۲۷۰ھ روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۳۸۴
(۱۹) شیخ الاسلام محمد بن ابراہیم حمّوینی حنفی ۷۲۲ھ فرائد السمطین جلد ۱ صفحہ ۱۸۵
(۲۰) سیّد صدیق حسن خان فتح البیان فی مقاصد القرآن جلد ۳ صفحہ ۶۳ - [۱]

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا کہ جو کچھ آپ پر اُترا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیجیے تو اس پر آپ نے کیا کیا؟

شیعہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے لوگوں کو ایک جگہ غدیر خُم کے مقام پر جمع کیا اور ایک طویل اور نہایت بلیغ خطبہ دیا۔ آپ کے گواہی مانگنے پر لوگوں نے گواہی دی کہ آپ کا ان پر خود ان سے زیادہ حق ہے۔ اس پر آپ نے علی بن ابی طالبؑ کا ہاتھ بلند کر کے کہا:

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ وَانْصُرْ مَنْ نَّصَرَهُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ وَاَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ [۲]

میں جس کا مولا ہوں یہ علی بھی اس کے مولا ہیں۔ خُداوندا! جو علیؑ سے دوستی رکھے اُس سے تو بھی دوستی رکھ اور جو اُن سے دشمنی رکھے تو بھی اُس سے دشمنی رکھ۔ جو ان کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو ان کا ساتھ چھوڑ دے تو بھی اس کا ساتھ

---

[۱] میں نے یہاں کچھ عُلماء کا ذکر کیا ہے جبکہ علامہ امینی نے اپنی کتاب الغدیر میں تفصیل سے عُلمائے اہلِ سُنّت کا ذکر کیا ہے۔

[۲] یہ حدیث حدیثِ غدیر کے نام سے موسوم ہے شیعہ اور سُنّی عُلماء نے اسے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

چھوڑ دے۔ جس طرف علیؑ کا رُخ ہو اسی طرف حق کا رُخ پھیر دے۔

اس کے بعد آپ نے حضرت علیؑ کو عمامہ پہنایا اور اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ علیؑ کو امیرالمومنین ہو جانے کی مُبارکباد دیں۔ چنانچہ سب نے مُبارکباد دی۔ ابُوبکر اور عمرؓ نے بھی تبریک و تہنیت پیش کی اور کہا: اے فرزندِ ابُوطالبؑ! تمھیں اُمّت کی پیشوائی مُبارک ہو۔ آج سے تم ہر مومن اور مومنہ کے مولا بن گئے۔[1]

اِس تقریب کے اختتام پر یہ آیت نازل ہوئی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمّل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ (سورۂ مائدہ - آیت ۳)

یہ شیعوں کا نظریہ ہے جو ان کے نزدیک مُسلّمات میں سے ہے اور جس کے متعلق ان کے یہاں دو رائیں نہیں ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس واقعہ کا ذکر اہلِ سُنّت کے یہاں بھی موجود ہے؟

ہم نہیں چاہتے کہ جانبداری سے کام لیں اور شیعوں کی باتوں میں آجائیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تنبیہ کی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جب وہ دُنیاوی غرض سے باتیں کرتے ہیں تو ان کی باتیں آپ کو اچھی معلوم ہوتی ہیں اور جو اُن کے دل میں ہے وہ اللہ کو اس پر گواہ لاتے ہیں مگر (درحقیقت) وہ سخت جھگڑالو ہیں۔ (سُورۂ بقرہ - آیت ۲۰۴)

---

[1] مُسند امام احمد بن حنبل۔ تفسیر جامعُ البیان، طبری۔ تفسیر کبیر، رازی۔ صَواعقِ مُحرقہ، ابن حجر عسقلانی دار قطنی۔ بیہقی۔ خطیب بغدادی اور شہرستانی وغیرہ نے بھی یہ واقعہ اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

اِس لیے ضروری ہے کہ ہم اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے پوری احتیاط سے کام لیں، فریقین کے دلائل پر دیانت داری سے غور کریں اور ایسا کرتے ہوئے ہمارا مقصد اللہ کی رضا ہو۔ رہا یہ سوال کہ کیا اس واقعہ کا ذکر اہلِ سُنّت کے یہاں بھی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں! بہت سے عُلمائے اہلِ سُنّت نے اِس واقعے کے ہر مرحلے کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی خدمت میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

امام احمد بن حنبل نے زید بن ارقم کی حدیث نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے ساتھ ہم ایک وادی میں اُترے جو وادیٔ خم کے نام سے موسوم تھی، رسول اللہؐ نے نماز کا حکم دیا۔ چنانچہ ہم نے دوپہر کی چلچلاتی دُھوپ میں نماز پڑھی اس کے بعد آپ نے خُطبہ دیا۔ دُھوپ سے بچاؤ کی غرض سے آپ کے لیے ایک درخت پر کپڑا پھیلا دیا گیا تھا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کیا تم گواہی نہیں دیتے کہ میرا تم پر خُود تم سے زیادہ حق ہے؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں بے شک! آپ نے کہا:

مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ۔

پس جس کا میں مولا ہوں، اس کے علیؑ بھی مولا ہیں۔ بارِالٰہا! جو اِن سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو اُن سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دُشمنی رکھ ... [1]

امام نَسائی نے کتابُ الخصَائِص میں زید بن اَرقم سے روایت نقل کی ہے۔ زید بن ارقم نے کہا: جب حجۃُ الوداع سے واپس آتے ہوتے رسول اللہؐ غدیرِ خُم کے مقام پر اُترے تو آپ نے درختوں کے جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے کہا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا بُلاوا آگیا اور میں جا رہا ہوں۔ میں تمھارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، ایک چیز دوسری چیز سے بڑی ہے، کتابُ اللہ اور میری عِترت! یعنی میرے اہلِ بیت۔ دیکھو میرے بعد تم ان سے کیا سلوک کرتے ہو۔ یہ دونوں چیزیں حوض پر آنے تک ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گی۔" پھر کہا: بیشک اللہ

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۷۲

میرا مولا ہے اور میں ہر مومن کا ولی ہوں۔ پھر آپ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

مَنْ کُنْتُ وَلِیَّهٗ فَهٰذَا وَلِیُّهٗ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ.

جس کا میں ولی ہوں، یہ بھی اس کے ولی ہیں۔ اے اللہ! جو علیؑ سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو ان سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔

ابو طُفیل کہتے ہیں میں نے زید بن ارقم سے پوچھا: کیا تم نے خود رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے؟ زید نے کہا: جتنے لوگ بھی وہاں درختوں کے قریب تھے، سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا[1]

حاکم نیشاپوری نے زید بن ارقم سے دو طریقوں سے یہ روایت بیان کی ہے اور دونوں طریقے عَلٰی شَرْطِ الشَّیْخَیْن (بخاری و مسلم) صحیح ہیں۔ زید بن ارقم نے کہا کہ:

جب رسول اللہؐ حجۃ الوداع سے واپسی میں غدیرِ خُم کے مقام پر اُترے، آپ نے درختوں کے جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنے کا حکم دیا۔ صفائی کے بعد آپ نے فرمایا کہ: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا بُلاوا آگیا ہے اور میں جا رہا ہوں مگر میں تمھارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، ان میں ایک دُوسری سے بڑی ہے۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عِترت یعنی اہلِ بَیت۔ اب دیکھو تم میرے بعد ان کے ساتھ کیسا سُلوک کرتے ہو کیونکہ وہ دونوں ایک دُوسرے سے ہرگز جُدا نہیں ہونگی یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد کہا: اللہ تعالیٰ میرا مولیٰ ہے اور میں ہر مومن کا مولیٰ ہوں۔ پھر علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا وَلِیُّهٗ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ

جس کا میں مولیٰ ہوں، اُس کے یہ ولی ہیں۔ اے خُدا! جو علیؑ کو دوست رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو علی سے دشمنی

---

[1] نسائی خصائص امیر المومنینؑ صفحہ ۲۱

رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔[1]

یہ حدیث مسلم نے بھی اپنی صحیح میں اپنی سَنَد سے زید بن ارقم ہی کے حوالے سے بیان کی ہے لیکن مختصر کر کے۔ زید بن ارقم نے کہا:

ایک دن رسول اللہؐ نے اس تالاب کے قریب خطبہ دیا جسے خُم کہا جاتا ہے اور جو مکّے اور مدینے کے درمیان واقع ہے۔ آپ نے حمد وثنا اور وعظ ونصیحت کے بعد فرمایا کہ: لوگو! میں بھی انسان ہوں، وہ وقت قریب ہے جب میرے پروردگار کا بُلاوا آجائے اور میں چلا جاؤں۔ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ پہلی چیز کتابُ اللہ ہے جس میں ہدایت اور نور ہے۔ کتابُ اللہ کا دامن پکڑ لو اور اس سے چمٹے رہو۔ آپ نے کتابُ اللہ سے تعلّق پر لوگوں کو اکسایا اور رغبت دلائی۔ پھر کہا: دُوسرے میرے اہلِ بَیت۔ میں اپنے اہلِ بَیت کے بارے میں تمھیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہلِ بَیت کے بارے میں تمھیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں تمھیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔" (آپ نے زیادہ تاکید کے لیے تین بار کہا)[2]

اگرچہ امام مُسلم نے واقعہ کو مختصر کر کے بیان کیا ہے اور پُورا واقعہ بیان نہیں کیا لیکن بحمد اللہ اتنا بھی کافی وشافی ہے۔ اِختصار شاید زید بن ارقم نے خود کیا ہے، کیونکہ وہ سیاسی حالات کی وجہ سے "حدیثِ غدیر" کو چھپانے پر مجبور تھے۔ یہ بات سیاقِ حدیث سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ راوی کہتا ہے کہ میں، حُصَین بن سَبرَہ اور عُمر بن مُسلم ہم تینوں زید بن ارقم کے پاس گئے۔ جب ہم بیٹھ گئے تو حُصَین نے زید سے کہا: آپ نے بڑے اچھے دن دیکھے ہیں، آپ نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے، آپ کی باتیں سُنیں، آپ کے ساتھ غزوات میں شرکت کی، آپ کے پیچھے نماز پڑھی، ہمیں بھی کچھ سُنایئے جو آپ نے رسول اللہؐ سے سُنا ہو۔ زید نے کہا: بھتیجے! میں بڈھا ہوگیا ہوں اور

---

[1] مُستدرک علی الصحیحین جلد ۳ صفحہ ۱۰۹

[2] صحیح مُسلم جلد ۷ صفحہ ۱۲۲ باب فضائل علی بن ابی طالبؑ۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل، ترمذی، اور ابنِ عساکر وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے۔

میری عمر زیادہ ہوگئی ہے، رسول اللہ ص کی بعض باتیں جو مجھے یاد تھیں، اب بھول گیا ہوں اس لیے میں جو کچھ سناؤں، وہ سن لو اور جو نہ سناؤں تو مجھے اس کے سنانے کی تکلیف نہ دو۔ اس کے بعد کہا: ایک دن رسول اللہ ص نے ہمیں اس تالاب کے قریب خطبہ دیا، جسے خم کہا جاتا ہے۔الخ

اس سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ حصین نے زید بن ارقم سے غدیر کے واقعہ کے بارے میں دریافت کیا تھا اور یہ سوال دوسرے لوگوں کی موجودگی میں پوچھ کر زید کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زید کو معلوم تھا کہ اس سوال کا صاف جواب ایسی حکومت کے ہوتے ہوئے انھیں مشکلات میں مبتلا کرسکتا تھا جو لوگوں سے یہ کہتی ہو کہ علی بن ابی طالبؑ پر لعنت کریں۔ اسی لیے انھوں نے سائل سے معذرت کرلی تھی کہ ان کی عمر زیادہ ہوگئی ہے اور وہ بہت کچھ بھول گئے ہیں۔ پھر انھوں نے حاضرین سے مزید کہا کہ جو کچھ میں سناؤں وہ سن لو اور جو نہ سنانا چاہوں اس کے سنانے کی تکلیف نہ دو۔

اگرچہ خوف کے مارے زید بن ارقم نے واقعہ کو بہت مختصر کرکے بیان کیا ہے پھر بھی، اللہ انھیں جزائے خیر دے انھوں نے بہت سے حقائق بیان کردیئے اور نام لیے بغیر "حدیثِ غدیر" کی طرف اشارہ بھی کردیا۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ص نے ہمیں خطبہ دیا اس تالاب کے نزدیک جسے خم کہا جاتا ہے اور جو مکّے اور مدینے کے درمیان واقع ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کی اور بتلایا کہ علیؑ حدیثِ ثقلین کی رو سے کتاب اللہ کے ساتھ شریک ہیں، لیکن یہاں بھی علیؑ کا نام نہیں لیا اور یہ لوگوں کی ذہانت پر چھوڑ دیا کہ وہ خود نتیجہ نکال لیں۔ کیونکہ یہ سب مسلمانوں کو معلوم ہے کہ علیؑ ہی اہلِ بیتِ نبوّت کے سردار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود امام مسلم نے بھی حدیث کا وہی مطلب سمجھا جو ہم نے سمجھا ہے کیونکہ انھوں نے یہ حدیث باب فضائل علی بن ابی طالبؑ میں بیان کی ہے حالانکہ حدیث میں علی بن ابی طالبؑ کا نام تک نہیں۔

طبرانی نے صحیح سند سے معجم کبیر میں زید بن ارقم اور حذیفہ بن اُسید غفاری سے روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ص نے غدیرِ خم میں درختوں کے نیچے

خُطبہ دیا۔آپ نے فرمایا: اب وقت آگیا ہے کہ میرا بُلاوا آجائے اور میں چلا جاؤں۔ میری بھی ذمّہ داری ہے اور تمھاری بھی ذمّہ داری ہے۔اب تم کیا کہتے ہو؟ سب نے کہا: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا اور کوشش کی اور ہمیں نصیحت کی، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے فرمایا: "کیا تم گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سِوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رَسُول ہیں۔جنّت حق ہے، دوزخ حق ہے، مَوت حق ہے اور مَوت کے بعد زندہ ہونا برحق ہے۔ قیامت ضرور آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ قبر کے مردوں کو ضرور زندہ کرے گا۔" حاضرین نے کہا: جی ہاں! ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔آپ نے فرمایا: "اے اللہ تو اس کا گواہ رہنا۔" پھر فرمایا: "لوگو! اللہ میرا مولا ہے اور میں مُومنین کا مولیٰ ہوں۔میں ان پر خود ان سے زیادہ حق ہے۔پس جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ (علیؑ) بھی مولا ہیں۔ اے اللہ! جو ان سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو ان سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔" پھر فرمایا: میں تم سے آگے جا رہا ہوں، تم حوض پر ضرور آؤ گے، حوض یہاں سے لے کر صنعاء تک کے فاصلے سے چوڑا ہے۔اس میں اتنے چاندی کے پیالے ہیں جتنے آسمان پر ستارے۔ جب تم میرے پاس آؤ گے تو میں تم سے ثقلین کے بارے میں پُوچھوں گا کہ تم نے میرے بعد ان کے ساتھ کیسا سُلوک کیا۔ ثقلِ اکبر کتابُ اللہ ہے۔ یہ ایک ڈوری ہے جس کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمھارے ہاتھ میں۔اس لیے اسے مضبوط پکڑے رہنا۔ نہ گمراہی اختیار کرنا اور نہ اپنی روش بدلنا۔ ثقل اصغر میری عِترت میرے اہلِ بیت ہیں۔ خُدائے لطیف و خَبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ وہ دونوں ختم نہیں ہوں گے جب تک میرے پاس حوض پر نہ آجائیں۔[1]

اسی طرح امام احمد بن حنبل نے بَراء بن عازِب سے دو طریقوں سے یہ روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ تھے۔جب ہم غدیر پر اُترے تو

---

[1] یہ روایت ابنِ حَجَر نے صَوَاعِقِ مُحرِقہ میں طبرانی اور ترمذی سے نقل کی ہے۔

مُؤذّنِ رسولؐ نے پکار کر کہا: اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃ۔ رسول اللہؐ کے لیے درختوں کے نیچے جگہ صاف کر دی گئی۔ آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی پھر علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ میرا مُومنین پر خُود اُن سے زیادہ حق ہے۔ سب نے کہا: جی ہاں معلوم ہے۔ آپ نے دوبارہ دریافت کیا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ میرا ہر مُومن پر خود اس سے زیادہ حق ہے۔ سب نے اقرار کیا تب آپ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَّوْلَاہُ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ۔

جس کا میں مولا ہوں، علیؑ بھی اُس کے مولا ہیں۔ اے اللہ! جو اُن سے دوستی رکھے تو بھی اُس سے دوستی رکھ اور جو اُن سے دشمنی رکھے تو بھی اُن سے دشمنی رکھ۔

اس کے بعد عُمر جب علیؑ سے ملے تو بولے: ابنِ ابی طالب مُبارک ہو تم ہر مُومن اور مُومنہ کے مولا بن گئے[2]

خلاصہ یہ کہ جن مُحدّثین کا ہم نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ اور بھی سربرآوردہ علمائے اہلِ سُنّت نے حدیثِ غدیر کی روایت اپنی کتابوں میں بیان کی ہے، جیسے ترمذی، ابن ماجہ، ابن عساکر، ابن صبّاغ مالکی، ابنِ اثیر، ابن مغازلی، ابن حجر، ابونعیم، سیوطی، خوارزمی، ہیثمی، سلیمان قندوزی، حموینی، حاکم حسکانی اور امام غزالی۔ امام بُخاری نے یہ روایت اپنی تاریخ میں بیان کی ہے۔

مختلف مسلک و مذاہب کے پہلی صدی سے چودھویں صدی ہجری تک کے ان عُلماء کی تعداد جنھوں نے اپنی کتابوں میں یہ روایت بیان کی ہے تین سو ساٹھ سے

---

[1] جب کبھی رسول اللہؐ صحابہ کرام کو کوئی اہم حکم دینا چاہتے تھے تو انھیں نماز جماعت میں شمولیت کی دعوت دیتے تھے۔ اس نماز میں حاضر ہونا ان کے لیے نماز جمعہ کی طرح فرض ہوتا تھا۔ اس اجتماعی نماز کے لیے منادی الصلاۃ جامعہ پکارتا تھا۔ نیز نماز استسقاء اور نماز آیات وغیرہ میں بھی اسی شعار سے لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ (ناشر)

[2] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۸۱۔ کنز العمال جلد ۱۵ صفحہ ۱۱۷۔ فضائل الخمسۃ من الصحاح الستۃ جلد ۱ صفحہ ۳۵۰۔

سے اوپر ہے۔ جو شخص مزید تحقیق کرنا چاہے وہ علامہ امینی کی کتاب **الغدیر** کا مُطالعہ کرے[1]

کیا اس پر بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ "حدیثِ غدیر" شیعوں کی گھڑی ہوئی ہے؟

عجیب و غریب بات یہ ہے کہ جب حدیثِ غدیر کا ذکر کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نے اس کا نام بھی نہیں سُنا۔

اِس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اِس حدیث کے بعد بھی جس کی صحّت پر سب کا اتفاق ہے عُلمائے اہلِ سُنّت یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا اور مُعاملہ شوریٰ پر چھوڑ دیا تھا۔

اللہ کے بندو! کیا خلافت سے متعلق اِس سے بھی زیادہ صاف اور صریح کوئی حدیث ہو سکتی ہے؟

یہاں میں اپنی اس بحث کا ذکر کروں گا جو ایک دفعہ تیونس کی جامعۂ زیتونہ کے ایک عالِم سے ہوئی تھی۔ جب میں نے اُن صاحب سے خلافتِ علیؑ کے ثبوت میں حدیثِ غدیر کا ذکر کیا تو انھوں نے اس حدیث کے صحیح ہونے کا تو اعتراف کیا لیکن ایک پیوند لگا دیا۔ انھوں نے مجھے اپنی لکھی ہوئی قرآن کی تفسیر دکھائی، جس میں "حدیثِ غدیر" کا ذکر تھا اور اس کو صحیح بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے لکھا تھا:

> شیعوں کا خیال ہے کہ یہ حدیث سیّدنا علی کرّمَ اللہ وجہہٗ کی خلافت پر نص ہے لیکن اہلِ سُنّت والجماعت کے نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ یہ دعویٰ سیّدنا ابوبکر صدّیق، سیّدنا عُمر فاروق اور سیّدنا عثمان ذُوالنُّورَین کی خلافت کے منافی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حدیث میں جو لفظ مولیٰ آیا ہے اس کے معنیٰ مُحِبّ و مددگار

---

[1] علامہ امینی کی کتاب الغدیر گیارہ جلدوں میں ہے۔ یہ بڑی نفیس کتاب ہے۔ اِس میں مُصنّف نے برسوں تحقیق کے بعد غدیر سے متعلق سب مواد اہلِ سُنّت کی کتابوں سے جمع کیا ہے۔

کے لیے جائیں، جیساکہ یہ لفظ ان معنوں میں قرآنِ کریم میں بھی
آیا ہے۔ خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے
بھی اس لفظ کے یہی معنیٰ سمجھے ہیں۔ تابعین اور مسلمان علماء نے
ان سے یہی معنیٰ سیکھے ہیں، اس لیے روافض جو اس حدیث کی تاویل
کرتے ہیں اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ خلفاء کی خلافت
کو تسلیم نہیں کرتے اور صحابۂ رسول پر لعن طعن کرتے ہیں۔ صرف
یہی بات ان کے جھوٹے اور غلط دعوؤں کے بطلان کے لیے کافی ہے۔

میں نے ان عالم سے پوچھا: یہ بتلائیے کہ کیا واقعی یہ قصۂ غدیرِ خم میں پیش
آیا تھا؟

اُنھوں نے جواب دیا: اگر پیش نہ آتا تو علماء اور محدثین اسے کیوں بیان
کرتے۔

میں نے کہا: کیا یہ بات رسول اللہؐ کے شایانِ شان ہے کہ وہ جلتی ہوئی دھوپ
میں اپنے اصحاب کو جمع کر کے ایک طویل خطبہ صرف یہ کہنے کے لیے دیں کہ علیؑ تمھارا
مُحِبّ و ناصِر ہے۔ یہ تشریح آپ کی سمجھ میں آتی ہے؟

کہنے لگے کہ بعض صحابہ نے علیؑ کی شکایت کی تھی، ان میں بعض لوگ ایسے
بھی تھے جو علیؑ سے بُغض اور اختلاف رکھتے تھے۔ رسول اللہؐ نے اس بُغض کے ازالے
کے لیے فرمایا: علیؑ تو تمھارا مُحِبّ و ناصِر ہے۔ مطلب یہ تھا کہ علیؑ سے محبّت رکھو،
بُغض و عِناد نہ رکھو۔

میں نے کہا: اتنی سی بات کے لیے سب کو روکنے، ان کے ساتھ نماز پڑھنے
اور خُطبے کو ان الفاظ سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ "کیا میرا تم پر تم سے زیادہ
حق نہیں؟" یہ آپ نے مولا کے معنیٰ کی وضاحت کے لیے ہی تو کہا تھا۔ اگر جو آپ
کہتے ہیں وہی صحیح ہے تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جن لوگوں کو علیؑ سے شکایت تھی آپ ان
کو بُلا کر کہہ دیتے کہ علیؑ تو تمھارا دوست اور مددگار ہے۔ بات ختم ہو جاتی۔ ایک لاکھ
سے زیادہ مجمع کو دھوپ میں روکنے کی جس میں بُڈھے اور عورتیں بھی شامل تھیں، کیا
ضرورت تھی؟ کوئی ہوشمند تو یہ بات کبھی مان نہیں سکتا!

کہنے لگے : تو کیا کوئی ہوشمند یہ مان سکتا ہے کہ جو بات تم اور شیعہ سمجھ گئے وہ ایک لاکھ صحابہ نہ سمجھ سکے؟

میں نے کہا : پہلی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے صرف تھوڑے سے لوگ تھے جو مدینہ منوّرہ میں رہتے تھے۔ دوسرے، وہ بھی بالکل وہی سمجھے جو میں اور شیعہ سمجھے ہیں۔ جب ہی تو علماء راوی ہیں کہ ابُوبکر اور عُمر یہ کہہ کر علیؑ کو تبریک پیش کر رہے تھے کہ مُبارک ہو ابنِ ابی طالب! اب تم ہر مُومن اور مُومنہ کے مولا ہو گئے ہو!

کہنے لگے : پھر رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انھوں نے علیؑ کی بیعت کیوں نہیں کی؟ کیا وہ نعوذُ باللہ رسول اللہؐ کے حکم کی مخالفت اور حکم عدولی کر رہے تھے۔

میں نے کہا : عُلمائے اہلِ سُنّت اپنی کتابوں میں خُود تسلیم کرتے ہیں کہ بعض صحابہ تو خود آپ کی زندگی اور آپ کی موجودگی ہی میں آپ کے احکام کی مخالفت کیا کرتے تھے تو اس میں تعجّب کی کیا بات ہے اگر انھوں نے آپ کی وفات کے بعد آپ کے احکام پر عمل نہیں کیا۔ پھر جب صحابہ کی اکثریت اُسامہ بن زید کو امیر لشکر بنائے جانے پر ان کی کم عمری کی وجہ سے معترض تھی حالانکہ وہ محض محدود نوعیت کی قلیلُ المدّت مُہم تھی تو وہ علیؑ کا نوعمری کے باوجود مُدّتُ العمر کے لیے خلیفہ اور حُکمراں بنایا جانا کیسے قبول کر سکتے تھے؟ آپ خود کہہ رہے ہیں کہ بعض صحابہ علیؑ سے بُغض اور کینہ رکھتے تھے۔

گھبرا کر کہنے لگے : اگر علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجہَہٗ و رَضِیَ اللّٰہُ عَنہٗ کو معلوم ہوتا کہ رسول اللہؐ نے انھیں خلیفہ نامزد کیا ہے، تو وہ کبھی اپنا حق نہیں چھوڑ سکتے تھے اور نہ خاموشی اختیار کر سکتے تھے۔ وہ تو اتنے دلیر اور بہادر تھے کہ سب صحابہ ان سے ڈرتے تھے مگر وہ کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے۔

میں نے کہا : حضرت! یہ ایک الگ موضوع ہے، میں اس میں اُلجھنا نہیں چاہتا کیونکہ آپ صحیح احادیثِ نبوی ہی کو نہیں مانتے بلکہ ناموسِ صحابہ کے تحفّظ کے لیے ان کی تاویل کرتے اور ان کے کچھ کے کچھ معنیٰ بیان کرتے ہیں۔ میں ایسے میں کیسے آپ کو یقین دلا سکوں گا کہ امام علیؑ نے کیوں خاموشی اختیار کی اور خلافت پر اپنے حق کے لیے احتجاج نہیں کیا۔

وہ صاحب مُسکرائے اور کہا : میں تو خود سیّدنا علیؑ کو سب سے افضل سمجھتا ہوں اور اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں صحابہ میں سے کسی کو بھی ان پر ترجیح نہ دیتا،

کیونکہ وہ شہرِ علم کا دروازہ تھے، شیرِ خدا تھے لیکن اللہ سُبحانہٗ کی مشیت جس کو چاہتی ہے، آگے بڑھاتی ہے اور جس کو چاہتی ہے پیچھے ہٹاتی ہے۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ۔ (اللہ سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ کیا کرتا ہے ہاں اللہ سب سے جواب طلب کر سکتا ہے)۔

اب مُسکرانے کی میری باری تھی۔ میں نے کہا: یہ بھی ایک دوسرا موضوع ہے، اگر اس پر گفتگو شروع ہوئی تو تقدیر کی بحث چھڑ جائیگی جس پر ہم پہلے بات چیت کر چکے ہیں — اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں اپنی اپنی رائے پر قائم رہے۔

جنابِ والا! مجھے تعجّب اِس پر ہے کہ جب بھی میری گفتگو کسی سُنّی عالم سے ہوتی ہے اور میں اسے لاجواب کر دیتا ہوں، وہ فوراً ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہے اور اصل بات بیچ میں ہی رہ جاتی ہے۔

وہ صاحب بولے: میں تو اپنی رائے پر قائم ہوں، میں نے تو بات نہیں بدلی۔ بہر حال میں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا اور دیر تک سوچتا رہا کہ کیا وجہ ہے کہ مجھے اپنے عُلماء میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ملتا جو اس مٹر گشت میں آخر تک میرا ساتھ دے اور ہمارے یہاں کے محاورے کے مطابق دروازے کو اس کی ٹانگ پر کھڑا رکھے۔

بعض سُنّی بات تو شروع کرتے ہیں لیکن جب اپنے اقوال کی دلیل پیش نہیں کر سکتے تو یہ کہہ کر بچ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں کہ

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ۔

وہ لوگ تھے جو گزر گئے۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ، تمھارے اعمال تمھارے ساتھ۔

بعض لوگ کہتے ہیں: ہمیں گڑے مُردے اُکھیڑنے اور جھگڑے کھڑے کرنے سے کیا؟ اہم بات یہ ہے کہ شیعہ اور سُنّی دونوں ایک خُدا کو مانتے ہیں، ایک رسُول کو مانتے ہیں، اتنا ہی کافی ہے۔

بعض تو مختصر بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: صحابہ کے مُعاملے میں خُدا سے

ڈرو۔" اب ایسے لوگوں کے ساتھ کسی علمی بحث کی گنجائش کہاں۔ اور رجوع الی الحق کی کیا صورت۔ حق سے ہٹ کر تو گمراہی ہی ہے۔ ان لوگوں کو اس قرآنی اسلوب کی کیا خبر، جس میں دلیل پیش کرنے کو کہا گیا ہے۔ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ)۔

اکمالِ دین کی آیت کا تعلّق بھی خلافت سے ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا.

شیعوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت امام علیؑ کے خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے تقرر کے بعد غدیرِ خُم کے مقام پر نازل ہوئی۔ یہ روایت ائمۂ اہلِ بیت کی ہے۔ اور اسی بنا پر شیعہ امامت کو اصولِ دین میں شمار کرتے ہیں۔

جن سُنّی علماء نے یہ روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت غدیرِ خُم میں امام علیؑ کے تقرر کے بعد نازل ہوئی، ان کی تعداد تو بہت ہے۔ ہم مثال کے طور پر چند ناموں کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) ابن مغازلی شافعی مناقب علی بن ابی طالبؑ صفحہ ۱۹۔ متوفّی ۴۸۳ھ
(۲) خطیب بغدادی تاریخ بغداد جلد ۸ صفحہ ۲۹۰۔ متوفّی ۴۶۳ھ
(۳) ابن عساکر تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۷۵
(۴) حافظ سیوطی تفسیر الاتقان جلد ۱ صفحہ ۱۳
(۵) حافظ سیوطی تفسیر الدر المنثور جلد ۳ صفحہ ۱۹
(۶) خوارزمی حنفی مناقب امیر المومنین صفحہ ۸۰ متوفی ۵۶۸ھ
(۷) سبط ابن جوزی تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۰ متوفی ۶۵۴ھ
(۸) حافظ ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم جلد ۲ صفحہ ۱۴ متوفی ۷۷۴ھ
(۹) حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۲۱۳
(۱۰) آلوسی تفسیر روح المعانی جلد ۶ صفحہ ۵۵

(۱۱) حافظ قندوزی حنفی ینابیع المودّۃ صفحہ ۱۱۵

(۱۲) حافظ حسکانی حنفی تفسیر شواہد التنزیل جلد اصفحہ ۱۵۷ متوفی ۴۹۰ھ

اِس سب کے باوجود علمائے اہلِ سُنّت نے "عظمتِ صحابہ" کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا ہے کہ اس آیت کا نزول کسی اور موقع پر دکھایا جائے۔ کیونکہ اگر علمائے اہلِ سُنّت یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ آیت غدیرِ خُم میں نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے ضمنی طور پر اس کا بھی اعتراف کر لیا کہ علی بن ابی طالبؑ کی ولایت ہی وہ چیز تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کیا اور مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام کی۔ اعتراف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت علیؑ سے پہلے تین خلفاء کی خلافت ہوا بن کر اڑ جائے گی، صحابہ کی عدالت کی بنیاد ہل جائے گی۔ دبستانِ خلافت منہدم ہو جائیگا اور بہت سی احادیث اس طرح پگھل جائیں گی جیسے پانی نمک میں گھل جاتا ہے۔ اصحابِ مذاہب غبار بن کر اُڑ جائیں گے، بہت سے راز اِفشا ہوں گے اور عیب کھل جائیں گے۔ لیکن یہ ہونا ناممکن ہے کیونکہ مُعاملہ ایک بہت بڑے گروہ کے عقیدے کا ہے جس کی اپنی تاریخ ہے، اپنے عُلماء ہیں اور اپنے سربرآوردہ حضرات ہیں اِس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ بُخاری و مُسلم جیسے لوگوں کی تکذیب کریں جن کی روایت کے مطابق یہ آیت عَرَفہ کی شام کو جُمعہ کے دن نازل ہوئی۔

اس طرح پہلی روایات محض شیعوں کی خُرافات بن جاتی ہیں جن کی کوئی بُنیاد نہیں اور شیعوں کو مطعون کرنا صحابہ کو مطعون کرنے سے بہتر بن جاتا ہے، کیونکہ صحابہ تو معصوم عَنِ الخطَا ہیں [۱] اور کسی کو یہ حق نہیں کہ ان کے افعال و اقوال پر نکتہ چینی کرے۔ رہے شیعہ! وہ تو مجُوسی ہیں، کافر ہیں، زِندیق ہیں، مُلحد ہیں، ان کے مذہب کا بانی عبداللہ بن سَبا ہے [۲] جو یہودی تھا اور اسلام اور مسلمانوں

---

[۱] اہلِ سُنّت کا عقیدہ ہے کہ صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، جس کی بھی اِقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

[۲] عبداللہ بن سَبا کا کوئی وُجود نہیں۔ دیکھیے کتاب عبداللہ بن سَبا مؤلفہ علامہ مرتضیٰ عسکری، کتاب الفتنۃ الکبریٰ مؤلفہ طٰہٰ حسین اور کتاب الصلۃ بین التصوف والتشیع مؤلفہ ڈاکٹر مُصطفیٰ کامل شیبی۔ آخر الذکر کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن سَبا سیّدنا عمّار بن یاسر کو کہا گیا ہے، دل چاہے تو کتاب کا مُطالعہ کیجیے!

کے خلاف سازش کے مقصد سے حضرت عثمان کے عہد میں مسلمان ہوگیا تھا۔ اس طرح کی باتیں کر کے ان لوگوں کو دھوکا دینا بہت آسان ہے جن کی بچپن سے تربیت ہی "تقدسِ صحابہ" کے ماحول میں ہوئی ہو۔ (خواہ کسی صحابی نے رسول اللہؐ کو صرف ایک دفعہ ہی دیکھا ہو)۔

ہم کیسے لوگوں کو یقین دلائیں کہ شیعہ روایات محض شیعوں کی خرافات نہیں، بلکہ ان ائمۂ اثناعشر کی احادیث ہیں جن کی امامت نصِّ رسولؐ سے ثابت ہے۔

بات یہ ہے کہ قرنِ اول کی حکومتوں نے امام علیؑ اور ان کی اولاد کے خلاف اُمّت میں نفرت پھیلائی، یہاں تک کہ اُن پر منبروں سے لعنت کی گئی اور "شیعانِ علیؑ" کو قتل کیا گیا اور ان کو گھروں سے نکال دیا گیا۔ شیعوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے ڈس انفارمیشن سیل قائم کیا گیا اور طرح طرح کی افواہیں پھیلائی گئیں۔ شیعوں سے بے بُنیاد قصے اور غلط عقائد منسوب کیے گئے۔ آج کل کی اصطلاح میں اس وقت شیعہ "حزبِ مُخالف" تھے، اس لیے اس وقت کی حکومتیں شیعوں کو ختم کرنے اور الگ تھلگ کرنے میں کوشاں تھیں۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کے مصنّفین اور مؤرخین بھی شیعوں کو رافضی کہتے ہیں، ان کی تکفیر کرتے ہیں اور حکمرانوں کو خُوش کرنے کے لیے شیعوں کا خُون کرنا حلال قرار دیتے ہیں۔

جب اُموی حکومت ختم ہوگئی اور عبّاسی حکومت برسراقتدار آئی تو بعض مؤرخین اپنی ڈگر پر چلتے رہے جبکہ بعض نے اہلِ بیت کی حقیقت کو پہچانا[1] اور انصاف کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علیؑ کا شمار بھی "خُلفائے راشدین" میں کرلیا گیا لیکن کسی کو یہ اعلان کرنے کی جُرأت نہیں ہوئی کہ خلافت پر سب سے زیادہ حق علیؑ کا تھا۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ سُنّت کی صحاح میں بہت ہی کم فضائلِ علیؑ

---

[1] وجہ یہ ہے کہ ائمۂ اہلبیت نے اپنے اخلاق، اپنے علوم، اپنے زہد و تقویٰ اور اپنی ان کرامات سے جو اللہ نے ان کو عطا کی تھیں، اپنے آپ کو منوالیا تھا۔

کی روایات آئی ہیں اور جو آئی ہیں وہ بھی صرف وہی ہیں جو علیؑ سے پہلے کے خلفاء کی خلافت سے کسی طرح متصادم نہیں ہیں۔ بعض نے تو کثیر تعداد میں ایسی روایات وضع کی ہیں جن میں خود علیؑ کی زبان سے ابُوبکر، عمُر، اور عثمان کے فضائل بیان کیے گئے ہیں مقصد یہ کہ بزعم خویش کوشش یہ کی گئی ہے کہ شیعوں کا راستہ بند کر دیا جائے جو علیؑ کی افضلیت کے قائل ہیں۔

اپنی تحقیق کے دوران مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ لوگوں کی شہرت اور عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا تھا کہ وہ علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ کس قدر بُغض رکھتے ہیں۔ اُمویوں اور عبّاسیوں کی سرکار میں وہی مُقرَّب تھے اور ان ہی کو بڑھایا جاتا تھا جنھوں نے امام علیؑ کے خلاف یا تو جنگ کی تھی یا تلوار یا زبان سے ان کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ بعض صحابہ کا درجہ بڑھایا جاتا تھا، بعض کا گھٹایا جاتا تھا۔ بعض شعراء پر انعام واکرام کی بارش ہوتی تھی اور بعض کو قتل کرا دیا جاتا تھا۔ شاید اُمُّ المومنین عائشہ کی بھی یہ قدر ومنزلت نہ ہوتی اگر انھیں علیؑ سے بُغض نہ ہوتا اور انھوں نے علیؑ کے خلاف "جنگِ جمَل" نہ لڑی ہوتی۔

اِسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ عبّاسیوں نے بُخاری، مُسلم اور امام مالک کو شہرت دی کیونکہ انھوں نے اپنی کتابوں میں فضائلِ علیؑ کی احادیث بہت کم نقل کی ہیں بلکہ ان کتابوں میں تو یہ تصریح بھی ہے کہ علی بن ابی طالبؑ کو کوئی فضیلت اور فوقیت حاصل ہی نہیں تھی۔ بُخاری نے تو اپنی صحیح میں ابن عمر سے روایت نقل کی ہے کہ: رسول اللہؐ کے زمانے میں ہم ابُوبکر کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے، پھر عمُر کا درجہ تھا پھر عُثمان کا، پھر باقی صحابہ میں ہم کسی کو دُوسروں پر فوقیت نہیں دیتے تھے[1] گویا بُخاری

---

[1] صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۹۱ اور صفحہ ۲۰۱ - باب مناقبِ عُثمان۔

بخاری نے جلد ۴ صفحہ ۱۹۵ پر حضرت علیؑ کے فرزند محمد بن حَنَفیہ سے ایک روایت منسوب کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول اللہؐ کے بعد سب سے بہترین شخص کون ہے، انھوں نے کہا: ابوبکر۔ میں نے پوچھا: ان کے بعد؟ کہا: عمُر۔ میں ڈرا کہ کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ ان کے بعد عُثمان۔ اس لیے میں نے کہا: اُن کے بعد آپ؟ کہا: میں تو فقط ایک مُسلمان ہوں۔

کے نزدیک علیؑ بھی دُوسرے عام لوگوں کے برابر تھے۔ (پڑھیے اور سر دُھنیے!)
اِسی طرح امتِ مسلمہ میں اور بھی فرقے ہیں جیسے مُعتزلہ اور خوارج وغیرہ۔ یہ بھی وہ نہیں کہتے جو شیعہ کہتے ہیں۔ کیونکہ علیؑ اور اولادِ علیؑ کی امامت کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے خلافت تک پہنچنے، عوام کی گردنوں پر سوار ہونے اور اُن کی قسمت اور املاک سے کھیلنے کا راستہ مسدود ہوگیا تھا۔ بنی اُمیّہ اور بنی عبّاس نے عہدِ صحابہ و تابعین میں کیا گُل نہیں کھلائے اور آج تک حکمراں کیا نہیں کرتے آرہے ہیں؟ اسی لیے حکمرانوں کو خواہ وہ وراثت کے ذریعے اقتدار تک پہنچے ہوں جیسے بادشاہ، خواہ وہ صُدور ہوں جنھیں ان کی قوم نے منتخب کیا ہو، انھیں خلافتِ اہل بیت کا عقیدہ ایک آنکھ نہیں بھاتا اور وہ اسے THEOCRACY یا مُلاّؤں کی حکومت کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں جس کا شیعوں کے علاوہ کوئی قائل نہیں۔ اس پر مُستزاد یہ کہ شیعہ اپنی حماقت سے مہدیِٔ منتظر کی امامت کے بھی قائل ہیں، جو عنقریب زمین کو عدل وانصاف سے اسی طرح بھر دیں گے جیسے وہ ظُلم وجَور سے بھری ہوئی ہے۔
اب ہم دوبارہ سُکون اور غیر جانبداری کے ساتھ فریقین کے اقوال پر غور کرتے ہیں تاکہ یہ تصفیہ ہوسکے کہ آیتِ اکمال کس موقع پر نازل ہوئی تھی اور اس کی شانِ نزُول کیا ہے تاکہ حق واضح ہوجائے اور ہم اس کی پروا کیے بغیر کہ کون خوش ہوتا ہے اور کون ناراض، حق کا اتباع کرسکیں۔ اصل اور سب سے ضروری بات رضائے الٰہی کا حصول ہے تاکہ اس کے عذاب سے اس دن بچ سکیں جب نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔ کام آئے گا تو قلبِ سلیم۔

یہ دعویٰ کہ آیتِ اکمال عرفہ کے دن نازل ہوئی

صحیح بُخاری میں طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ کچھ یہودی کہتے تھے کہ اگر یہ آیت ہماری قوم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو اپنی عید بنا لیتے۔ عُمر نے پُوچھا کون سی آیت؟ ان لوگوں نے کہا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ[1]

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۵ صفحہ ۱۲۷۔

عُمر نے کہا: میں خوب جانتا ہوں کہ یہ آیت کہاں نازل ہوئی تھی - یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب رسول اللہؐ عرفہ کے دن وُقوف فرما رہے تھے۔"

ابن جریر نے عیسیٰ بن حارثہ انصاری سے روایت کی ہے کہ ہم دیوان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عیسائی نے ہم سے کہا: مُسلمانو! تم پر ایک ایسی آیت نازل ہوئی ہے کہ اگر ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن اور اس ساعت کو عید بنا لیتے اور جب تک کوئی دو عیسائی بھی باقی رہتے ہمیشہ عید منایا کرتے - یہ آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ہے - ہم میں سے کسی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا بعد میں جب میں محمد بن کعب قرظی سے ملا تو ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا انھوں نے کہا: کیا تم نے اس عیسائی کی بات کا جواب نہیں دیا؟ پھر اسی سلسلے میں کہا کہ عُمر بن خطاب کہتے تھے کہ جب یہ آیت رسول اللہؐ پر اُتری وہ عرفہ کے دن جبلِ عرفات پر کھڑے ہوئے تھے - یہ دن تو مسلمانوں کی عید رہیگا ہی جب تک کوئی ایک بھی مسلمان باقی ہے[1]

راوی کہتا ہے کہ "ہم میں سے کسی نے اُسے کچھ جواب نہیں دیا"۔ اِس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ نہ کسی کو وہ تاریخ یاد تھی کہ جس تاریخ کو یہ آیت اُتری اور نہ اس دن کی عظمت سے واقف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راوی کو خود بھی اس پر حیرت ہوئی تھی کہ کیا بات ہے کہ مسلمان ایسے اہم دن کو نہیں مناتے۔ اِسی لیے وہ جا کر محمّد بن کعب قرظی سے ملتا ہے اور ان سے دریافت کرتا ہے۔ محمّد بن کعب قرظی اسے بتلاتے ہیں کہ عُمر بن خطّاب کہتے تھے کہ "یہ آیت اس وقت اُتری جب عرفہ کے دن رسول اللہؐ جَبلِ عرفات پر کھڑے ہوتے تھے۔" تو اگر وہ دن بطورِ عید کے مسلمانوں میں معروف ہوتا تو یہ راوی حضرات خواہ وہ صحابہ میں سے تھے یا تابعین میں سے اس سے ناواقف کیوں ہوتے۔ ان کے نزدیک مسلّم اور مشہور بات یہی تھی کہ مسلمانوں کی عیدیں دو ہیں: ایک عیدُالفطر اور دُوسری عیدالاضحیٰ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بُخاری و مُسلم جیسے عُلماء اور محدّثین نے بھی اپنی کتابوں میں

---

[1] سُیوطی، دُرِّ منثور جلد ۳ صفحہ ۱۸

کِتابُ العِیدَین ، صَلاۃُ العِیدَین اور خُطبَۃُ العِیدَین وغیرہ کے عُنوان باندھے ہیں۔ خاص وعام سب کے نزدیک مُسلّمہ امر یہی ہے کہ تیسری عید کا وُجود نہیں۔ اِس لیے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یوم عَرَفہ ان کے نزدیک عید نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان روایات سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مُسلمانوں کو اس کا عِلم نہیں تھا کہ یہ آیت کب نازل ہوئی اور وہ اس دن کو نہیں مناتے تھے اس لیے ایک دفعہ یہودیوں کو اور دُوسری دفعہ عیسائیوں کو یہ خیال آیا کہ وہ مسلمانوں سے کہیں کہ اگر یہ آیت ہمارے یہاں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو عید قرار دیتے۔ اس پر عُمر بن خطّاب نے پوچھا کہ کونسی آیت؟ جب ان کو بتایا گیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ والی آیت، تو انھوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ آیت کہاں نازل ہوئی، جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ عرفہ کے دن میدانِ عرفات میں تھے۔

ہمیں اِس روایت میں مُغالَطَہ دینے کی بُو آتی ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے امام بُخاری کے زمانے میں عُمر بن خطّاب کی زبانی یہ روایت وضع کی وہ یہود و نصاریٰ کی اِس رائے کے درمیان کہ ایسے عظیم دن کو عید کی طرح منانا چاہیے اور اپنے اس عمل کے درمیان کہ انھیں اس آیت کے نزُول کی تاریخ بھی معلوم نہیں تھی، ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے یہاں دو ہی عیدیں تھیں: پہلی عید الفطر جو ماہ رمضان کے اختتام پر یکم شوال کو ہوتی ہے اور دُوسری عید الاضحیٰ جو دہم ذُوالحجہ کو ہوتی ہے۔

یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ حجّاجِ بَیْتُ اللہِ الحرام اس وقت تک اِحرام نہیں کھولتے جب تک جَمرۂ عقبہ کی رَمی، قربانی اور سر منڈانے کے بعد طوافِ اِفاضہ نہ کرلیں۔ اور یہ سب کام دس ذی الحجہ کو ہوتے ہیں۔ دس تاریخ ہی کو وہ عید کی ایک دُوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں۔ حج میں اِحرام ایسا ہی ہے جیسے رَمضان، جس میں روزہ دار پر متعدد چیزیں حرام ہوجاتی ہیں اور وہ چیزیں عید الفطر ہی سے حلال ہوتی ہیں۔ اسی طرح حج میں مُحرِم دس ذی الحجہ کو طوافِ اِفاضَہ کے بعد ہی اِحرام کھولتا ہے اور اس سے پہلے اس کے لیے جماع، خُوشبو، زینت، سِلے ہُوئے کپڑے، شکار اور ناخن اور بال کاٹنے میں سے کوئی چیز حلال نہیں ہوتی۔

اِس سے معلوم ہوا کہ یوم عَرَفہ جو ذی الحجہ کی نویں تاریخ ہے، عید کا دن نہیں

ہے۔ عید کا دن دسویں ذی الحجہ ہے اور اسی دن مسلمان ساری دُنیا میں عید مناتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول کہ آیتِ اِکمال عَرَفہ کے دن نازل ہوئی تھی ناقابلِ فہم اور ناقابلِ تسلیم ہے۔

ظنِّ غالب یہ ہے کہ جو لوگ خلافت میں شوریٰ کے اُصول کے بانی اور اس نظریہ کے قائل تھے، انھوں نے ہی اس آیت کے نزول کی تاریخ بھی بدل دی جو دراصل غدیرِ خُم میں امام علیؑ کی ولایت کے اعلان کے فوراً بعد تھی، اس تاریخ کو یومِ عَرَفہ سے بدل دینا زیادہ آسان تھا، کیونکہ غدیر کے دن بھی ایک لاکھ یا اس سے کچھ اُوپر حاجی ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔

یومِ عَرَفہ اور یومِ غدیر میں ایک خاص مُناسبت ہے کیونکہ حَجّۃُ الوَداع کے زمانے میں ان ہی دو موقعوں پر اتنے حاجی ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ایّامِ حج میں حاجی متفرق طور پر اِدھر اُدھر رہتے ہیں، صرف عرفہ ہی کا دن ایسا ہوتا ہے کہ جب حاجی ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ یہ آیت عرفہ کے دن نازل ہوئی وہ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہؐ کے اس مشہور خطبے کے فوراً بعد نازل ہوئی جسے محدثین نے خطبۂ حَجّۃُ الوَداع کے عنوان سے نقل کیا ہے۔

یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اس آیت کے نُزول کی تاریخ خود عُمر ہی نے یومِ عرفہ قرار دی ہو کیونکہ خلافتِ علیؑ کے سب سے بڑے مُخالف وہی تھے اور انھوں نے ہی سقیفہ میں ابُوبکر کی بیعت کی بنیاد قائم کی تھی۔

اِس خیال کی صحّت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن جریر نے قُبَیصَہ بن ابی ذوَیب سے روایت کی ہے۔ قبیصہ کہتے ہیں کہ کعب نے کہا تھا کہ اگر یہ آیت کسی اور اُمّت پر نازل ہوئی ہوتی تو وہ اس دن کو جب یہ نازل ہوئی تھی یاد رکھتے اور عید قرار دے لیتے اور اس دن سب جمع ہوا کرتے۔ عُمر نے سنا تو کعب سے پوچھا: کون سی آیت؟ کعب نے کہا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ عُمر نے کہا: مجھے معلوم ہے، یہ آیت کب نازل ہوئی تھی اور وہ جگہ بھی معلوم ہے جہاں یہ نازل ہوئی تھی۔ یہ جُمعہ کے دن نازل ہوئی تھی اور اس دن عَرَفہ تھا۔ یہ

دونوں دن اللہ کے فضل سے ہمارے لیے عید ہیں۔[1]

دُوسری بات یہ ہے کہ یہ کہنا کہ آیۂ اِکمال عرفہ کے دن نازل ہوئی، آیۂ تبلیغ یَاۤ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ کے منافی ہے۔ آیۂ تبلیغ میں رسول اللہؐ کو ایک ایسا اہم پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا جس کے بغیر کارِ رسالت مکمل نہیں ہو سکتا۔ اِس آیت کے بارے میں بحث گزر چکی اور بتایا جا چکا کہ یہ آیت حَجَّۃُ الوداع کے بعد مکّے اور مدینے کے درمیان راستے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ روایت ایک سو بیس سے زیادہ صحابہ اور تین سو ساٹھ سے زیادہ عُلمائے اہلِ سُنّت نے بیان کی ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل اور نعمت کو تمام تو کر دیا ہو بروز عَرَفہ اور پھر ایک ہفتے کے بعد اپنے نبی کو جب وہ مدینے جا رہے تھے کسی ایسی اہم بات کو پہنچا دینے کا حکم دیا ہو جس کے بغیر رسالت ناتمام رہتی ہو۔ اے اربابِ عقل و دانش ذرا سوچو یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے!

تیسری بات یہ ہے، اگر کوئی جُویائے تحقیق اس خُطبے کو جو رسول اللہؐ نے عَرَفہ کے دن دیا، غور سے دیکھے گا تو اسے اس خُطبے میں کوئی نئی چیز نہیں ملے گی، جس سے مُسلمان اس سے پیشتر ناواقف تھے اور جس کے متعلق خیال کیا جا سکے کہ اس سے اللہ نے دین کو کامل اور نعمت کو تمام کر دیا۔ اِس خُطبے میں وہی نصیحتیں ہیں جن کو قرآن کریم یا رسول اللہؐ مختلف موقعوں پر پہلے بھی بیان کر چکے تھے اور عرفہ کے دن ان پر مزید زور دیا گیا تھا۔ اِس خُطبے میں جو کچھ آیا ہے اور جسے راویوں نے محفوظ کیا ہے، وہ حسبِ ذیل ہے:

- اللہ نے تمھاری جانوں اور تمھارے اموال کو اسی طرح محترم قرار دیا ہے جیسا کہ اِس مہینے اور آج کے دن کو۔
- اللہ سے ڈرو! لوگوں کو اُن کے واجبات ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرو اور زمین میں ازراہِ شرارت فساد نہ پھیلاؤ۔ جس کے پاس کوئی امانت ہو، وہ صاحبِ امانت کو لوٹا دے۔

---

[1] سیوطی، تفسیر درِمنثور آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی تفسیر میں۔

- اسلام میں سب برابر ہیں - عربی کو عجمی پر، بجز تقویٰ کے کوئی فضیلت نہیں۔
- جاہلیّت میں جو خون ہوا اب وہ میرے پاؤں تلے اور جاہلیت کا جو سُود تھا وہ بھی میرے پاؤں تلے (یعنی زمانۂ جاہلیت میں جو خون ہوا اس کا انتقام نہیں لیا جائے گا اور جو قرض دیا گیا ہے اس پر سُود کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا)۔
- لوگو! لوند[1] کا رواج کُفر کو بڑھانا ہے۔ آج زمانہ پھر وہیں پہنچ گیا ہے جہاں سے چلا تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔
- اللہ کے نزدیک، اس کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے جن میں سے چار حرام ہیں۔
- میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ عورتوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے اور تم نے کتابُ اللہ کے حکم کے مطابق ان کی شرمگاہیں اپنے لیے حلال کی ہیں۔
- میں تمھیں تمھارے مملوک غلام، باندیوں کے بارے میں نصیحت کرتا ہوں، جو خُود کھاؤ اُسی میں سے ان کو کھلاؤ اور جو خُود پہنو اُسی میں سے ان کو پہناؤ۔
- مُسلمان، مُسلمان کا بھائی ہے۔ اسے دھوکا نہ دے، اس سے دغا نہ کرے، اس کی غیبت نہ کرے۔ کسی مُسلمان کا خُون اور اس کے مال میں سے کچھ بھی دُوسرے مسلمان کے لیے حلال نہیں۔
- آج کے بعد شیطان اِس سے نا اُمید ہوگیا ہے کہ اس کی پُوجا کی جائے گی، لیکن اپنے دوسرے مُعاملات میں جنھیں تم معمولی سمجھتے ہو اس کی بات

---

[1] خُدا کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہے - ان میں سے چار مہینوں: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرّم اور رجَب کو خدا نے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن جو قبیلے اِن حرام مہینوں میں جنگ کرنا چاہتے تھے، کعبہ کے متولّی ان سے پیسہ لے کر حرام مہینوں کو بدل دیتے تھے۔ وہ ان مہینوں کی جگہ دوسرے مہینوں کو حرام قرار دیدیتے تھے۔ (ناشر)

مانی جائے گی۔

- اللہ کا بدترین دشمن وہ ہے جو اس کو قتل کرے جس نے اسے قتل نہ کیا ہو اور اسے مارے جس نے اسے مارا نہ ہو۔ جس نے آقا کا کفران کیا اس نے گویا جو اللہ نے محمد پر اتارا ہے اس کو ماننے سے انکار کیا۔ جس نے اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی اور سے اپنے آپ کو منسوب کیا تو اس پر لعنت اللہ کی فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔
- مجھے لوگوں سے اس وقت تک قتال کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ نہ تسلیم کریں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر وہ یہ کہہ دیں تو میری طرف سے ان کی جان اور ان کا مال محفوظ ہوں گے سوائے اس کے کہ جو اللہ کے قانون کے مطابق ہو۔ اور ان کا فیصلہ اللہ پر ہے۔
- میرے بعد دوبارہ کافر اور گمراہ نہ ہو جانا۔ ایسا نہ ہو کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

یہ ہے وہ سب کچھ جو حجۃ الوداع کے موقع پر خطبۂ عرفہ میں کہا گیا تھا۔ میں نے اس کے مختلف ٹکڑے تمام قابلِ اعتماد مآخذ سے جمع کیے ہیں تاکہ کچھ چھوٹ نہ جائے۔ میں نے رسول اللہؐ کی وہ سب ہدایات جن کا محدثین نے ذکر کیا ہے جوں کی توں نقل کردی ہیں۔ اب دیکھیے! کیا ان میں صحابہ کے لیے کوئی نئی بات ہے؟۔ بالکل نہیں۔ کیونکہ جو کچھ اس خطبے میں ہے، وہ قرآن وسنت میں پہلے ہی مذکور ہے۔ رسول اللہؐ کی پوری عمر وحی کے مطابق ہر چھوٹی بڑی بات کی تعلیم لوگوں کو دیتے گزری تھی۔ ان ہدایات کے بعد جن کو مسلمان پہلے سے جانتے تھے، آیۂ اکمال الدین کے نزول کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ان ہدایات کا اعادہ تو محض تاکید کے لیے تھا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان اتنی بڑی تعداد میں رسول اللہؐ کی خدمت میں جمع ہوئے تھے۔ رسول اللہؐ نے حج کے لیے نکلنے سے پہلے ان کو بتلا دیا تھا کہ یہ حجۃ الوداع ہے۔ اس لیے آنحضرتؐ کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ یہ ہدایات سب مسلمانوں کو سنا دیں۔

لیکن اگر ہم دوسرے قول کو قبول کرلیں جس کے مطابق یہ آیت غدیرِ خُم کے

دن اس وقت نازل ہوئی جب امام علیؑ کو خلیفۂ رسول اور امیر المومنین مقرر کر دیا گیا تھا تو اس صورت میں معنیٰ بالکل صحیح ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کا فیصلہ کہ رسول اللہؐ کے بعد ان کا خلیفہ اور جانشین کون ہوگا، نہایت اہم معاملہ تھا اور یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یوں ہی چھوڑ دے۔ اور نہ یہ رسول اللہؐ کی شان کے مناسب تھا کہ وہ کسی کو اپنا خلیفہ مقرر کیے بغیر دنیا سے چلے جائیں اور اپنی امت کو بغیر کسی نگران کے چھوڑ جائیں جب کہ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی آپ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے، کسی صحابی کو اپنا جانشین مقرر کر کے جاتے تھے۔ پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ آپ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے اور آپ نے خلافت کے بارے میں کچھ نہیں سوچا؟

جب کہ ہمارے زمانے میں بے دین بھی اس قاعدے کو تسلیم کرتے ہیں اور سربراہِ مملکت کا جانشین اس کی زندگی ہی میں مقرر کر دیتے ہیں تاکہ حکومت کا انتظام چلتا رہے اور لوگ ایک دن بھی سربراہ کے بغیر نہ رہیں۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دین اسلام جو سب ادیان میں کامل ترین اور سب سے جامع ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام شریعتوں کو ختم کیا ہے اور جس سے زیادہ ترقی یافتہ، جس سے کامل تر، جس سے عظیم تر اور جس سے خوب تر کوئی دین نہیں ہے، اتنے اہم معاملے کی طرف توجہ نہ دے۔

ہم یہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عائشہ، ابن عمر اور ان سے پہلے خود ابوبکر اور عمر بھی یہ محسوس کر چکے تھے کہ فتنہ و فساد کو روکنے کے لیے خلیفہ کا تعین ضروری ہے۔ اسی مصلحت کی وجہ سے ان کے بعد آنے والے سب خلفاء بھی اپنا جانشین مقرر کرتے رہے۔ پھر یہ مصلحت اللہ اور اس کے رسولؐ سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی؟؟؟

اِسی کے مطابق یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو جب وہ حجۃ الوداع سے واپس آرہے تھے، آیۂ تبلیغ کے ذریعے وحی بھیجی تھی کہ علیؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیں
يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الخ

اس سے معلوم ہوا، دین کی تکمیل امامت یعنی وَلایت پر موقوف ہے جو

عقلاء کے نزدیک ایک ضروری چیز ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو لوگوں کی مخالفت یا تکذیب کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"جبرئیل نے مجھے میرے پروردگار کا یہ حکم پہنچایا ہے کہ میں اس مجمع میں کھڑے ہو کر ہر گورے اور کالے کے سامنے یہ اعلان کردوں کہ علی بن ابی طالبؑ میرے بھائی، میرے وصی اور میرے خلیفہ ہیں اور وہی میرے بعد اُمّت کے امام ہوں گے۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ متّقی کم اور مُوذی زیادہ ہیں اور لوگ مجھ پر نکتہ چینی بھی کرتے تھے کہ میں زیادہ وقت علیؑ کے ساتھ گزارتا ہوں اور ان کو پسند کرتا ہوں اور اسی وجہ سے انھوں نے میرا نام "اُذُن" (کانوں کا کچا) رکھ دیا تھا۔ قرآن شریف میں ہے: وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ (سورۂ توبہ۔ آیت ۶۱) اگر چاہوں تو میں ان لوگوں کے نام بھی بتلا سکتا ہوں۔ مگر میں نے اپنی فراخدلی سے اُن کے ناموں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ ان وجوہ سے میں نے جبرئیل سے کہا کہ میرے پروردگار سے کہہ دیں کہ مجھے اس فرض کی بجا آوری سے معافی دیدے مگر اللہ نے میری معذرت قبول نہ کی اور کہا کہ یہ پیغام پہنچانا ضروری ہے۔ پس لوگو سُنو! اللہ تعالیٰ نے تمھارا ایک ولی اور امام مقرر کر دیا ہے اور اس کی اطاعت تم میں سے ہر ایک پر فرض کردی ہے....."[1]

جب یہ آیت نازل ہوئی کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تو آنحضرت صَلَّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بغیر کسی تاخیر کے اسی وقت اپنے پروردگار کے حُکم کی تعمیل

---

[1] یہ مکمل خطبہ طبری نے کتاب الولایہ میں نقل کیا ہے۔ سُیوطی نے بھی اسے تفسیر دُرِّ منثور جلد دوم میں ملتے جُلتے الفاظ میں نقل کیا ہے۔

کی اور اپنے بعد علیؑ کو خلیفہ مقرر کر دیا۔ آپ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ علی علیہ السلام کو امیر المومنین مقرر ہونے کی مبارکباد دیں۔ چنانچہ سب نے انھیں تبریک پیش کی۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ الخ

یہی نہیں، بعض علمائے اہلِ سنّت خود اعتراف کرتے ہیں کہ آیۂ تبلیغ امام علیؑ کی امامت کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ابنِ مردُوَیہ سے روایت کی ہے۔ ابن مردُوَیہ کہتے ہیں کہ ابنِ مسعود کہتے تھے کہ ہم رسول اللہ ص کے زمانے میں اس آیت کو اس طرح پڑھا کرتے تھے:

یَآ اَیُّھَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ. اِنَّ عَلِیًّا مَوۡلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ. وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ. وَاللّٰهُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ. [1]

اس کے ساتھ اگر ہم ان شیعہ روایات کا بھی اضافہ کر دیں جو وہ ائمۂ اہلبیت سے روایت کرتے ہیں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو امامت سے مکمل کیا اور یہی وجہ ہے کہ شیعوں کے نزدیک امامت اُصولِ دین میں شامل ہے۔

علی بن ابی طالبؑ کی امامت سے ہی اللہ نے اپنی نعمت مسلمانوں پر تمام کی تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا نہ ہو اور وہ خواہشات کی آماجگاہ بن جائیں، فتنے ان میں تفرقہ ڈال دیں اور وہ بھیڑوں کا ایسا گلّہ رہ جائیں جن کا کوئی رکھوالا اور چرواہا نہ ہو۔

اللہ نے اسلام کو بطور دین کے پسند کر لیا، کیونکہ اس نے ان کے لیے ایسے ائمہؑ کو منتخب کیا جو ہر بُرائی اور گندگی سے پاک تھے۔ اس نے ان اماموں کو حکمت و دانائی عطا کی اور انھیں کتابُ اللہ کے علم کا وارث بنایا تاکہ وہ خاتمُ المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی بن سکیں۔ اِس لیے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اللہ کے حُکم اور اس کے فیصلے پر راضی رہیں اور اس کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اِس لیے کہ اسلام کا عام مفہوم ہی اللہ کے ہر حکم کو تسلیم کرنا

---

[1] شوکانی، تفسیر فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۵۷۔ سیوطی، تفسیر دُرِّ منثور جلد ۲ صفحہ ۲۹۸۔

اور اس کی مکمل اطاعت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ. وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ.

تمھارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے پسند کرتا ہے۔ لوگوں کو پسند کا کوئی حق نہیں۔ یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں اللہ اس سے پاک اور برتر ہے۔ اور ان کے دلوں میں جو کچھ پوشیدہ ہے اور جو کچھ یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں تمھارا پروردگار اس کو جانتا ہے۔ اللہ وہی ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سب تعریف اُسی کی ہے دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور حکومت بھی اُسی کی ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

(سورۂ قصص۔ آیات ۶۸ تا ۷۰)

اِن تمام باتوں سے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ رسول اللہؐ نے یومِ غدیر کو عید کا دن قرار دیا تھا۔ امام علیؑ کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کے بعد جب آپ پر یہ آیت نازل ہوئی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ تو آپ نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ دین مکمل ہو گیا اور نعمت پوری ہو گئی۔ اللہ نے میری رسالت اور میرے بعد علی بن ابی طالبؑ کی وَلایت کو پسند کیا[1] پھر آپ نے علیؑ کے لیے تقریب تبریک منعقد کی خود رسول اللہؐ ایک خیمہ میں رونق افروز ہوئے اور علیؑ کو اپنے برابر بٹھایا اور سب مُسلمانوں کو حکم دیا، ان میں آپ کی اَزواج، اُمّہاتُ المومنین بھی شامل تھیں کہ گروہ در گروہ علیؑ کے پاس جا کر انھیں امامت کی مُبارکباد دیں اور امیرالمومنین کی حیثیت سے انھیں سلام کریں۔ چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا۔ اِس موقع پر امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ

---

[1] حاکم حسکانی بروایت ابوسعید خُدری اپنی تفسیر میں اور حافظ ابونعیم اصفہانی مَانَزَلَ مِنَ الْقُرآن فِی عَلِیؑ میں۔

کو مبارکباد دینے والوں میں ابوبکر اور عمر بھی شامل تھے، وہ یہ کہتے ہوئے آئے:

بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اَصْبَحْتَ وَاَمْسَیْتَ
مَوْلَانَا وَ مَوْلٰی کُلِّ مُؤْمِنٍ وَّمُؤْمِنَۃٍ۔ [1]

جب شاعرِ رسول حسّان بن ثابت نے دیکھا کہ رسول اللہؐ اس موقع پر بہت خوش اور شاداں و فرحاں ہیں تو انھوں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں آپ کی اجازت سے اِس موقع پر چند اشعار عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ضرور سناؤ۔ حسّان! جب تک تم زبان سے ہماری مدد کرتے رہو گے تمھیں رُوحُ القدس کی تائید حاصل رہے گی۔

حسّان نے شعر سنانے شروع کیے؂

یُنَادِیْھِمْ یَوْمَ الْغَدِیْرِ نَبِیُّھُمْ
بِخُمٍّ فَاسْمَعْ بِالرَّسُوْلِ مُنَادِیَا

(غدیر کے دن خُم کے مقام پر مسلمانوں کے پیغمبر مسلمانوں کو پکار رہے ہیں، سنو! رسولؐ کیا کہہ رہے ہیں)

اِس کے علاوہ اور بھی متعدد اشعار تھے جن کو مؤرخین نے نقل کیا ہے [2]

اِس سب کے باوجود قریش نے چاہا کہ خلافت ان کے پاس رہے اور بنی ہاشم کے یہاں خلافت اور نبوّت دونوں جمع نہ ہونے پائیں تاکہ بنی ہاشم کو شیخی بگھارنے کا موقع نہ مل سکے۔ اس کی تصریح خود حضرت عُمر نے عبداللہ بن عبّاس سے ایک دفعہ گفتگو کرتے ہوئے کی [3]

اِس لیے پھر کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ پہلی تقریب کے بعد جو رسول اللہؐ

---

[1] یہ قصّہ امام ابو حامد غزالی نے اپنی کتاب سرّ العالمین صفحہ ۶ پر بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام احمد بن حنبل نے اپنی مُسند جلد ۴ کے صفحہ ۲۸۱ پر اور طبری نے اپنی تفسیر کی جلد ۳ کے صفحہ ۴۲۸ پر اس کا ذکر کیا ہے۔ نیز بیہقی، ثعلبی، دارقطنی، فخر رازی اور ابنِ کثیر وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

[2] جلال الدین سیوطی، اَلْاِزْدِھَارُ فِیْمَا عَقَدَہُ الشُّعَرَاءُ مِنَ الْاَشْعَارِ۔

[3] طبری، تاریخ الامم والملوک جلد ۵ صفحہ ۳۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ جلد ۳ صفحہ ۳۱۔ شرح نہج البلاغہ۔

نے خود منعقد کی تھی، کوئی عیدِ غدیر کا جشن منائے۔

جب لوگ نصِ خلافت ہی کو بھول گئے جسے ابھی دو ہی مہینے ہوئے تھے تو غدیر کے واقعہ کی یاد کون مناتا جسے ایک سال ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ یہ عید تو نصِّ خلافت سے منسلک تھی۔ جب وہ نص ہی باقی نہ رہی تو عید منانے کی وجہ ہی ختم ہو گئی۔

اسی طرح سالہا سال گزر گئے، یہاں تک کہ رُبع صدی کے بعد امام علیؑ نے اسے دوبارہ اس وقت زندہ کیا جب آپ نے اپنے عہدِ خلافت میں ان صحابہ سے جو غدیرِ خُم میں موجود تھے، کہا کہ وہ کھڑے ہو کر سب کے سامنے بیعتِ خلافت کی گواہی دیں۔ تیس صحابیوں نے گواہی دی جن میں سے سولہ بدری صحابہ تھے[1] ایک اَنَس بن مالک نے کہا کہ "مجھے یاد نہیں"۔ انھیں وہیں برص کی بیماری ہو گئی۔ وہ روتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے عَبدِ صَالح علی بن ابی طالبؑ کی بد دُعا لگ گئی[2]

اِس طرح امام علیؑ نے اس اُمّت پر حُجّت قائم کر دی۔ اس وقت سے آج تک شیعہ یومِ غدیر کی یاد مناتے رہتے ہیں اور تا قیامِ قیامت مناتے رہیں گے۔ یہ دن شیعوں کے نزدیک عیدِ اکبر ہے اور کیوں نہ ہو! جب اُس دن اللہ نے دین کو ہمارے لیے کامل کیا اور اس دن ہم پر نعمت تمام کی اور اسلام کو بطور ایک دین کے ہمارے لیے پسند کیا۔ یہ اللہ، اس کے رسول اور مُومنین کی نظر میں ایک عظیم الشان دن ہے۔

بعض عُلمائے اہلِ سُنّت نے ابوہُریرہ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ الخ تو اللہ نے یہ آیت نازل کی: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ ابوہُریرہ کہتے ہیں کہ یہ ۱۸ ذی الحجہ کا دن تھا اور جس نے اس دن روزہ رکھا، اس کے لیے ساٹھ مہینوں کے روزوں کا ثواب لکھا جائے گا۔[3]

---

[1] امام احمد بن حنبل، مسند جلد ۴ صفحہ ۳۷۰۔ مُلّا علاء الدین متّقی، کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۳۹۷۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۲۱۱

[2] ہیثمی، مجمع الزوائد جلد ۹ صفحہ ۱۰۶۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۲۶۔ امام احمد بن حنبل، مُسند جلد اول۔

[3] ابن کثیر، کتاب البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۲۱۴۔

جہاں تک شیعہ روایات کا تعلق ہے تو وہ ائمۂ اہلِ بیتؑ سے اس دن کے فضائل کے بارے میں اتنی ہیں کہ بس بیان کیے جائیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ہدایت دی کہ ہم امیرالمومنینؑ کی وَلایت کو مانیں اور یومِ غدیر کو عید منائیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ حدیثِ غدیر صحیح معنیٰ میں ایک بہت بڑا تاریخی واقعہ ہے جسے نقل کرنے پر اُمّتِ محمّدیہ نے اتفاق کیا ہے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں تین سو ساٹھ سُنّی علماء نے اس حدیث کو بیان کیا ہے اور شیعہ عُلماء کی تعداد تو اس سے بھی زیادہ ہے۔

ان حالات میں یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ اُمّتِ اسلامیہ دو فریقوں میں تقسیم ہوگئی ہے: ایک اہلِ سُنّت، دوسرے اہلِ تشیُّع۔

اہلِ سُنّت سقیفۂ بنی ساعدہ کے شُوریٰ کے اُصول پر جمے ہوئے ہیں، وہ صریح نصُوص کی تاویل کرتے ہیں اور حدیثِ غدیر وغیرہ جس پر سب راویوں کا اتفاق ہے، اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

دوسرا فریق ان نصُوص پر قائم ہے اور انھیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اس فریق نے ائمۂ اہلِ بیت کی بیعت کی ہے اور ان ہی کو مانتا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ میں جب اہلِ سُنّت کے مذہب کو کُریدتا ہوں تو مجھے اس میں کوئی اطمینان بخش چیز نظر نہیں آتی۔ خصُوصاً خلافت کے معاملے میں۔ ان کے سب دلائل ظنّی و اجتہاد پر مبنی ہیں۔ کیونکہ انتخاب کا قاعدہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ آج جس شخص کو ہم پسند کرتے ہیں وہ ضرور سب دُوسروں سے افضل ہے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ کس کے دل میں کیا ہے۔ خُود ہمارے اندر ذاتی جذبات و تعصّبات چھپے ہوئے ہیں اور جب بھی متعدد اشخاص میں سے ایک شخص کو پسند کرنے کا موقع ہوتا ہے، یہ عوامل ہمارے فیصلے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ کوئی خیالی مفروضہ نہیں اور نہ اس معاملے میں کچھ مُبالغہ ہے کہ جو شخص بھی اس طرزِ فکر ۔ یعنی خلیفہ کے انتخاب کے تصوّر ۔ کا تاریخی نقطۂ نظر سے مُطالعہ کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ اُصول جس کے اتنے ڈھول پیٹے جاتے ہیں نہ کبھی کامیاب ہوا ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کبھی کامیاب ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ شوریٰ تحریک کے لیڈر ابوبکر نے جو شوریٰ کے ذریعے منصب خلافت تک پہنچے تھے، خود ہی دو سال بعد اس اصول کو توڑ دیا تھا جب انھوں نے اپنے مرض الموت میں عمر بن خطّاب کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ کیونکہ انھیں اپنے زمانۂ حکومت میں احساس ہو گیا تھا کہ خلافت کے امیدوار بہت ہیں اور لوگ خلافت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں، اس لیے ایسے فتنے کا اندیشہ ہے جو امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا۔ یہ اس صورت میں ہے جب ہم ابوبکر کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لیں۔ لیکن اگر انھیں خود معلوم تھا کہ دراصل خلافت کا فیصلہ نص سے ہوتا ہے، تو پھر یہ ایک دوسرا معاملہ ہے۔

اُدھر عمر بن خطّاب جو سقیفہ کے موقع پر ابوبکر کی خلافت کے محرک اور معمار تھے اپنے دورِ خلافت میں علانیہ کہتے تھے کہ

> ابوبکر کی بیعت بلا مشورہ اور اچانک ہو گئی تھی، لیکن اللہ نے مسلمانوں کو اس کے برے نتائج سے محفوظ رکھا[1]

اس کے بعد جب عمر ابولؤلؤ فیروز کے وار سے زخمی ہو گئے اور انھیں اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تاکہ وہ خلافت کے لیے اپنے میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ لیکن انھیں یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چند لوگ بھی، اس کے باوجود کہ انھیں رسول اللہؐ کی صحبت کا شرف حاصل تھا، وہ سابقین اولین میں سے تھے اور زہد و تقویٰ میں ممتاز تھے، انسانی جذبات سے ضرور متأثر ہوں گے۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے اور اس سے صرف معصوم ہی مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، اس لیے اختلاف کی صورت میں فیصلے کے لیے انھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف کا پلّہ جھکا دیا اور کہا کہ اختلاف کی صورت میں اس فریق کے حق میں فیصلہ ہو گا جس کے ساتھ عبدالرحمٰن بن عوف ہوں گے۔ اس کے بعد اس کمیٹی نے خلافت کے لیے امام علیؑ کا انتخاب کر دیا لیکن شرط یہ رکھی کہ وہ کتاب اللہ، سنّتِ رسول اللہؐ اور سنّتِ شیخین یعنی ابوبکر اور عمر کی سنّت کے مطابق حکومت کریں گے۔ علیؑ نے کتاب اللہ

---

[1] صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۶ باب رجم الحبلیٰ من الزنا۔

اور سنتِ رسول اللہ ص کی بات تو تسلیم کرلی لیکن سُنّتِ شیخین کی پیروی کرنے سے انکار کردیا[1] عثمان نے یہ شرائط منظور کرلیں، چنانچہ ان کی بیعت کرلی گئی۔ علی ع نے اس موقع پر کہا تھا:

فَیَا لِلّٰہِ وَلِلشُّوریٰ! مَتَی اعْتَرَضَ الرَّیْبُ فِیَّ مَعَ الْاَوَّلِ مِنْھُمْ، حَتّٰی صِرْتُ اُقْرَنُ اِلٰی ھٰذِہِ النَّظَائِرِ! لٰکِنِّیْ اَسْفَفْتُ اِذْ اَسَفُّوْا وَطِرْتُ اِذْ طَارُوْا، فَصَغَا رَجُلٌ مِّنْھُمْ لِضِغْنِہٖ وَمَالَ الْاٰخَرُ لِصِھْرِہٖ مَعَ ھَنٍ وَّھَنٍ.

قسم بخدا! کہاں علی اور کہاں یہ نام نہاد شوریٰ۔ ان لوگوں میں کے پہلے حضرت (ابوبکر) کی نسبت میری فضیلت میں شک ہی کب تھا جو اَب ان لوگوں نے مجھے اپنے جیسا سمجھ لیا ہے؟ (لیکن میں جی کڑا کر کے شوریٰ میں حاضر ہوگیا) اور نشیب و فراز میں ان کے ساتھ ساتھ چلا مگر ان میں سے ایک[2] نے بغض و حسد کے مارے میرا ساتھ نہ دیا اور دوسرا[3] دامادی اور ناگفتہ بہ باتوں کی کے باعث اُدھر جھک گیا۔ (نہج البلاغہ - خطبہ شقشقیہ)

جب یہ ان لوگوں کا حال تھا جو مُسلمانوں میں انتخاب اور اَخصُّ الخواص تھے کہ وہ بھی جذبات کی رو میں بہ جاتے تھے اور بُغض و حَسد اور عَصبیت سے متاثر ہوتے تھے تو پھر عام دُنیاداروں کا تو ذکر ہی کیا۔ بعد میں عبدالرحمٰن اپنے اس انتخاب پر پچھتاتے بھی۔ اور جب عُثمان کے دور میں وہ واقعات پیش آئے جو معلوم ہیں تو وہ عُثمان پر بگڑے بھی کہ انھوں نے اپنے عہد کا پاس نہیں کیا۔ اور جب کِبارِ صحابہ نے ان سے آکر کہا کہ عبدالرحمٰن یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے، تو انھوں نے کہا کہ مجھے عُثمان سے یہ

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک۔ ابن اثیر الکامل فی التاریخ

[2] سعد بن ابی وقاص کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے حضرت عُثمان کے بعد بھی حضرت علیؑ کی بیعت نہیں کی۔

[3] عبدالرحمٰن بن عوف کی طرف اشارہ ہے۔ یہ حضرت عثمان کی سوتیلی بہن کے شوہر تھے۔ (ناشر)

توقع نہیں تھی، مگر اب میں نے قسم کھائی ہے کہ عثمان سے کبھی بات نہیں کروں گا۔
کچھ دن بعد عبدالرحمٰن کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک بھی ان کی عثمان سے بول چال بند تھی۔ بلکہ کہتے ہیں کہ ان کی بیماری میں عثمان ان کی عیادت کے لیے گئے تو عبدالرحمٰن نے دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ بات نہیں کی[1]

پھر جو ہونا تھا وہ ہوا۔ عثمان کے خلاف شورش بھڑک اٹھی اور آخر وہ قتل ہو گئے۔ امت ایک بار پھر انتخاب کے مرحلے سے گزری۔ خلافت کے امیدواروں میں: طلیق[2] بن طلیق، معاویہ بن ابی سفیان، عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، مروان بن حکم وغیرہ شامل تھے، مگر اس بار علیؑ کو چنا گیا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ اسلامی مملکت میں انتشار پھیل گیا۔ اور وہ منافقوں، مملکت کے دشمنوں، متکبّروں اور ان لالچیوں کی جولانگاہ بن گئی۔ جو ہر قیمت پر مسند خلافت پر متمکّن ہونے کے خواہاں تھے۔ چاہے اس کے لیے کوئی طریقہ بھی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے اور کتنے ہی بیگناہوں کا خون کیوں نہ بہانا پڑے۔ اور یہ کہ اس ۲۵ سالہ مدت میں خدا و رسولؐ کے احکام میں تحریف بھی کی گئی۔ پس امام علیؑ ایک ایسے بحران میں پھنس گئے جس کے ہر طرف بپھری ہوئی موجیں تھیں، ماحول تیرہ و تاریک تھا، منہ زور خواہشات کا زور تھا۔ امام علیؑ کا عہدِ خلافت ایسی خوں ریز جنگوں میں گزرا جو باغیوں، ظالموں اور ملحدوں نے ان پر مسلّط کر دی تھیں۔ وہ اس بحران سے جام شہادت نوش کر کے ہی نکل سکے۔ اور اُمّتِ محمّدیہ کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے اس دُنیا سے چلے گئے۔ فَسَلَامُ اللّٰہِ عَلَیْہِ۔ یہ سب شوریٰ اور انتخاب کے تصوّر کا شاخسانہ تھا۔

اس کے بعد اُمّتِ محمدیہ خوُن کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اس کی قسمت کے فیصلے احمقوں اور رذیلوں کے ہاتھ میں آ گئے۔ پھر شوُریٰ کٹ کھنی بادشاہت میں بدل گئی اور اس نے قیصری اور کسروی کی شکل اختیار کر لی۔ معاویہ کے عہد سے خلافت

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک۔ ابن اثیر الکامل فی التاریخ ۳۶ھ کے واقعات۔ شیخ محمد عبدہ شرح نہج البلاغہ جلد ۱۔

[2] اس شخص کو رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے دن واجبُ القتل قرار دیا تھا۔

موروثی ہوگئی اور بیٹا باپ کا جانشین ہونے لگا۔
وہ دور ختم ہوگیا جسے خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے اور جس دور کے چار خلفاء خُلفائے راشدین کہلاتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ان چار میں سے بھی صرف ابوبکر اور علیؑ انتخاب اور شورٰی کے ذریعہ سے خلیفہ ہوئے تھے۔ ان میں سے اگر ہم ابوبکر کو چھوڑ دیں کیونکہ ان کی بیعت اچانک ہوئی تھی اور اس میں آجکل کی اصطلاح میں حزبِ اختلاف نے شرکت نہیں کی تھی جو علیؑ، ان کے حامی صحابہ[1] اور بنی ہاشم پر مشتمل تھی، تو صرف علی بن ابی طالبؑ ہی رہ جاتے ہیں جن کی بیعت واقعی شورٰی اور آزادئ رائے کے اصول کے تحت منعقد ہوئی۔ اور علیؑ کے انکار کے باوجود مسلمانوں نے ان سے بیعت کی اگرچہ بعض صحابہ نے بیعت سے پہلو تہی ضرور کی لیکن ان پر زبردستی نہیں کی گئی اور نہ انھیں کوئی دھمکی دی گئی۔
اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ علی بن ابی طالبؑ نصِّ قطعی کے ذریعے سے بھی خلیفہ ہوں اور مُسلمان ان کا انتخاب بھی کریں۔ اب علیؑ کی خلافت پر کیا سُنّی، کیا شیعہ پُوری اُمّتِ مُسلمہ کا اِجماع ہے اور جیساکہ سب کو معلوم ہے، دوسرے خُلفاء کے بارے میں اختلاف ہے۔
یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس نعمتِ خُداوندی کی قدر نہیں کی۔ اگر قدر کرتے تو ان پر آسمانی برکتوں کے دروازے کُھل جاتے۔ روزی کی ہرگز تنگی نہ ہوتی آج مُسلمان ساری دنیا کے قائد اور سردار ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ .

تم ہی سب سے سربلند ہوگے بشرطیکہ تم سچّے مومن ہو۔
لیکن ابلیسِ لعین تو ہمارا کُھلا دشمن ہے، اس نے اللہ ربّ العِزّت سے کہہ دیا تھا کہ:

---

[1] مثلاً اُسامہ بن زَید، زُبیر بن العوام، سلمان فارسی، ابُوذر غِفاری، مِقداد بن اَسْوَد، عمّار بن یاسِر، حُذیفہ بن یمان، خُزیمہ بن ثابت، ابوبُریدہ اسلمی، بَرا بن عازِب، فضل بن عباس، اُبَیّ بن کعب، سَہل بن حُنیف، سَعد بن عُبادہ، قَیس بن سعد، خالد بن سعید، ابوایوب انصاری جابر بن عبداللہ انصاری وغیرہ۔ (ناشر)

فَبِمَا اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ.

چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے، میں بھی اس سیدھی راہ پر بیٹھ کر رہوں گا جو تو نے ان کے لیے تجویز کی ہے، پھر آؤں گا ان کے پاس ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے، ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے۔ اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا۔

(سورۂ اعراف۔ آیت ۱۶-۱۷)

آج اہلِ نظر دنیا میں مسلمانوں کی حالت دیکھیں خصوصاً تیسری دنیا میں، جہاں کے مسلمان پسماندہ ہیں، جاہل ہیں، ان کی قسمت کا فیصلہ اغیار کے ہاتھ میں ہے، وہ ذلیل ہیں، کچھ نہیں کر سکتے۔ ان ممالک کے پیچھے دوڑتے ہیں جو اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں حالانکہ اسرائیل مسلمان حکومتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ مسلمانوں کو یروشلم میں گھسنے تک نہیں دیتا جسے اس نے اپنا دارالسلطنت بنا لیا ہے۔ آج مسلمان ممالک امریکہ اور روس کے رحم وکرم پر ہیں۔ مسلمان قومیں جہالت، بھوک اور بیماری کے عفریت کے چنگل میں بری طرح پھنسی ہوئی ہیں۔ یورپ کے تو کتّے بھی انواع واقسام کے گوشت اور مچھلیاں کھاتے ہیں، جب کہ مسلمانوں کے بچّے بھوک سے دم توڑ دیتے ہیں۔ بعض اسلامی ملکوں میں تو انھیں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نصیب نہیں ہوتا اور وہ کوڑے کے ڈھیر سے اپنی غذا تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ فَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

سَیِّدَۃُ النِّسَاء فَاطِمَۃُ الزَّہرا سلام اللہ علیہا کا بیعتِ ابوبکر کے بعد، جب ابوبکر سے جھگڑا ہوا تھا تو انھوں نے مُہاجرین وانصار کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"..... معلوم نہیں لوگوں کو علی کی کیا بات ناپسند ہے کہ انھوں نے ان کی حمایت چھوڑ دی ہے؟ بخُدا! لوگ علی کی احکامِ الٰہی کے بارے میں سختی، ان کی ثابت قدمی اور ان کی شمشیرِ خارا شگاف کو پسند نہیں کرتے مگر انھوں نے خُود اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ علی

کی حکومت میں انھیں ظُلم وسِتم سے واسطہ نہ پڑتا۔ وہ تو انھیں
عِلم ودَانش اور عدل وانصاف کے چشموں سے سیراب کرتے۔"
اس کے بعد انھوں نے ایک پیشین گوئی کی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر
کے آخر میں اس امت کے انجام کی خبر دیتے ہوئے کہا تھا:

"جو کام ان لوگوں نے کیا ہے وہ گابھن اُونٹنی کی طرح ہے۔
بچّہ ہونے دو پھر تم پیالہ بھر کے دُودھ کی بجائے خُون اور زہر
دوہو گے۔ اس وقت باطل پرست خسارہ میں رہیں گے اور یہ
کہ آئندہ آنے والی نسلیں اپنے پچھلوں کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتیں
گی اور یقین رکھو کہ تم فتنہ وفساد میں ڈوب جاؤ گے اور یقین رکھو
کہ تلوار چلے گی، ظلم وسِتم ہوگا، افراتفری ہوگی، ظالموں کی مطلق
العنان حکومت ہوگی جو تمھیں پیس کے رکھ دے گی۔ تم کس خیال
میں ہو؟ تمھیں کیوں سمجھ نہیں آتی؟ کیا ہم زبردستی وہ چیز
تمھارے سر مَنڈھ دیں جو تمھیں پسند ہی نہیں؟"[1]

دُخترِ رسولؐ اور گوہرِ کانِ نبوّت صدیقہؑ طاہرہؑ نے جو کچھ کہا وہ اس اُمّت کی
تاریخ میں حرف بحرف سچ ثابت ہوا اور کون جانے ابھی پردۂ غیب میں کیا ہے۔ شاید
مستقبل میں جو کچھ پیش آئے وہ ماضی سے بھی زیادہ بھیانک ہو۔ کیوں کہ اللہ نے
جو احکام نازل کیے وہ انھیں ناپسند ہوئے۔ پھر اللہ نے بھی ان کے اعمال غارت
کر دیئے۔

اِس بحث کا ایک اہم جُزو

اِس بحث کے سلسلے میں ایک خاص بات جو توجّہ اور تحقیق کی مستحق ہے اور
یہ وہ واحد اعتراض ہے جو اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب مُسکِت دلائل کے سامنے
مخالفین کے لیے فرار کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور انھیں نصوصِ صریحہ کا اعتراف کرنا پڑتا

---

[1] طبری، دلائل الامامۃ - ابن طیفور بلاغات النساء - ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ

ہے تو وہ بالآخر انکار اور تعجّب کے ساتھ کہتے ہیں کہ "یہ کیسے ممکن ہے کہ امام علیؑ کے امامت پر تقرر کے وقت ایک لاکھ صحابہ موجود ہوں اور پھر وہ سب کے سب اس تقرر کی مخالفت کرنے اور اسے نظر انداز کرنے پر اتفاق کرلیں، جب کہ ان میں بہترین صحابہ اور اُمّت کے افضل ترین اشخاص شامل تھے۔"

یہ صورت خود میرے ساتھ اس وقت پیش آئی جب میں نے اس موضوع پر تحقیق شروع کی ۔ مجھے یقین نہیں آتا اور کسی کو بھی یقین نہیں آئیگا اگر معاملے کو اس صورت میں پیش کیا جائے ۔

لیکن جب ہم اس معاملے کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہیں تو پھر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں رہتی ۔ کیونکہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے جس طرح ہم سمجھتے ہیں یا جس طرح اہلسُنّت پیش کرتے ہیں ۔ بات ان کی بھی معقول ہے ۔ حَاشَا وَکَلّا ! یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک لاکھ صحابہ فرمانِ رسولؐ کی مخالفت کریں ۔

پھر یہ واقعہ کس طرح پیش آیا ؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ بیعتِ غدیر کے موقع پر موجود تھے وہ سب مدینہ منوّرہ کے رہنے والے نہیں تھے ۔ ان میں زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار مدینے کے باشندے ہوں گے ۔ پھر ان میں بہت سے آزاد شدہ غلام تھے ، غلام بھی تھے اور وہ کمزور لوگ بھی تھے جو مختلف اطراف واکناف سے آکر رسول اللہؐ کی خدمت میں جمع ہوگئے تھے ، ان کا مدینہ میں اپنا کوئی کنبہ قبیلہ نہیں تھا جیسے : "اصحابِ صُفّہ"۔ اگر ان سب کو نکال دیا جائے تو ہمارے پاس آدھی تعداد بچتی ہے یعنی زیادہ سے زیادہ دو ہزار ۔ یہ لوگ بھی قبائلی نظام کے تحت قبیلے کے سرداروں کے تابع تھے ۔ رسول اللہؐ نے اس نظام کو باقی رہنے دیا تھا ۔ جب رسول اللہؐ کے پاس کوئی وفد آتا تھا تو آپ اس کے سردار کو اس کا انچارج مقرر کردیتے تھے ۔ اسی لیے اسلام میں ان زعماء اور سرداروں کے لیے اہلِ حل وعقد کی اِصطلاح رواج پاگئی ۔

جب ہم سقیفہ کانفرنس پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے شرکاء کی تعداد جنھوں نے حضرت ابوبکر کو منتخب کیا تھا ایک سو سے ہرگز متجاوز نہیں تھی ، اس لیے کہ انصار میں سے ۔ جو مدینے کے اصل باشندے تھے ۔ صرف سرداروں نے

شرکت کی تھی اور مہاجرین میں سے جو دراصل مکّے کے رہنے والے تھے اور رسول اللہؐ کے ساتھ ہجرت کر کے آئے تھے صرف تین یا چار اشخاص ہی شریک تھے جو قریش کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ ہم یہ اندازہ لگائیں کہ سقیفہ کتنا بڑا ہوگا۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ سقیفہ کیا ہوتا ہے۔ یہ مکان کے بیرونی دروازے سے ملحق ایک کمرہ ہوتا ہے جس میں لوگ بیٹھک جماتے ہیں۔ یہ کوئی آڈیٹوریم یا کانفرنس ہال نہیں تھا۔ اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "سقیفۂ بنی ساعدہ" میں سو آدمی موجود ہوں گے تو درحقیقت ہم مُبالغے سے کام لیتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ تحقیق کرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہاں وہ ایک لاکھ آدمی نہیں تھے جو "غدیرِ خم" کے موقع پر موجود تھے، بلکہ انھیں تو یہ معلوم بھی کافی عرصے کے بعد ہوا ہوگا کہ سقیفہ میں کیا کارروائی ہوئی، کیونکہ ان دنوں نہ فضائی رابطہ تھا نہ ٹیلیفون تھے اور نہ ہی مصنوعی سیّارے تھے۔ جب وہاں موجود زُعماء کا ابوبکر کے تقرر پر انصار کے سردار سَعد بن عُبادہ اور ان کے بیٹے قَیس کی مخالفت کے باوجود، اتفاق ہو گیا اور غالب اکثریت سے معاملہ طے پا گیا اس وقت مسلمانوں کی بڑی تعداد سقیفہ میں موجود نہیں تھی۔ کچھ لوگ رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے، کچھ رسول اللہؐ کی وفات کی خبر سے حواس باختہ تھے۔ عمرؓ نے انھیں یہ کہہ کر اور بھی خوف زدہ کر دیا تھا کہ خبردار کوئی یہ بات زبان سے نہ نکالے کہ رسول اللہؐ وفات پا گئے ہیں[1]

اس کے علاوہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد کو رسول اللہؐ نے سپاہِ اُسامہ میں بھرتی کر لیا تھا اور یہ لوگ زیادہ تر جُرف میں مقیم تھے۔ لہٰذا یہ لوگ رسول اللہؐ کی وفات کے وقت نہ تو مدینے میں موجود تھے اور نہ ہی سقیفہ کی کانفرنس میں شریک ہوئے۔

اس کے بعد بھی کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کسی قبیلے کے افراد اپنے سردار کی مخالفت کرتے اور اس نے جو فیصلہ کر دیا تھا اسے نہ مانتے۔ خصوصاً جب کہ یہ فیصلہ ان کے لیے ایک بڑا اعزاز تھا جس کو حاصل کرنے کی ہر قبیلہ کوشش کرتا تھا۔ کون جانتا ہے کہ کسی دن ان کے ہی قبیلہ یا خاندان کو تمام خلافت حاصل ہو جائے جب کہ اس کا

---

[1] صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۹۵۔

شرعی حق دار تو راستے سے ہٹا ہی دیا گیا تھا اور معاملہ شوریٰ پر منحصر ہوگیا تھا۔ اس صورت میں باری باری سب کے لیے موقع تھا۔ ایسی حالت میں وہ اس فیصلے سے کیوں نہ خوش ہوتے اور کیسے نہ اس کی تائید کرتے؟

دوسری بات یہ ہے کہ جب مدینے کے رہنے والے اہلِ حل وعقد نے ایک بات طے کر دی تھی تو جزیرہ نمائے عرب کے دُور افتادہ باشندوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں کیا ہو رہا ہے جب کہ اس دور میں وسائلِ رسل و رسائل بالکل ابتدائی حالت میں تھے۔

اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ اہلِ مدینہ رسول اللہؐ کے پڑوسی ہیں وہ احکام ربانی اور وحی آسمانی سے جو کسی وقت اور کسی دن بھی نازل ہو سکتی تھی زیادہ واقف ہیں۔

پھر یہ کہ صدر مقام سے دور رہنے والے قبیلے کے سردار کو خلافت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے اِس سے کیا کہ ابُوبکر خلیفہ ہوں یا علیؑ یا کوئی اور۔ گھر کا حال گھر والے جانیں۔ اس کے لیے تو اہم بات صرف یہ تھی کہ اس کی سرداری برقرار رہے۔ اسے کوئی چھیننے کی کوشش نہ کرے۔

کون جانتا ہے، شاید کسی نے معاملے کے متعلق کچھ پُوچھ گچھ کی بھی ہو۔ اور حقیقتِ حال جاننے کی کوشش کی ہو۔ لیکن حکومت کے کارندوں نے خواہ ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر اسے خاموش کر دیا ہو۔ شاید مالک بن نُوَیرہ کے قصے کے متعلق۔ جس نے ابُوبکر کو زکات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ شیعوں ہی کی بات صحیح ہو۔ حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ لیکن جو شخص مانعینِ زکوٰۃ کے ساتھ جنگ کے دوران میں پیش آنے والے واقعات کا بغور مُطالعہ کرے گا اسے بہت سے ایسے تضادات ملیں گے جن کے متعلق بعض مؤرخین کی پیش کی ہوئی صفائی سے اطمینان نہیں ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس واقعہ کے اچانک پیش آجانے کا بھی اس کو بطور امر واقعی FAIT ACCOMPLI تسلیم کر لیے جانے میں بڑا دخل رہا ہے۔ سقیفہ کانفرنس اس وقت اچانک منعقد ہوئی تھی جب بہت سے صحابہ رسول اللہؐ کی تجہیز

وتکفین میں مشغول تھے، ان میں امام علیؑ، عبّاس، دوسرے بنی ہاشم، مِقداد، سَلمان ابُوذر، عمّار اور دوسرے بہت سے اصحاب شامل تھے۔ جب تک سقیفہ کے شرکاء ابوبکر کو مسجد میں لے کر گئے اور انھوں نے عام بیعت کی دعوت دی جس پر لوگ بادلِ خواستہ وناخواستہ بیعت کے لیے اُمنڈ پڑے، اس وقت تک علیؑ اور ان کے پیروکار اپنے شرعی اور اخلاقی فریضہ سے فارغ نہیں ہوئے تھے اور ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ رسول اللہؐ کو بغیر غسل اور بغیر کفن دفن کے چھوڑ کر سقیفہ میں خلافت کے واسطے دوڑ پڑتے اور جب تک وہ اس فریضہ سے فارغ ہوئے، اس وقت تک معاملہ ابوبکر کے حق میں فیصل بھی ہو چکا تھا۔ اب جو کوئی ابوبکر کی بیعت سے پیچھے ہٹتا اس کا شمار مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والے ان فتنہ پردازوں میں ہوتا جن سے نمٹنا اور ضروری ہو تو انھیں قتل کر دینا مسلمانوں پر واجب ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب سَعد بن عُبادہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت میں تامّل کیا تو عُمر بن خطّاب نے انھیں قتل کی دھمکی دی تھی[1]۔

اس کے بعد بیعت سے انکار کرنے والے ان صحابہ کو جو علیؑ کے گھر میں جمع تھے، زندہ جلا دینے کی اور علیؑ کے گھر کو آگ لگا دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اگر ہمیں بیعت سے متعلق عمر کی صحیح رائے معلوم ہو جائے تو بہت سے حیران کُن معمّوں کا حل نکل آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عُمر کا خیال یہ تھا کہ بیعت کے درست ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ کوئی ایک مسلمان بیعت میں سبقت کرلے۔ پھر باقی پر اس کی پیروی واجب ہو جاتی ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی مخالفت کرے تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج اور واجبُ القتل ہے۔

آیئے دیکھیں خود عُمر بیعت کے بارے میں کیا کہتے ہیں!

صحیح بُخاری کی روایت ہے[2] عُمر کہتے ہیں:

"اِس پر بڑی گڑبڑ ہوئی اور خوب شور مچا۔ میں ڈرا کہ کہیں آپس میں

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۸ صفحہ ۲۶ - طبری، تاریخ الامم والملوک - ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ۔

[2] صحیح بُخاری جلد ۸ صفحہ ۲۸ - باب رَجم الحبلیٰ عَنِ الزنا اِذا اَحصَنَتْ۔

تفرقہ نہ پڑ جائے۔ میں نے ابوبکر سے کہا: ہاتھ بڑھاؤ۔ انھوں نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بیعت کر لی۔ مُہاجرین[1] اور انصار نے بھی بیعت کر لی۔ ہم سَعْد بن عُبادہ پر کُود پڑے۔ انصار میں سے کسی نے کہا: تم نے سَعْد بن عُبادہ کو مار ڈالا! میں نے کہا: سَعْد بن عُبادہ پر اللہ کی مار!

عُمر کہتے ہیں کہ

جو مسئلہ ہمارے سامنے تھا، اس کا اس سے مضبوط کوئی حل نہیں تھا کہ ابوبکر کی بیعت کر لی جائے۔ ہمیں ڈر تھا کہ اگر وہاں موجود لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے اور بیعت نہ ہوئی تو کہیں وہ ہمارے جانے کے بعد اپنے ہی لوگوں سے بیعت نہ کر لیں۔ پھر یا تو ہمیں اپنی مرضی کے خلاف بیعت کرنی پڑے گی اور اگر ہم نے مخالفت کی تو فساد برپا ہوگا۔ اگر کوئی کسی سے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر بیعت کرے تو ان دونوں میں سے کسی کا ساتھ نہیں دیا جائیگا۔

معلوم ہوا کہ عُمر کے نزدیک سوال اِنتخاب، اِختیار اور شُوریٰ کا نہیں تھا۔ صرف اتنا کافی تھا کہ کوئی مسلمان بڑھ کر کسی سے بیعت کر لے تاکہ باقی لوگوں پر حُجّت قائم ہو جائے۔ اِسی لیے عمر نے ابوبکر سے کہا تھا کہ ہاتھ بڑھاؤ۔ ابوبکر نے ہاتھ بڑھایا تو عُمر نے بلا جھجک اور بلا کسی سے مشورہ کیے فوراً اِس خوف سے بیعت کر لی کہ کہیں کوئی دُوسرا ان سے بازی نہ لے جائے۔ اس بات کو عُمر نے اس طرح بیان کیا:

ہم ڈرتے تھے کہ اگر ہم ان لوگوں کے پاس سے چلے گئے اور بیعت نہ ہوئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہمارے جانے کے بعد اپنے ہی لوگوں میں سے کسی سے بیعت کر لیں۔ (عُمر کو ڈر تھا کہ کہیں انصار پہل کر کے

---

[1] سب مؤرخین کہتے ہیں کہ سقیفہ میں صرف چار مہاجر موجود تھے۔ یہ کہنا کہ "میں نے بیعت کی اور مہاجرین نے بیعت کر لی" یہ اس قول سے متصادم ہے جو اسی خطبے میں آگے ہے کہ علیؑ، زُبیر اور ان دونوں کے ساتھیوں نے مخالفت کی۔ صحیح بُخاری جلد ۸ صفحہ ۲۶۔

اپنے میں سے کسی کی بیعت نہ کرلیں)۔

مزید وضاحت اگلے فقرے سے ہوجاتی ہے:

> پھر یا تو ہمیں اپنی مرضی کے خلاف ان سے بیعت کرنی ہوگی یا اگر ہم نے مخالفت کی تو فساد برپا ہوجائے گا۔[1]

احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہاں یہ اعتراف کرلیں کہ عمر بن خطاب نے بیعت کے بارے میں اپنی رائے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بدل لی تھی۔ ہوا یوں کہ انھوں نے جو آخری حج کیا تھا اس کے دوران ایک شخص نے عبدالرحمٰن بن عوف کی موجودگی میں ان سے آکر کہا تھا: آپ کو معلوم ہے کہ فلاں شخص کہتا ہے کہ اگر عمر مرجائیں تو میں فلاں سے بیعت کرلوں گا۔ ابوبکر کی بیعت تو اچانک ہوگئی تھی جو اتفاق سے کامیاب ہوگئی۔ یہ سن کر عمرؓ بہت ناراض ہوئے اور مدینے واپسی کے فوراً بعد ایک خطبہ دیا جس میں اور باتوں کے علاوہ کہا:

> میں نے سنا ہے کہ تم میں سے کوئی کہہ رہا تھا کہ اگر عمرؓ مر گئے تو میں فلاں شخص کی بیعت کرلوں گا۔ کسی شخص کو اس دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے کہ ابوبکر کی بیعت اچانک ہوئی تھی لیکن کامیاب رہی۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اللہ نے اس کے برے نتائج سے محفوظ رکھا۔[2]

پھر کہا کہ

> جو شخص مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر کسی سے بیعت کرلے گا تو نہ بیعت کرنے والے کی بیعت صحیح ہوگی اور نہ بیعت لینے والے کی بیعت، بلکہ وہ دونوں قتل کردیے جائیں۔[3]

کاش! سقیفہ کے موقع پر بھی عمرؓ کی یہی رائے ہوتی!

---

[1] صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۸ -

[2] صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۶ -

[3] طبری، تاریخ الامم والملوک، استخلافِ عمر - ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ -

اب یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ عُمر نے زندگی کے آخری ایام میں اپنی رائے تبدیل کیوں کرلی۔ کیونکہ انھیں دوسروں سے بہتر طور پر معلوم تھا کہ وہ اپنی رائے کی وجہ سے ابُوبکر کی بیعت کی بنیاد ڈھا رہے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے بھی ابُوبکر کی بیعت مُسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر اچانک کی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے اس بیان سے خود ان کی اپنی بیعت کی بنیاد ہل گئی اس لیے کہ ابُوبکر نے اپنی وفات کے قریب مُسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر ان کے لیے بیعت لی تھی، یہاں تک کہ بعض صحابہ نے ابُوبکر سے احتجاج بھی کیا تھا کہ ایسے سخت گیر شخص کو ان کا حاکم نہ بنائیں۔ جب ابُوبکر کی چِٹھی سُنانے کے لیے عُمر باہر نکلے تو کسی نے ان سے پوچھا: ابُوحفص! اِس چِٹھی میں کیا ہے؟ عمر نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میں پہلا شخص ہوں گا جو ابُوبکر کے حکم کو سن کر اسے قبول کرے گا۔ اس شخص نے اس پر کہا: مگر مجھے معلوم ہے کہ اس میں کیا ہے؟ اگلی بار آپ نے انھیں حکمراں بنایا تھا، اِس بار وہ آپ کو حکمراں بنا رہے ہیں۔[1]

یہ ویسی ہی بات ہے جیسی امام علیؑ نے اس وقت کہی تھی جب وہ لوگوں کو ابوبکر کی بیعت کی دعوت دے رہے تھے۔ علیؑ نے کہا تھا:

> دودھ دوہ لو، تمھیں تمھارا حصّہ مل جائے گا۔ آج تم ان کی خلافت پکّی کردو، کل وہ خلافت تمھیں لوٹا دیں گے۔[2]

اہم بات یہ ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بیعت کے بارے میں عُمر نے اپنی رائے کیوں بدلی؟ میرا خیال یہ ہے کہ انھوں نے سنا تھا کہ بعض صحابہ ان کے مرنے کے بعد علی بن ابی طالبؑ سے بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بات انھیں قطعاً پسند نہیں تھی۔ عُمر کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اگر عُمر مرگئے تو میں فلاں شخص سے بیعت کرلوں گا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ وہ خود عُمر کے اپنے فعل سے استدلال کر رہا تھا۔ اس کہنے والے کا نام تو معلوم نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ

---

[1] ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ جلد ۱ صفحہ ۱۸۔

[2] صحیح مسلم جلد ۵ صفحہ ۷۵۔ صحیح بخاری جلد ۷، صفحہ ۹۔

یہ کبارِ صحابہ میں سے کوئی صاحب ہوں گے۔ یہ صاحب کہہ رہے تھے کہ "ابو بکر کی بیعت اچانک ہوئی تھی مگر مکمل ہوگئی۔ یعنی اگرچہ یہ بیعت مشورے کے بغیر اور دفعتاً ہوگئی تھی مگر یہ مکمل ہو کر ایک حقیقت بن گئی۔ اگر عمرؓ اس طرح ابو بکر سے بیعت کر سکتے تھے تو وہ خود کیوں فلاں سے اس طرح بیعت نہیں کر سکتے۔"

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ، عبدالرحمٰن بن عوف اور عمرؓ بن خطاب اس شخص کا نام نہیں لیتے جس نے یہ بات کہی تھی اور نہ اس شخص کا نام لیتے ہیں جن کی یہ بیعت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ یہ دونوں اشخاص مسلمانوں میں بڑی اہمیت رکھتے تھے، اس لیے عمرؓ یہ بات سن کر بہت بگڑے اور پہلے ہی جمعہ کو جو خطبہ دیا اس میں خلافت کا ذکر چھیڑ کر اپنی نئی رائے کا اظہار کیا، تاکہ جو صاحب پھر ایک بار اچانک بیعت کا ارادہ کر رہے تھے ان کا راستہ روکا جا سکے۔ کیونکہ اس بیعت کی صورت میں خلافت فریق مخالف کے ہاتھ میں جانے کا امکان تھا۔ اس کے علاوہ اس بحث کے بین السطور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی شخص کی انفرادی رائے نہیں تھی، یہ رائے بہت سے صحابہ کی تھی۔ اسی لیے بخاری کہتے ہیں:

> اس پر عمرؓ نے بگڑ کر کہا: میں انشاء اللہ شام کو تقریر کر کے لوگوں کو ان سے خبردار کر دوں گا جو ان کے معاملات پر ناجائز قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ عمرؓ کی رائے میں تبدیلی کی اصل وجہ ان لوگوں کی مخالفت تھی جو بقول ان کے لوگوں کے معاملات پر ناجائز قبضہ کرنا اور علیؑ کی بیعت کرنا چاہتے تھے اور یہ بات عمرؓ کے لیے ناقابل قبول تھی۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ خلافت لوگوں کے طے کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ علی بن ابی طالبؑ کا حق نہیں۔ لیکن اگر عمرؓ کا یہ خیال صحیح تھا تو رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انھوں نے خود لوگوں کا حق غصب کیوں کیا تھا اور مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر ابو بکر سے بیعت کرنے میں جلدی کیوں کی تھی؟

---

[1] صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۵۔

ابوحفص عُمر کا رویہ ابوالحسن علیؑ کے بارے میں سب کو معلوم ہے۔ عُمر کی کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو علیؑ کو حکومت سے دور رکھا جائے۔

یہ نتیجہ ہم نے صرف مذکورہ بالا خُطبے ہی سے اخذ نہیں کیا ہے بلکہ تاریخ کا تتبع کرنے والا ہر آدمی جانتا ہے کہ ابوبکر کے دورِ خلافت میں بھی عملاً عُمر بن خطاب ہی حکمراں تھے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ابوبکر نے اُسامہ سے اجازت مانگی تھی کہ عُمر کو ان کے پاس چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اُمورِ خلافت میں ان سے مدد لیتے رہیں۔[1] ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابوبکر، عُمر اور عُثمان کے پورے دور میں علی بن ابی طالبؑ کو ذمّہ داری کے عہدوں سے دُور رکھا گیا۔ نہ ان کو کوئی منصب دیا گیا، نہ کسی صوبے کا گورنر بنایا گیا، نہ کسی لشکر کا سالار مقرر کیا گیا اور نہ کوئی خزانہ ان کی تحویل میں دیا گیا۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ علی بن ابی طالبؑ کون تھے۔

تاریخ کی کتابوں میں اس سے زیادہ عجیب بات یہ لکھی ہے کہ عُمر کو مرنے کے قریب اس بات کا افسوس تھا کہ ابوعُبیدہ بن جرّاح یا حُذیفہ بن یمان کے آزاد کردہ غلام یا سر، ان دونوں میں سے کوئی اس وقت زندہ نہیں ورنہ وہ ان ہی میں سے کسی کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کر دیتے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ بعد میں انھیں خیال آیا کہ اس طرح کی بیعت کے بارے میں تو وہ اپنی رائے پہلے ہی بدل چکے ہیں، اس لیے ضروری ہوا کہ بیعت کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا جائے جس کو درمیانی حل قرار دیا جا سکے، جس میں نہ تو کوئی فردِ واحد اس کی بیعت کرلے جس کو وہ اپنی ذاتی رائے میں مناسب سمجھتا ہو اور پھر دوسروں کو آمادہ کرے کہ وہ بھی اس کی پیروی کریں جیسا کہ خود عُمر نے ابوبکر کی بیعت کے وقت کیا تھا — یا جس طرح ابوبکر نے اپنے بعد خلافت کے لیے عُمر کو نامزد کر دیا تھا — یا جیسا کہ ان صاحب کا ارادہ تھا جو حضرت عُمر کی موت کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اپنے پسندیدہ شخص کی بیعت کر سکیں، لیکن عُمر نے پیش بندی کر کے ان کے

---

[1] ابنِ سَعد نے طبقات میں اس کی تصریح کی ہے۔ دوسرے مؤرّخین نے بھی جنھوں نے سریۂ اُسامہ بن زید کا ذکر کیا ہے، اس بات کو بیان کیا ہے۔

منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا۔ نہ ہی عمرؓ کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ خلافت کے معاملے کا تصفیہ مسلمانوں کے شوریٰ پر چھوڑ دیتے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد سقیفہ میں کیسے کیسے اختلاف پیدا ہو گئے تھے اور کس طرح کشت و خون کی نوبت آتے آتے رہ گئی تھی۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے بالآخر اصحابِ شوریٰ کا اصول وضع کیا اور اس اصول کے تحت ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی جس کو خلیفہ کے انتخاب کا مکمل اختیار تھا اور اس کمیٹی کے ارکان کے علاوہ مسلمانوں میں سے کسی کو اس معاملے میں دخل دینے کا حق نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ ان چھ ارکان میں بھی اختلاف پیدا ہونا ناگزیر ہے اس لیے انھوں نے ہدایت جاری کی کہ اختلاف کی صورت میں اس فریق کا ساتھ دیا جائے جس میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں، خواہ یہ ارکان تین تین کے دو مساوی گروہوں میں تقسیم ہو جائیں اور اس گروہ کو قتل ہی کر دینا پڑے جو عبدالرحمٰن بن عوف کے خلاف ہو۔

لیکن عمرؓ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ سعد بن ابی وقاص عبدالرحمٰن بن عوف کے چچازاد بھائی تھے اور ان دونوں کا تعلق قبیلہ بنی زہرہ سے تھا۔

عمر کو یہ بھی معلوم تھا کہ سعد بن ابی وقاص علیؑ سے خوش نہیں، ان کے دل میں علیؑ کی طرف سے بُغض ہے کیونکہ علیؑ نے ان کی ننھیال عبدِ شمس کے بعض افراد کو غزوات میں قتل کیا تھا۔

عمرؓ کو یہ بھی معلوم تھا کہ عبدالرحمٰن بن عوف عثمان کے بہنوئی ہیں کیونکہ ان کی بیوی اُمّ کلثوم عثمان کی بہن ہیں۔

عمر یہ بھی جانتے تھے کہ طلحہ کا بھی جھکاؤ عثمان کی طرف ہے۔ بعض راویوں نے ان دونوں کے درمیان تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ عثمان کی طرف طلحہ کے جھکاؤ کا ایک سبب یہ تھا کہ طلحہ علیؑ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ طلحہ تیمی تھے اور حضرت ابوبکر کے منصبِ خلافت پر فائز ہو جانے کے بعد سے بنی ہاشم اور بنی تیم کے تعلقات ناخوشگوار ہو گئے تھے۔[1]

---

[1] شیخ محمد عبدہ، شرح نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۸۸۔

حضرت عمرؓ کو یہ سب معلوم تھا اور انھی باتوں کے پیش انھوں نے خاص طور پر ان چھ افراد کا انتخاب کیا تھا، جو سب کے سب مہاجر اور قریشی تھے، کوئی بھی انصار میں سے نہیں تھا۔ ان میں سے ہر ایک کسی ایسے قبیلے کی نمائندگی کرتا تھا جس کی اپنی اہمیت تھی اور اپنا اثر ورسوخ تھا۔

۱ - علی بن ابی طالب - بنی ہاشم کے بزرگ

۲ - عثمان بن عفّان - بنی اُمیّہ کے بزرگ

۳ - عبدالرحمٰن بن عوف - بنی زُہرہ کے بزرگ

۴ - طلحہ بن عُبیداللہ - بنی تیم کے بزرگ

۵ - سَعد بن ابی وقّاص - ان کا تعلّق بھی بنی زُہرہ سے تھا۔ ننھیال بنی اُمیہ تھی۔

۶ - زُبیر بن العوّام - رسول اللہؐ کی پھوپھی صفیہ کے صاجزادے اور اسماء بنت ابی بکر کے شوہر۔

یہ تھے وہ زُعماء اور اربابِ حلّ وعقد جن کا فیصلہ سب مسلمانوں کے لیے واجبُ العمل تھا، خواہ وہ مسلمان مدینے کے باشندے ہوں یا دُنیائے اسلام میں کسی اور جگہ کے۔ مسلمانوں کا کام چُون وچرا کے بغیر حکم کی تعمیل تھا۔ اگر کوئی تعمیل حکم نہ کرتا تو پھر اس کا خُون مُعاف تھا۔ یہ تھے وہ حالات جو ہم قاری کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے، بالخصوص اس مقصد سے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ نصِّ غدیر کے سلسلے میں خاموشی کیوں اختیار کی گئی تھی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ کو ان چھ افراد کے خیالات اور ان کے طبعی رُجحانات کا علم تھا تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انھوں نے اپنی طرف سے عُثمان بن عفّان کو خلافت کے نامزد کر دیا تھا، یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ انھیں پہلے سے علم تھا کہ یہ چھ رکنی کمیٹی علی بن ابی طالبؑ کے حق میں فیصلہ نہیں دے گی۔

یہاں میں ذرا رُک کر اہلِ سُنّت اور ان سب لوگوں سے جو شُوریٰ اور آزادیٔ خیال کے اُصول پر فخر کرتے ہیں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ شُوریٰ کے اُصول میں اور اس نظریے میں جو حضرت عمرؓ نے ایجاد کیا تھا کیسے ہم آہنگی پیدا کریں گے کیونکہ اس چھ رکنی کمیٹی کو مسلمانوں نے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنی ذاتی رائے سے منتخب اور مقرر

کیا تھا- اس صورت میں ہمیں کم از کم یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس نظریے کے مطابق اسلام میں حکومت کا نظام جمہوری نہیں ہے جیسا کہ شوریٰ اور انتخاب کے حامی فخریہ دعویٰ کرتے ہیں -

اِس بُنیاد پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاید عُمر شوریٰ کے قائل ہی نہیں تھے وہ خلافت کو صرف مُہاجرین کا حق سمجھتے تھے ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حضرت ابُوبکر کی طرح ان کا خیال یہ تھا خلافت صِرف قریش سے مخصوص ہے کیونکہ مُہاجرین میں تو بہت سے غیر قریشی بھی تھے بلکہ غیر عرب بھی تھے- اس لیے سلمان فارسی (رض) عمّار بن یاسر (رض)، بلالِ حبشی (رض)، صُہیبِ رُومی (رض)، ابُوذرِ غِفاری (رض) اور ہزاروں دُوسرے صحابہ جو قریشی نہیں تھے، انھیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ خلافت کے معاملے میں کچھ بولیں -

یہ محض دعویٰ نہیں -حَاشَا وَکَلَّا ! یہ ان کا عقیدہ تھا جو ان ہی کی زبانی تاریخ اور حدیث میں محفوظ ہے- آیئے ، اس خُطبے کو دوبارہ دیکھیں جو بُخاری اور مُسلم نے اپنی صحیحین میں قلمبند کیا ہے :

> عُمر بن خطّاب کہتے ہیں کہ : میرا ارادہ بولنے کا تھا- میں نے ایک تقریر جو مجھے اچھّی لگی تیار کر لی تھی- یہ تقریر میں ابُوبکر سے پہلے کرنا چاہتا تھا- میں کسی حد تک ہوشیاری سے کام لے رہا تھا- جب میں نے بولنا چاہا ، ابُوبکر نے کہا : ٹھہرو ! میں خاموش ہو گیا کیونکہ میں ابوبکر کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا- اس کے بعد ابُوبکر نے خود تقریر کی- وہ میری نسبت زیادہ متانت اور وقار سے بولے - میری تیار کی ہوئی تقریر میں کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو مجھے اچھا لگتا ہو ، اور ابُوبکر نے فِی البَدِیَہ وہی لفظ یا اس سے بہتر لفظ استعمال نہ کیا ہو- ابوبکر نے انصار کو مخاطب کر کے کہا : تم نے جو اپنے فضَائل و مَحَاسِن بیان کیے ہیں واقعی تم ان کے مستحق ہو ، لیکن جہاں تک اس معاملہ

کا تعلق ہے یہ قریش کا حق ہے[1]

اِس سے معلوم ہوا کہ ابوبکر اور عمرؓ شوریٰ اور آزادیٔ اظہار کے اصول کے قائل نہیں تھے۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ ابوبکر نے اپنی تائید میں انصار کے سامنے یہ حدیث نبوی پیش کی کہ اَلْخِلَافَۃُ فِیْ قُرَیْشٍ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صحیح حدیث ہے، لیکن اس کی اصل وہ حدیث ہے جو بخاری، مسلم اور سنی اور شیعہ تمام حدیث کی مستند کتابوں کی متفقہ روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

اَلْخُلَفَاءُ مِنْ بَعْدِی اثْنَا عَشَرَ کُلُّھُمْ مِّنْ قُرَیْشٍ

میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے جو سب قریش میں سے ہوں گے۔

اس سے بھی زیادہ واضح یہ حدیث ہے:

لَا یَزَالُ ھٰذَا الْاَمْرُ فِیْ قُرَیْشٍ مَّا بَقِیَ مِنَ النَّاسِ اثْنَانِ۔

یہ چیز قریش ہی میں رہے گی جب تک دو آدمی بھی باقی ہیں۔[2]

ایک اور حدیث ہے کہ

اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِّقُرَیْشٍ فِی الْخَیْرِ وَالشَّرِّ[3]

سب لوگ قریش کے تابع ہیں بھلائی میں بھی، برائی میں بھی۔

جب سب مسلمان ان احادیث پر یقین رکھتے ہیں تو کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے خلافت کا معاملہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ باہمی مشورے سے جسے چاہیں خلیفہ منتخب کرلیں، آپ ہی انصاف سے بتائیں کیا یہ تضاد نہیں؟

اِس تضاد سے چھٹکارا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم ائمہ اہلِ بیت

---

[1] صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۷ - صحیح مسلم باب الوصیہ۔

[2] صحیح بخاری کتاب الاحکام باب الامراء من قریش۔

[3] صحیح مسلم جلد ۶ کتاب الامارہ

ان کے شیعہ اور بعض علمائے اہلِ سُنّت کا یہ قول تسلیم کرلیں کہ جناب رسول اللہ ص نے خود خُلفاء کے ناموں اور ان کی تعداد کی تصریح کردی تھی۔ اس طرح ہم عُمر کا موقف بھی بہتر طور پر سمجھ سکیں گے جو ان کے اپنے اجتہاد پر مبنی تھا۔ وہ نصّ کو علیؑ کے حق میں جو قریش میں سب سے چھوٹے تھے، قبول کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ مذکورہ بالا حدیث کا اطلاق عمومی طور پر سب قریش پر کرتے تھے۔

اِسی وجہ سے انھوں نے اپنے مرنے سے قبل چھ ممتاز قریشیوں کی ایک کمیٹی قائم کی تھی تاکہ احادیث نبوی کے درمیان اور ان کی اپنی اس رائے کے درمیان کہ خلافت پر صرف قریش کا حق ہے، ہم آہنگی پیدا کرسکیں۔

اِس کے باوجود کہ یہ پہلے سے معلوم تھا کہ اس کمیٹی کے ارکان علیؑ کا انتخاب نہیں کریں گے، پھر بھی علیؑ کو اس کمیٹی میں شامل کرنا شاید اس کی ایک تدبیر تھی کہ علیؑ کو مجبور کیا جائے کہ وہ بھی آجکل کی اصطلاح کے مطابق سیاست کے کھیل میں شامل ہوجائیں تاکہ ان کے شیعوں اور حامیوں کے پاس جو ان کی اوّلیت کے قائل ہیں کوئی دلیل باقی نہ رہے۔

لیکن امام علیؑ نے اپنے ایک خُطبہ میں عوام کے سامنے اس پر گفتگو کی۔ آپ نے کہا:

> میں نے بہت دن صبر کیا اور بہت تکلیف اٹھائی۔ آخر جب وہ (خلیفہ) دُنیا سے جانے لگا تو معاملہ ایک جماعت کے ہاتھ میں سونپ گیا اور مجھے بھی اس جماعت کا ایک فرد خیال کیا، جبکہ واللہ مجھے اس شوریٰ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ان میں کے پہلے صاحب (ابُوبکر) کی نسبت میری فضیلت میں شک ہی کب تھا جو اَب ان لوگوں نے مجھے اپنے جیسا سمجھ لیا ہے؟ (لیکن میں جی کڑا کرکے شوریٰ میں حاضر ہوگیا) اور نشیب وفراز میں ان کے ساتھ ساتھ چلا مگر ان میں سے ایک نے بُغض وحَسَد کے مارے میرا ساتھ نہ دیا اور دُوسرا دامادی اور ناگفتہ بہ باتوں کی وجہ سے ادھر جُھک گیا[1]

---

[1] شیخ محمد عبدُہ، شرح نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۸۷۔

چوتھی بات یہ ہے کہ امام علیؑ نے ہر دلیل پیش کی لیکن بے سُود۔ کیا امام علیؑ ان لوگوں سے بیعت کی بھیک مانگتے جنھوں نے ان سے مُنہ پھیر لیا تھا، اور جن کے دِل دُوسرے کی طرف جھک گئے تھے۔ اور جو امام علیؑ سے اِس لیے حسَد کرتے تھے کہ ان پر اللہ کا فضل تھا یا اس لیے بُغض رکھتے تھے کہ امام علیؑ نے ان کے سرداروں کو قتل کیا تھا، ان کے بہادروں کو کُچل دیا تھا، ان کی عزّت خاک میں ملادی تھی، ان کو نیچا دکھایا تھا، ان کا غرُور اپنی تلوار اور اپنی بہادری سے توڑ دیا تھا، یہاں تک کہ وہ اسلام لانے اور اطاعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس پر بھی علیؑ سربلند تھے اور اپنے ابنِ عمّ کا دفاع کرتے تھے۔ انھیں اللہ کے راستے میں کسی کی ملامت کی پروا نہیں تھی۔ دنیا کی کوئی شے ان کے عزم کو مُتزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ رسول اللہؐ کو اس کا بخوبی علم تھا اور وہ ہر موقع پر اپنے چچازاد بھائی کے فضائل و محاسن بیان کیا کرتے تھے۔ کبھی فرماتے:

حُبُّ عَلِیٍّ اِیمَانٌ وَّبُغضُہٗ نِفَاقٌ [1]

علیؑ کی محبّت ایمان اور علیؑ سے بُغض نِفاق ہے۔

کبھی کہتے:

عَلِیٌّ مِّنِّیْ وَ اَنَا مِنْ عَلِیٍّ [2]

علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے۔

کبھی کہتے:

عَلِیٌّ وَّلِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِیْ [3]

علیؑ میرے بعد ہر مُومن کے سرپرست ہیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا:

عَلِیٌّ بَابُ مَدِیْنَۃِ عِلْمِیْ وَ اَبُوْ وَلَدِیْ [4]

---

[1] صحیح مُسلم جلد ۱ صفحہ ۴۸، ۱۱ - مُستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۶۔

[2] صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۱۶۸۔

[3] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۵ - مُستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۴۔ [4] مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۶۔

علیؑ میرے شہر علم کا دروازہ اور میرے بچّے کے باپ ہیں۔

آپ نے فرمایا :

عَلِيٌّ سَيِّدُ الْمُسْلِمِيْنَ وَ إِمَامُ الْمُتَّقِيْنَ وَقَائِدُ الْغُرِّ الْمُحَجَّلِيْنَ .[1]

علیؑ مسلمانوں کے سردار، مُتّقیوں کے پیشوا اور ان لوگوں کے سالار ہیں جو روزِ قیامت سُرخرو ہوں گے۔

لیکن افسوس کہ اس سب کے باوجود ان لوگوں کا حَسَد اور بُغض بڑھتا ہی گیا اس لیے اپنی وفات سے چند روز قبل رسول اللہؐ نے علیؑ کو بُلا کر گلے سے لگایا اور روتے ہوئے کہا :

علیؑ ! میں جانتا ہوں کہ لوگوں کے سینوں میں تمھاری طرف سے جو بُغض ہے وہ میرے بعد کھُل کر سامنے آجاتے گا۔ لہٰذا اگر تم سے بیعت کریں تو قبول کر لینا ورنہ صبر کرنا، یہاں تک کہ تم مظلوم ہی میرے پاس آجاؤ ۔[2]

پس اگر ابُوالحسنؑ نے ابوبکر کی جبری بیعت کے بعد صبر کیا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہؐ نے انھیں وصیّت کی تھی ۔ اس کی مَصلحت صاف ظاہر ہے۔

پانچویں بات یہ کہ پچھلی باتوں کے ساتھ ایک اور بات کا اضافہ کر لیجیے ۔ مسلمان جب قرآن کریم پڑھتا ہے اور اس کی آیات پر غور کرتا ہے، تو اسے ان قرآنی قصّوں سے جن میں پہلی اُمّتوں کا ذکر ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ہم سے بھی زیادہ ناخُوشگوار واقعات پیش آئے۔

یہ دیکھیے !

* قابیلؔ نے اپنے بھائی ہابیلؔ کو سفّاکی سے قتل کر دیا۔
* جَدّ الانبیاء حضرت نوحؑ کی ہزار سالہ کوشش کے بعد بھی بہت کم لوگ ان پر

---

[1] شیخ مُتّقی ہندی ، مُنتخب کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۳۴

[2] مُحبّ طبری ، الریاض النضرہ ، باب فضائلِ علی بن ابی طالبؑ ۔

ایمان لائے۔ ان کا اپنا بیٹا اور بیوی تک کافر تھے۔

* حضرت لوطؑ کے گاؤں میں صرف ایک ہی گھر مومنین کا تھا۔
* فراعنہ جنھوں نے دنیا میں کبریائی کا دعویٰ کیا اور لوگوں کو اپنا غلام بنایا ان کے یہاں صرف ایک فرد مومن تھا، وہ بھی تقیہّ کیے ہوئے تھا یعنی اپنے ایمان کو چھپاتے ہوتے تھا۔
* حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کو دیکھیے، انھوں نے حسد کی وجہ سے اپنے بے قصور بھائی کے قتل کی سازش کی اور اسے محض اس لیے قتل کرنا چاہا کہ وہ ان کے باپ حضرت یعقوبؑ کو زیادہ محبوب تھا۔
* اور یہ بنی اسرائیل ہیں، انھیں اللہ نے حضرت موسیٰؑ کے ذریعے نجات دلائی، ان کے لیے سمندر کے پانی کو پھاڑ دیا۔ انھیں جہاد کی تکلیف بھی نہیں اٹھانی پڑی اور اللہ نے ان کے دشمنوں، فرعون اور اس کے لشکریوں کو ڈبو دیا۔ مگر ہوا کیا؟ ابھی سمندر سے باہر نکل کر ان کے پاؤں سوکھے بھی نہیں تھے کہ یہ ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو بتوں کی پوجا کرتی تھی تو کہنے لگے: "موسیٰ! جیسے ان کے دیوتا ہیں، ویسا ہی ایک دیوتا ہمارے لیے بھی بنادو۔ موسیٰؑ نے کہا: تم تو جاہل لوگ ہو۔ اور جب موسیٰؑ اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئے اور اپنی عدم موجودگی میں اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا قائم مقام مقرر کر گئے تو لوگوں نے ان کے خلاف سازش کی اور قریب تھا کہ انھیں مار ڈالتے۔ یہی نہیں انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایک بچھڑے کی پوجا شروع کردی۔ اس قوم کے لوگوں نے بہت سے انبیاء کو قتل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ.

کیا ایسا نہیں ہوا ہے کہ جب کبھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ کچھ لایا جو تمھیں پسند نہیں تھا تو تم نے سرکشی اختیار کی اور کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو قتل کردیا؟ (سورۂ بقرہ - آیت ۸۷)

* حضرت یحیٰی کو دیکھیے! وہ نبی تھے، پاک دامن تھے اور نیک تھے انھیں قتل کیا گیا اور ان کا سر تحفہ کے طور پر بنی اسرائیل کی ایک رنڈی کو بھیج دیا۔
* یہود و نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے اور صلیب پر چڑھانے کی سازش کی۔

خود اس اُمّتِ محمدیہ نے تیس ہزار کا لشکر رسول اللہؐ کے لختِ جگر اور اہلِ جنّت کے سردار امام حسینؑ کو قتل کرنے کے لیے تیار کیا۔ حالانکہ ان کے ساتھ فقط ستّر بہتّر اصحاب تھے۔ لیکن ان لوگوں نے امام حُسینؑ اور ان کے سب اصحاب کو قتل کر دیا۔ حد یہ ہے کہ امامؑ کے دُودھ پیتے بچے تک کو نہ چھوڑا۔

اس کے بعد حیرت کی کون سی بات باقی رہ جاتی ہے؟ رسول اللہؐ نے خود اپنے اصحاب سے فرمایا تھا:

> تم جلد اپنے سے پہلوں کے طور طریقوں پر چلو گے۔ تم وَجَب بہ وَجَب اور ذِراع بہ ذِراع یعنی ہُو بہُو ان کا اتباع کرو گے۔ اگر وہ گوہ کے بھٹ میں گھُسے ہوں گے تو تم بھی اس میں گھُس جاؤ گے
>
> صحابہ نے پُوچھا: کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ سے ہے؟
> آپ نے فرمایا: تو اور کِس سے؟ [1]

حیرت کیسی! ہم خود بُخاری و مُسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ قول پڑھتے ہیں:

> قیامت کے دن میرے اصحاب کو بائیں طرف لایا جائے گا تو میں پُوچھوں گا: انھیں کدھر لے جا رہے ہو؟ کہا جائے گا: جہنّم کی طرف۔ میں کہوں گا: اے میرے پروردگار! یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ کہا جائے گا: آپ کو معلوم نہیں، انھوں نے آپ کے بعد دین میں بِدعت پیدا کی۔ میں کہوں گا: دور ہو وہ جس نے

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۴ صفحہ ۱۴۴ و جلد ۸ صفحہ ۱۵۱

میرے بعد دین میں تبدیلی کی۔ میں دیکھتا ہوں کہ ان میں سے بہت ہی کم نجات پائیں گے۔[1]

ایک اور حدیث ہے کہ

میری اُمّت تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی جو سب کے سب جہنّم میں جائیں گے سوائے ایک کے۔[2]

سچ کہا اللہ ربّ العزّت نے جو دِلوں کے بھید جاننے والا ہے وہ فرماتا ہے:

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ.

گو آپ کا کیسا ہی جی چاہے، اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔ (سورۂ یوسف - آیت ۱۰۳)

بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ.

بلکہ یہ رسولؐ ان کے پاس حق لے کر آئے لیکن ان میں سے بیشتر حق کو ناپسند کرتے ہیں۔ (سورۂ مومنون - آیت ۷۰)

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ.

ہم نے حق تم تک پہنچا دیا لیکن تم میں سے اکثر حق سے بیزار ہیں۔ (سورۂ زخرف - آیت ۷۸)

اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ.

یاد رکھو! اللہ کا وعدہ سچّا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سورۂ یونس - آیت ۵۵)

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ.

تمھیں باتوں سے خوش کرتے ہیں اور دِل ان کے انکاری ہیں اور زیادہ تر ان میں بدعمل ہیں۔ (سورۂ توبہ - آیت ۸)

---

[1] صحیح بخاری جلد ۷ صفحہ ۲۰۹ - صحیح مسلم، باب الحوض۔

[2] سُنن ابن ماجہ، کتابُ الفتن - مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۱۲۰ - جامع ترمذی کتابُ الایمان۔

اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ.

بے شک اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔ (سورۂ یونس۔آیت ۶۰)

یَعْرِفُوْنَ نِعْمَةَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَھَا وَ اَکْثَرُھُمُ الْکَافِرُوْنَ.

یہ لوگ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور اکثر ان میں سے کافر ہیں۔ (سورۂ نحل۔آیت ۸۳)

وَلَقَدْ صَرَّفْنَاہُ بَیْنَھُمْ لِیَذَّکَّرُوْا فَاَبٰٓی اَکْثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوْرًا.

ہم اس (پانی) کو ان کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔ تاہم اکثر لوگ ناشکرے ہوتے بغیر نہیں رہتے۔

(سورۂ فرقان ۔ آیت ۵۰)

وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ۔

ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں پھر بھی شرک کیے جاتے ہیں۔ (سورۂ یوسف ۔آیت ۱۰۶)

بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ.

لیکن اکثر لوگ حق سے ناواقف ہیں اس لیے اس سے رُوگردانی کرتے ہیں۔ سورۂ انبیاء۔آیت ۲۴)

اَفَمِنْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَکُوْنَ وَلَا تَبْکُوْنَ وَ اَنْتُمْ سَامِدُوْنَ.

کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور روتے نہیں، تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ (سورۂ نجم ۔آیات ۵۹ تا ۶۱)

حسرت و افسوس

یہ واقعات پڑھ کر نہ صرف مجھے بلکہ ہر مسلمان کو افسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے امام علیؑ کو خلافت سے دُور رکھ کر اپنا کتنا بڑا نقصان کر دیا۔ اُمّت نہ صرف ان کی حکیمانہ قیادت سے محروم ہو گئی بلکہ ان کے عُلوم کے بحرِ ذخّار سے بھی صحیح معنیٰ میں اِستفادہ نہ کر سکی۔

اگر مُسلمان تعصّب اور جذباتیت سے بالاتر ہو کر دیکھیں تو انھیں صاف نظر آئیگا کہ رسولِ اعظمؐ کے بعد علیؑ ہی اَعلَمُ النَّاس ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ عُلمائے صحابہ جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تھی تو حضرت علیؑ ہی کی طرف رُجوع کرتے تھے اور آپ فتویٰ دے کر ان کی مشکل کُشائی فرماتے تھے۔ عُمر بن خطّاب تو اکثر کہا کرتے تھے:

لَوْ لَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُ.

اگر علیؑ نہ ہوتے تو عُمر ہلاک ہو گیا ہوتا[1]

یہ بھی یاد رہے کہ خُود امام علی علیہ السلام نے کبھی کسی صحابی سے کچھ بھی نہیں پُوچھا۔

تاریخ مُعتَرِف ہے کہ علی بن ابی طالبؑ صحابہ میں سب سے زیادہ بہادر اور سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ کئی موقعوں پر ایسا ہوا کہ دشمن نے پیش قدمی کی تو بہادر صحابہ بھی بھاگ کھڑے ہوتے لیکن امام علیؑ ہر موقع پر ثابت قدم رہے۔ اِس کی دلیل کے لیے وہ امتیازی سند کافی ہے جو رسول اللہؐ نے اس

---

[1] (۱) صحیح بُخاری کتاب المحَارِبین، باب لا یُرجَمُ المجنون (۲) سُنن ابی داؤد باب مجنون یَسرِق صفحہ ۱۴۷ (۳) مسند احمد بن حنبل جلد ا صفحہ ۱۴۰ و ۱۵۴ (۴) موطا امام مالک بن انس کتابُ الاَشرِبہ صفحہ ۱۸۶ (۵) مسند شافعی کتاب الاشربہ صفحہ ۱۶۶ (۶) کنز العمال ملّا علاء الدین متّقی جلد ۳ صفحہ ۹۵ (۷) مُستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۳۷۵ (۸) دُرِّ منثور سورۂ مائدہ آیتِ خَمر (۹) سُنن دارقطنی کتابُ الحدود (۱۰) شرح معانی الآثار طحاوی کتابُ القضاء صفحہ ۲۹۴۔

وقت عطا فرمائی جب آپ نے یہ کہا کہ

کل میں اس شخص کو عَلَم دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبّت رکھتا ہے اور اللہ اور رسولؐ اس سے محبّت رکھتے ہیں۔ جو آگے بڑھ کر حملہ کرنے والا ہے، پیٹھ دکھانے والا نہیں! اللہ نے اس کے دل کو ایمان کے لیے جانچ لیا ہے۔

سب صحابہ کی نظریں عَلَم پر لگی تھیں مگر رسول اللہؐ نے عَلَم علی بن ابی طالبؑ کو عطا فرما دیا۔[1]

مختصر یہ کہ علم و حکمت اور قوّت و شجاعت امام علیؑ کی ایسی خصوصیات ہیں جن سے شیعہ و سُنّی سب ہی واقف ہیں اور اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں[2] نصِ غدیر سے قطع نظر جس سے امام علیؑ کی امامت ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم قیادت و امامت کا مستحق صرف عالم، شجاع اور قوی کو قرار دیتا ہے۔ عُلماء کی پیروی واجب ہونے کے بارے میں اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَفَمَنْ يَّهْدِیْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ.

کیا وہ شخص جو حق کا راستہ دکھائے زیادہ مُستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو اس وقت تک راستہ نہیں دکھا سکتا جب تک خود اسے راستہ نہ دکھایا جائے۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ (سورۂ یُونس - آیت ۳۵)

بہادر اور جری کی قیادت کے واجبُ الاتباع ہونے کے بارے میں قرآن کریم میں ہے:

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۴ صفحہ ۵ و صفحہ ۱۲ - جلد ۵ صفحہ ۷۶-۷۷ - صحیح مُسلم جلد ۷ صفحہ ۱۲۱

[2] بقول بوعلی سینا:- علیؑ صحابہ میں ایسے ہیں جیسے محسوس ہیں معقول (یعنی جیسے جسم میں رُوح) (ناشر)

اللّٰہَ اصْطَفَاہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَ
الْجِسْمِ وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ
عَلِیْمٌ.

وہ کہنے لگے: اسے ہم پر حکمرانی کا حق کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ بہ نسبت اس کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور اس کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی۔ پیغمبر نے جواب میں کہا: اول تو اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہارے مقابلے میں منتخب فرمایا ہے دوسرے یہ کہ علم اور جسامت دونوں میں اللہ نے اس کو زیادتی دی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وسعت دینے والا، جاننے والا ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۴۷)

اللہ تعالیٰ نے امام علیؑ کو بہ نسبت دوسرے صحابہ کے علم میں بڑی وسعت عطا کی تھی اور وہ صحیح معنیٰ میں شہرِ علم کا دروازہ تھے۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صحابہ ان ہی سے رجوع کرتے تھے۔ صحابہ کو جب کوئی ایسا مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تھا جسے وہ حل نہیں کرپاتے تھے تو کہا کرتے تھے:

مُعْضِلَۃٌ وَّلَیْسَ لَھَا اِلَّا اَبُو الْحَسَنِ.

یہ وہ مشکل ہے جسے ابوالحسنؑ کے سوا کوئی حل نہیں کرسکتا۔[1]

امام علیؑ کو اللہ تعالیٰ نے جسم میں بھی وسعت عطا فرمائی تھی بایں معنیٰ کہ وہ واقعی اَسَدُاللّٰہِ الْغَالِب تھے۔ ان کی قوت و شجاعت صدیوں سے زبان زدِ خاص و عام ہے۔ مؤرخین نے ان کی قوت و شجاعت کی ایسی داستانیں رقم کی ہیں جو معجزہ سے کم نہیں۔ مثلاً:

- بابِ خیبر کو اکھاڑنا جسے بعد میں ۲۰ صحابی مل کر ہلا بھی نہ سکے[2]
- کعبے کی چھت پر سے بڑے بت ہُبل کو اکھاڑنا[3] اور
- اس مضبوط چٹان کو الٹ دینا جسے پورا لشکر بھی نہیں ہلا سکتا تھا[4]

---

[1] مناقب الخوارزمی صفحہ ۵۸۔ تذکرۃ السبط صفحہ ۸۷۔ ابن مغازلی ترجمہ علیؑ صفحہ ۷۹ [2] تا [4] شرح نہج البلاغہ۔

جب بھی موقع ہوتا رسول اللہؐ اپنے چچازاد بھائی کی خوبیاں اور فضائل بیان فرماتے اور لوگوں کو ان کی خصوصیات اور امتیازات سے باخبر کرتے رہتے تھے۔
کبھی فرماتے:

اِنَّ ھٰذَا اَخِیْ وَ وَصِیِّیْ وَخَلِیْفَتِیْ مِنْ بَعْدِیْ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْهُ.

یہ میرے بھائی، میرے وصی اور میرے بعد میرے خلیفہ ہیں اس لیے ان کی بات سنو اور جو کچھ وہ کہیں اس پر عمل کرو۔[1]
کبھی فرماتے:

اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ ھَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ.

یعنی جو نسبت ہارون کو موسیٰ سے تھی وہی نسبت تمھیں مجھ سے ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔[2]
کبھی فرماتے:

مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّحْیَا حَیَاتِیْ وَیَمُوْتَ مَمَاتِیْ وَیَسْکُنَ جَنَّةَ الْخُلْدِ الَّتِیْ وَعَدَنِیْ رَبِّیْ فَلْیُوَالِ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ فَاِنَّهٗ لَنْ یُّخْرِجَکُمْ مِّنْ ھُدًی وَلَنْ یُّدْخِلَکُمْ فِیْ ضَلَالَةٍ

جو کوئی یہ چاہتا ہے کہ میری طرح جیے اور میری موت مرے اور خلدِ بریں میں رہے جس کا مجھ سے میرے پروردگار نے وعدہ کیا ہے اسے چاہیے کہ علی بن ابی طالبؑ کا دوست بن جائے کیونکہ علیؑ تمھیں کبھی ہدایت کے دائرہ سے خارج نہیں کریں گے اور نہ کبھی گمراہی کے دائرے میں داخل کریں گے۔[3]

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک جلد ۲ صفحہ ۳۱۹۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ جلد ۲ صفحہ ۶۲۔
[2] صحیح بخاری باب فضائل علیؑ۔ صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۱۲۰۔
[3] مستدرکِ حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۸۔ طبرانی، معجم کبیر۔

سیرتِ رسولؐ کا تتبّع کرنے والے کو معلوم ہو گا کہ رسول اللہؐ نے کبھی صرف اقوال پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان اقوال پر عمل بھی کر کے دکھایا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی زندگی میں کسی صحابی کو علیؑ پر امیر مقرر نہیں فرمایا جب کہ دُوسرے صحابہ ایک دوسرے پر امیر مقرر ہوتے رہتے تھے۔ غزوۂ ذات السّلاسل میں ابُوبکر اور عُمر پر عمرو بن عاص کو امیر مقرر فرمایا تھا[1]۔

اسی طرح آپ نے تمام کبارِ صحابہ پر ایک کم عُمر نوجوان اُسامہ بن زید کو اپنی وفات سے کچھ قبل امیر مقرر فرما دیا تھا۔ مگر علی بن ابی طالبؑ کو جب بھی کسی دستہ کے ساتھ بھیجا آپ ہی امیر ہوئے۔

ایک مرتبہ آپ نے دو دستے روانہ فرمائے ایک کا امیر علی کو بنایا اور دوسرے کا خالد بن ولید کو۔ اس موقع پر آپ نے کہا کہ اگر تم دونوں الگ الگ رہو تو تم میں سے ہر ایک اپنے لشکر کا امیر ہے لیکن اگر اکٹھے ہو جاؤ تو علیؑ پُورے لشکر کے سالار ہوں گے۔

اِس تمام بحث سے ہمارے نزدیک یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد علیؑ ہی مومنین کے ولی ہیں اور کسی کو ان سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔

لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے اس سلسلے میں سخت نقصان اُٹھایا اور آج تک اٹھا رہے ہیں کیونکہ اس وقت جو بویا تھا اسی کا پھل کاٹ رہے ہیں۔ اگلوں نے جو بنیاد رکھی تھی پچھلوں نے اس کا انجام دیکھ لیا!

کیا علیؑ کی خلافت سے بہتر خلافتِ راشدہ کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اس بارے میں جو پسند کیا تھا اگر مسلمان اس کا اتباع کرتے تو علیؑ ایک ہی طریقے پر اس امت کی قیادت تیس سال تک بالکل اسی طرح کر سکتے تھے جیسے رسول اللہؐ نے کی تھی۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ ابُوبکر اور عُمر نے متعدد موقعوں پر اپنی رائے سے اجتہاد کیا اور بعد میں ان کا اجتہاد بھی ایسی سُنّت بن گیا جس کی پیروی ضروری خیال کی جانے لگی تھی۔ جب عُثمان خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اور بھی

---

[1] سیرۃ حلبیہ، غزوۂ ذات السلاسل۔ ابنِ سعد، طبقات کبریٰ

زیادہ تبدیلیاں کیں - بلکہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تو کتابُ اللہ، سُنّتِ رسول اللہ ص اور سُنّتِ شیخین سب کو بدل دیا- اس پر صحابہ نے اعتراض بھی کیا، اور بالآخر ایک عوامی انقلاب میں خُود ان کی جان بھی گئی لیکن اس سے اُمّت میں ایسا فتنہ پیدا ہوا کہ آج تک اس کے زخم مُندمل نہیں ہو سکے۔

اس کے برخلاف علیؑ سختی سے قرآن و سُنّت کی پابندی کرتے تھے اور ان سے سرِ مُو انحراف کے لیے تیار نہیں تھے- اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جب ان پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ ص کے ساتھ سُنّتِ شیخین کا بھی اتباع کریں گے۔

پُوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ علیؑ کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ ص کی پابندی پر اس قدر زور کیوں دیتے تھے جب کہ ابُوبکر، عُمر اور عُثمان اجتہاد اور تغییر پر مجبور ہو گئے تھے؟

اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ علیؑ کے پاس وہ علم تھا جو اور کسی کے پاس نہیں تھا- رسول اللہ ص نے انھیں خاص طور پر علم کے ہزار دروازوں سے ممتاز فرمایا تھا اور ان ہزار دروازوں میں سے ہر ایک سے ہزار اور دروازے کھلتے تھے[1] رسول اللہ ص نے علیؑ سے کہا تھا کہ :

اے علیؑ! میرے بعد میری اُمّت میں جن اُمور کے بارے میں اختلاف ہوگا تم ان کو صاف صاف بیان کر دو گے[2]

رہے دوسرے خلفاء ! انھیں قرآن کی تاویل تو درکنار قرآن کے بہت سے ظاہری احکام بھی معلوم نہیں تھے - مثلاً

بُخاری اور مُسلم کے بابُ التیمّم میں ایک روایت ہے کہ کسی شخص نے عُمر بن خطّاب سے ان کے ایامِ خلافت میں پوچھا : امیرالمومنین! میں جُنُب ہو جاؤں اور

---

[1] ملا علاء الدین متقی، کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۳۹۲ حدیث ۶۰۰۹ - ابو نعیم اصفہانی، حِلیۃ الاولیاء - حافظ قندوزی حنفی، ینابیع المودۃ صفحہ ۷۳، ۷۷ - ابن عساکر، تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۴۸۳ -

[2] مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۲ - ابن عساکر، تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۴۸۸ -

پانی نہ ملے تو کیا کروں؟ عمرؓ نے کہا تو ایسی صورت میں نماز نہ پڑھو۔
اسی طرح انھیں کلالہ[1] کا حکم معلوم نہیں تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "کاش میں کلالہ کا حکم رسول اللہؐ سے پوچھ لیتا"۔ حالانکہ یہ حکم قرآن میں مذکور ہے۔
کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بات تھی تو امام علیؑ نے ان امور کی وضاحت کیوں نہ کر دی جن میں رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اختلاف پیدا ہوا؟
اس کا جواب یہ ہے کہ جس مسئلے میں بھی اُمّت کو مشکل پیش آئی، امام علیؑ نے اس کے بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہر مشکل میں صحابہ ان ہی سے رجوع کرتے تھے، وہ ہر بات کی وضاحت کرتے تھے، مسئلے کا حل بیان کرتے تھے اور نصیحت کرتے تھے۔ مگر صحابہ کو جو بات پسند آتی تھی اور جو ان کی سیاست سے متصادم نہیں ہوتی تھی وہ اسے قبول کر لیتے تھے اور باقی کو چھوڑ دیتے تھے۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس کی سب سے بڑی گواہ خود تاریخ ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اگر علی بن ابی طالبؑ اور ان کی اولاد میں سے ائمہؑ نہ ہوتے تو عوام اپنے دین کی امتیازی خصوصیات سے ناواقف ہی رہتے۔ لیکن لوگ ۔ جیسا کہ قرآن نے ہمیں بتایا ہے ۔ حق کو پسند نہیں کرتے، اس لیے انھوں نے اپنی خواہشات کی پیروی شروع کر دی اور ائمہؑ اہلِ بیتؑ کے بالمقابل نئے نئے مذاہب ایجاد کر لیے۔ اِدھر حکومتیں بھی ائمہؑ اہلِ بیتؑ پر پابندیاں عائد کرتی تھیں اور انھیں کہیں آنے جانے اور لوگوں سے براہِ راست رابطہ قائم کرنے کی آزادی نہیں دیتی تھیں۔
امام علیؑ منبر پر سے فرمایا کرتے تھے :

سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ !

لوگو! اس سے پہلے کہ میں تم میں نہ رہوں، جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو۔

امامؑ کے علم و فضل کی یہی ایک دلیل کافی ہے کہ آپ نے نہج البلاغہ جیسا عظیم علمی سرمایہ چھوڑا۔ ائمۂ اہلِ بیتؑ نے علم کی اس قدر کثیر مقدار چھوڑی ہے کہ

---

[1] کلالہ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بظاہر معنی ماں باپ اور اولاد کے علاوہ وارث کے ہیں۔

اس نے چار دانگِ عالم کو بھر دیا۔ سب ہی ائمۂ مسلمین خواہ سُنّی ہوں خواہ شیعہ اس کے گواہ ہیں۔

اس بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر قسمت علیؑ کا ساتھ دیتی اور انھیں سیرتِ رسولؐ کے مطابق تیس سال تک اُمّت کی قیادت کرنے کا موقع ملتا تو اسلام عام ہوجاتا اور اسلامی عقائد لوگوں کے دلوں میں پختگی کے ساتھ جاگزیں ہوجاتے، پھر نہ کوئی فتنۂ صُغریٰ ہوتا نہ کوئی فتنۂ کبریٰ، نہ واقعۂ کربلا ہوتا نہ یوم عاشور۔

اگر علیؑ کے بعد گیارہ ائمہ کو قیادت کا موقع ملتا جن کا تعین رسول اللہؐ نے کیا تھا اور جن کی مدّتِ حیات تقریباً تین صدی پر محیط ہے، تو دُنیا میں ہر جگہ صرف مسلمان ہوتے اور کرۂ ارض کی تقدیر بدل جاتی اور ہماری زندگی صحیح معنی میں انسانی زندگی ہوتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا تو فرمان ہے:

الٓمّٓ ۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۔

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو امتحان میں نہیں ڈالا جائیگا۔

(سورۂ عنکبوت ۔ آیت ۲)

اُمَمِ سابقہ کی طرح مُسلم اُمّہ بھی اس امتحان میں ناکام رہی۔ اس کی تصریح متعدد موقعوں پر خود رسول اللہؐ نے فرمائی ہے[1] اور اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیات میں بھی اس کی صراحت ہے[2] انسان وہ نا انصاف اور جاہل ہستی ہے

---

[1] جیسا کہ بُخاری و مُسلم کی روایت میں ہے کہ مُسلمان یہود و نصاریٰ کے طریقوں پر قدم بقدم چلیں گے اگر وہ گوہ کے بھٹ میں گھُسیں گے تو مسلمان بھی ایسا ہی کریں گے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔
اسی طرح حدیثِ حوض میں رسول اللہؐ نے فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ ان میں بہت ہی کم نجات پائیں گے۔

[2] جیسا کہ سورۂ آلِ عمران میں ہے: اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ اور سورۂ فرقان میں ہے: یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا۔

جس کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا ہے :

لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اَحَدٌ بِعَمَلِہٖ اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَہُ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ وَفَضْلِہٖ۔

کوئی شخص جنت میں اپنے اعمال کی وجہ سے داخل نہیں ہوگا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرما دے اور اسے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔[1]

بحث کے آخر میں کچھ تبصرہ

میں اس طرح کے اقوال دیکھ کر اکثر دانشوروں اور پروفیسروں کی مجلس میں اس پر افسوس کیا کرتا تھا کہ خلافت اس کے صحیح حقدار علی بن ابی طالبؑ کے ہاتھ سے نکل گئی۔ آخر ایک دن ان میں سے ایک پروفیسر صاحب نے یہ کہہ کر مجھ پر اعتراض کیا کہ

"علی بن ابی طالبؑ نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے کیا کیا ہے؟ انھوں نے اپنی پوری زندگی خلافت کی تگ و دو میں گزار دی اور اس کے لیے ہزاروں مسلمانوں کو مروا دیا۔ ان کی ساری جنگیں خلافت ہی کے لیے تھیں۔ اس کے برعکس ان سے پہلے کے خلفائے ثلاثہ نے اپنی زندگی اسلام کی اشاعت میں صرف کر دی اور عمر بھر اسلام کی عزّت و وقار کے لیے کام کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے ملک فتح کیے اور شہر آباد کیے ۔ اگر ابوبکر صدّیق نہ ہوتے تو عرب اسلام سے مرتد ہو گئے ہوتے ۔ اور اگر عمر بن خطّاب نہ ہوتے تو ایران اور روم اسلام کی اطاعت قبول نہ کرتے ۔ اور اگر عثمان بن عفّان نہ ہوتے تو آج آپ مسلمان نہ ہوتے"[2]

پھر ان صاحب نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا :

---

[1] صحیح بخاری جلد ۷ صفحہ ۱۰ - صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین -

[2] ان صاحب کا اشارہ عثمان بن عفّان کے عہد میں شمالی افریقہ کے فتح ہونے کی طرف تھا۔ مطلب یہ کہ اگر یہ فتح نہ ہوتی تو ہم بربر ہی رہتے۔ ہمارا اسلام سے کوئی واسطہ نہ ہوتا۔

جب علیؑ کو خلافت ملی تو انھوں نے وہ طوفان کھڑا کیا کہ سارا کاروبارِ خلافت ہی درہم برہم کر دیا۔ انتظام بگڑ گیا اور وہ اسلام جو ان خلفاء کے عہد میں طاقتور تھا، جن کی تیجانی صاحب تنقیص کرتے اور جن کی نیکی اور پارسائی میں شک پیدا کرتے ہیں، وہ پیچھے ہٹنے اور ناکام ہونے لگا۔

اب اس آخری الزام کا جس پر انھوں نے اپنی بات ختم کی میں کیا جواب دیتا بہرحال میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا اور جوش میں نہیں آیا۔ میں نے اِستغفار پڑھ کر کہا:

برادرانِ عزیز! یہ پروفیسر صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ اکثر نے کہا: ہاں اور بعض نے جواب نہیں دیا، خواہ اس لیے کہ میرا لحاظ کیا یا اِس لیے کہ انھیں ان صاحب کی باتوں پر یقین نہیں تھا۔

میں نے کہا کہ آپ کی اجازت سے میں پروفیسر صاحب کی ایک ایک بات کو لے کر اس پر گفتگو کروں گا، اس کے بعد فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔ خواہ آپ میرے حق میں فیصلہ دیں خواہ میرے خلاف۔ میں آپ سے صرف یہ چاہوں گا کہ آپ حق کا ساتھ دیں اور تعصّب سے کام نہ لیں۔

سب نے کہا: بسم اللہ فرمایئے!

میں نے کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ علی بن ابی طالبؑ نے اپنی تمام زندگی خلافت کی تگ و دو میں نہیں گزاری، جیسا کہ پروفیسر صاحب نے فرمایا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ خلافت سے گریزاں تھے۔ اگر وہ خلافت کے پیچھے دوڑتے تو رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین کو چھوڑ کر دوسروں کی طرح جلدی سقیفہ پہنچتے اور وہاں انھیں کی بات در رہتی خصوصاً ایسی حالت میں کہ اکثر صحابہ ان کی رائے سے اتفاق کرتے تھے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب ابوبکر کی موت کے بعد خلافت حضرت عمر کو مل گئی، جب بھی انھوں نے صبر سے کام لیا اور کوئی مخالفت نہیں کی۔ پھر عمر کے بعد جب انھیں خلافت کی پیشکش ہوئی تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس پیشکش کے ساتھ جو شرائط تھیں وہ ان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں۔ اس سے پروفیسر صاحب کے خیالات کی بالکل تردید ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر علیؑ خلافت کے پیچھے دوڑ رہے ہوتے

تو ان کا کیا نقصان تھا، وہ سُنّتِ شیخین پر عمل کی شرائط کو منظور کر لیتے اور پھر جو دل چاہتا کرتے جیساکہ عثمان نے کیا۔ اسی رویّہ سے علیؑ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ علیؑ نے اپنی زندگی میں نہ کبھی جھوٹ بولا اور نہ کبھی وعدہ خلافی کی۔ ان ہی اعلیٰ اصولوں کی پابندی کی وجہ سے علی ناکام رہے جب کہ دوسرے کامیاب ہو گئے کیونکہ وہ اپنی مقصد برآری کے لیے جو چاہتے سو کرتے تھے۔ مگر علیؑ کہا کرتے تھے:

"میں جانتا ہوں کہ تمھاری بہتری کس بات میں ہے۔ مگر مجھے تمھاری بہتری کے لیے اپنی بربادی منظور نہیں۔"

سُبحان اللہ! کیا کہنا امامؑ کی عظمت کا!

سب مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ قضیۂ سقیفہ کے بعد جب ابوسُفیان نے علیؑ کے پاس آکر انھیں خلافت کا لالچ دیا اور کہا کہ میں ابوبکر اور ان کے حلیفوں سے قتال کے لیے آدمیوں کا اور روپیوں کا انتظام کر دیتا ہوں تو آپ نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور فرمایا:

"اے ابوسُفیان! فتنہ نہ پھیلا، میں جانتا ہوں کہ تیرے دل میں کیا ہے۔ میں مُسلمانوں میں فتنہ و آشوب پسند نہیں کرتا، بہتر یہی ہے کہ الگ رہوں اور افتراق پسندی سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔"

اگر آپ خلافت کے پیچھے دوڑتے ہوتے تو اس پیشکش کو ضرور قبول کر لیتے۔ لیکن آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی سلامتی کی خاطر قربانی دی اور صبر سے کام لیا۔ علیؑ ہی نے تو ابنِ عبّاس سے کہا تھا کہ تمھاری دنیا کی میرے نزدیک بس اتنی وقعت ہے جتنی اس پتے کی جس کو کوئی ٹڈّی اپنے منہ میں لے کر چبا ڈالے[1] یا اتنی جتنی کسی بکری کی رینٹ کی ہوتی ہے[2]

---

[1] اِنَّ دُنیَاکُمْ عِندِی لَاَھْوَنُ مِنْ وَرَقَةٍ فِی فَمِ جَرَادَةٍ تَقْضِمُھَا۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۱)

[2] وَلَاَلْفَیْتُمْ دُنْیَاکُمْ ھٰذِہٖ اَزْھَدَ عِندِی مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ۔ (نہج البلاغہ خُطبۂ شقشقیّہ)

[ابن عباس رض بیان کرتے ہیں کہ جب امیرالمومنین امام علیؑ اہلِ بصرہ سے جنگ کے لیے نکلے تو میں مقام ذِیْ قَار میں آنجناب کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنا جوتا ٹانک رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمایا کہ اے ابنِ عبّاس! اِس جُوتے کی کیا قیمت ہوگی؟ میں نے کہا: اب تو اس کی کچھ بھی قیمت نہ ہوگی۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا:

بخُدا! اگر میرے پیشِ نظر حق کی سربلندی اور باطل کی نابودی نہ ہو تو مجھے یہ جُوتا تم لوگوں پر حکومت کرنے سے زیادہ عزیز ہے۔]

تو جناب آپ کا یہ فرمانا کہ علیؑ خلافت کے پیچھے دوڑتے تھے، اس کی تو تاریخی واقعات سے تردید ہو جاتی ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے خلافت کے حصُول کی خاطر ہزاروں مسلمانوں کو قتل کرا دیا اور ان کی سب لڑائیاں صرف اسی مقصد کے لیے تھیں تو یہ دعویٰ بھی بالکل جھوٹ اور سراسر بُہتان ہے اور حقائق کو مسخ کرنا ہے۔ اگر آپ نے ناواقفیت کی بنا پر ایسا کہا ہے تو اللہ سے مُعافی مانگیں اور توبہ اِستِغفار کریں اور اگر آپ نے جان بُوجھ کر ایسا کہا ہے تو آپ کی سب معلومات بالکل غلط اور جھُوٹ ہیں کیونکہ امامؑ کی وہ لڑائیاں جن کا آپ نے ذکر کیا اس کے بعد کی ہیں جب خلافت آپ کے پیچھے دوڑتی ہوئی آپ کے پاس آچکی تھی۔ آپ کو خلافت کے قبول کرنے پر لوگوں نے مجبور کیا تھا بلکہ انکار کرنے کی صورت میں آپ کو قتل کرنے دھمکی بھی دی گئی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ علیؑ چوتھائی صدی تک خاموش اور خانہ نشین رہے۔ اس طویل مُدّت میں نہ خلفاء کی کسی جنگ میں حصّہ لیا اور نہ تلوار میان سے نکالی تو جناب! پھر آپ کیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی جنگیں خلافت کے حصُول کی خاطر تھیں؟ اور کیسے یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے حصُولِ خلافت کے لیے ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا؟

جنگِ جَمل تو عائشہ[1]، طلحہ اور زُبیر نے شروع کی تھی۔ ان ہی لوگوں نے بصرہ

---

[1] رسول اللہؐ کی ان زوجۂ محترمہ نے آیۂ قرآن وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کی خلاف ورزی کر کے سیاسی فتنوں کو عالمِ اسلام میں راہ دی اگرچہ بعد میں وہ اس پر پشیمان ہوئیں اور بولیں: کاش میرے رسول اللہؐ سے بہت سارے بچے ہوتے اور سارے مرجاتے مگر میں اس قضیے میں ہاتھ نہ ڈالتی! اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۳۸۴ (ناشر)

میں داخل ہو کر لوگوں کو قتل کیا تھا اور بیت المال لوٹ لیا تھا[1] جنگِ جمل کو جنگِ عہد شکناں بھی کہا جاتا ہے کیونکہ طلحہ اور زبیر نے اس وقت بیعت توڑ دی تھی جب امام علیؑ نے انھیں کوفے اور بصرے کا والی بنانے سے انکار کر دیا تھا[2]

رہی جنگِ صفّین تو یہ معاویہ نے گلے منڈھی تھی۔ معاویہ ہی نے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا۔ سب سے بڑھ کر عمّار بن یاسر کو۔ اور یہ سب کچھ خلافت کے حصول کے لیے کیا۔ تو میرے بھائی! آپ کیوں حقائق کو مسخ کرتے ہیں۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ جنگِ صفّین کی ابتدا معاویہ نے خونِ عثمان کا دعویٰ لے کر شروع کی تھی لیکن اصل میں معاویہ کا مقصد حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ اس کی گواہی[3] خود معاویہ نے اس خطبہ میں دی جو انھوں نے جنگ کے بعد کوفہ میں داخل ہونے کے بعد دیا تھا۔ معاویہ نے کہا:

"میں نے تمھارے ساتھ اس لیے جنگ نہیں کی کہ تم نماز پڑھو یا روزے رکھو یا حج کرو اور زکوٰۃ دو۔ یہ سب کام تو تم پہلے ہی کرتے ہو۔ میں نے جنگ تمھارا امیر بننے کے لیے لڑی تھی۔ اللہ نے مجھے اس میں کامیابی دی گو تمھیں یہ بات پسند نہیں تھی۔"

جنگِ صفّین کو ظالموں اور باغیوں کی لڑائی بھی کہا جاتا ہے۔ رہی جنگِ نہروان! یہ خوارج کی لڑائی تھی۔ یہ جنگ بھی باغیوں نے امام علیؑ پر مسلّط کی تھی۔

یہ ہیں وہ لڑائیاں جو امام علیؑ نے لڑیں۔ امام علیؑ ہر موقع پر لوگوں کو کتاب اللہ کی طرف بلاتے رہے اور اپنے مخالفین پر حجّت قائم کرتے رہے۔

جناب! آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ آپ تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کریں تاکہ

---

[1] طبری، ابن اثیر، یعقوبی، مسعودی اور وہ تمام مورّخین جنھوں نے جنگِ جمل کا حال لکھا ہے۔

[2] طبری، تاریخ الامم والملوک جلد ۵ صفحہ ۱۵۳۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۲۲۷۔ ابن واضح یعقوبی، تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۲۷۔

[3] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۱۔ ابوالفرج اصفہانی، مقاتل الطالبیین صفحہ ۷۰۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ جلد ۴ صفحہ ۱۶۔

حق و باطل کو پہچان سکیں اور اولیا۔ اللہ پر بیجا الزام لگانے سے بچ سکیں۔
اِس موقع پر ایک اور پروفیسر صاحب نے جو شاید تاریخ کے ماہر تھے، اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا:
آپ نے جو کچھ کہا بالکل صحیح ہے۔ مَعَاذَاللہ امام علی کَرَّمَ اللہُ وَجْہَہٗ خلافت کے لالچی نہیں تھے اور نہ وہ خلافت کی طمع میں کسی ایک شخص کو بھی قتل کر سکتے تھے، سخت افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک بعض مسلمان علیؑ پر شک کرتے ہیں جبکہ عیسائی بھی ان کا احترام کرتے ہیں۔ میں نے حال ہی میں ایک عیسائی مصنف جارج جُرداق کی ایک کتاب پڑھی ہے جس کا نام ہے صَوتُ العدالۃ الانسانیہ (ندائے عدالتِ انسانی) اس کتاب میں اس نے حیران کُن واقعات بیان کیے ہیں جو شخص بھی اس کتاب کو پڑھے گا، امام علیؑ کی عظمت کے سامنے سر جُھکا دے گا۔
اِس پر ایک تیسرے پروفیسر صاحب ان کی بات کاٹ کر بولے: آپ نے شروع سے ہی یہ بات کیوں نہ کہی؟
انھوں نے جواب دیا: میں درحقیقت تیجانی بھائی کی باتیں سن رہا تھا میں انھیں پہلے سے نہیں جانتا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ ان کا جواب سُنوں اور ان کی معلومات کا اندازہ لگاؤں۔ الحمدللہ! انھوں نے اپنے دلائل سے ہمیں لاجواب کر دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ یہ صاحب بھی امام علیؑ کی فضیلت کے قائل ہیں لیکن انھیں ابُوبکر اور عُمر کی حمایت میں جوش آگیا، اس لیے وہ تیجانی بھائی کی باتوں کے ردِّ عمل کے طور پر امام علیؑ کی شان میں گستاخی کر بیٹھے جس کا انھیں احساس بھی نہیں ہوا۔
پہلے پروفیسر صاحب نے بھی اپنے ساتھی کی اس بات کو پسند کیا کیونکہ اس طرح انھیں اس مخمصے سے نجات مل گئی جس میں وہ سب کے سامنے اپنی ہی باتوں کی وجہ سے پھنس گئے تھے۔ گرچہ اب حق ظاہر ہو چکا تھا اور ان صاحب کے لیے بہتر تھا کہ اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے صحابہ کا دفاع کرتے مگر وہ ازرُوئے جہالت حقائق کو مسخ کرتے ہوئے کہنے لگے:

جی ہاں! میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ خُلفاء کا اسلام اور مسلمانوں پر بڑا احسان ہے

چاہے انھوں نے کچھ بھی کیا ہو۔ آخر کو وہ بَشَر تھے اور کسی نے بھی ان کے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی خوبیاں بیان کریں (اور خامیوں پر پردہ پڑا رہنے دیں) یہ صحیح نہیں ہے کہ شیعوں کی طرح خلفاء کی فضیلت کا انکار کریں اور حبِّ علیؑ میں غُلوّ سے کام لیں۔

میں نے کہا: گر اجازت ہو تو میں اپنا جواب مکمل کرلوں تاکہ آپ میں سے کسی کے ذہن میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

"ان صاحب کا یہ کہنا کہ امام علیؑ سے پہلے جو تین خُلفاء ہوئے ان کی زندگیاں اشاعتِ اسلام میں صرف ہوئیں اور ان کے عہد میں بڑی فتوحات ہوئیں، نیز یہ کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں آج مسلمان نہ ہوتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان فتوحات کا مقصد اللہ کی رَضا اور اسلام کی عزّت تھا تو اللہ اس کی جزا دے گا، لیکن اگر مقصد اپنی فوقیت جتانا، مالِ غنیمت حاصل کرنا اور عورتوں کو باندیاں بنانے کے لیے قید کرنا تھا تو پھر اس کا نہ کوئی اَجر ہے اور نہ ثواب۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب عُثمان بن عفّان کی مخالفت نے زور پکڑا اور لوگ ان پر اعتراض کرنے لگے تو انھوں نے مروان بن حَکَم اور مُعاویہ بن ابی سُفیان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ "افریقہ فتح کرنے کے لیے فوجیں بھیج دو تاکہ لوگوں کا دھیان بٹ جائے، پھر چاہے ان کی پیٹھ پر جوئیں رینگتی رہیں انھیں فکر ہوگی تو اس کی کہ کاٹھی سے ان کے گھوڑوں کی پیٹھ پر زخم نہ پڑجائیں"[1] چنانچہ عُثمان نے اپنے دودھ شریک بھائی عبداللہ بن ابی سَرح کی قیادت میں افریقہ فتح کرنے کے لیے فوج بھیج دی اور فتح کے بعد بلا شرکتِ غیرے عبداللہ بن ابی سرح کو افریقہ کا پورا خراج دے دیا۔ یہ عبداللہ بن ابی سرح ایک دفعہ ایمان لانے کے بعد مُرتد ہوگیا تھا اور رسول اللہؐ نے اعلان کردیا تھا کہ اس کا خون مُباح ہے، جو شخص چاہے اسے قتل کردے۔ جب رسول اللہؐ فتح مکہ کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے اپنے اصحاب کو ہدایت کی عبداللہ بن ابی سرح جہاں کہیں ملے اس کو قتل کردو چاہے وہ کعبے کے

---

[1] طبری، تاریخ الاُمم والملوک باب خلافت عُثمان ۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ باب خلافتِ عُثمان۔

پردے پکڑے ہوئے ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن عثمان نے اسے چھپالیا اور فتح کے بعد اسے رسول اللہ صلعم کے پاس لے کر آئے اور اس کی سفارش کی۔ رسول اللہ صلعم خاموش اور اس بات کے منتظر رہے کہ کوئی اُٹھ کر اسے قتل کر دے، جیسا کہ آپ نے بعد میں فرمایا۔ اس پر عُمر نے کہا کہ یارسول اللہ صلعم مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیا ہوتا۔ آپ نے فرمایا:

نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ لَا يَنْبَغِيْ اَنْ تَكُوْنَ لَنَا خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ.

"ہم انبیاء کے لیے آنکھ سے دھوکا دینا نامناسب ہے"۔[1]

یہ تھے فتح افریقہ کے اسباب! اور ایسے شخص کے ہاتھوں افریقہ کے لوگ مُسلمان ہوئے۔ میں بھی اسی شخص کے توسّط سے مسلمان ہوا! یہ تو ہوئی ایک بات ــ دوسری بات یہ ہے کہ کِس نے کہا ہے کہ اگر سقیفہ کا قصّہ نہ ہوتا اور علیؑ کو خلافت سے دور نہ رکھا جاتا تو فتوحات بڑے پیمانے پر اور زیادہ نفع بخش نہ ہوتیں اور آج پُورے کُرۂ ارض پر اسلام چھایا ہوا نہ ہوتا؟؟ پھر یہ بھی ہے کہ انڈونیشیا کو تو خُلفاء نے فتح نہیں کیا تھا، وہاں تو اسلام تلواروں کے ذریعے نہیں بلکہ سوداگروں کے ذریعے پہنچا تھا اور آج بھی وہاں دنیا بھر میں سب سے زیادہ مسلمان ہیں۔ اور انڈونیشیا اس اسپین سے بہتر ہے جو اِن لوگوں کے ہاتھوں تلوار سے فتح ہوا تھا اور جو آج اسلام اور مسلمانوں کا مخالف ہے۔

برادرانِ گرامی! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس سِلسلے میں ایک چھوٹا سا قصّہ آپ کو سُناؤں:

ایک بادشاہ نے حج کو جانے سے پہلے وزیر کو اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔ ان دنوں حج کے سفر میں پورا ایک سال لگتا تھا۔ بادشاہ کے جانے کے بعد اس کے کچھ درباریوں نے وزیر کے خلاف سازش کر کے اسے قتل کر دیا اور اپنے میں سے ایک کو اس کی جگہ وزیر مقرر کر دیا۔ اس نئے وزیر نے بڑے بڑے کام کیے۔ سڑکیں اور مسجدیں بنوائیں، سرائے اور حمام بنوائے۔ بعض سرکش قبائل کو زیر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک باب خلافت عثمان۔ ابن عبدالبر، استیعاب ترجمہ عبداللہ بن ابی سرح۔

مملکت پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہوگئی۔ لیکن جب بادشاہ کو حج سے لوٹنے پر یہ معلوم ہوا کہ اس کے قائم مقام کو قتل کر دیا گیا ہے تو وہ بہت افروختہ ہوا اور سب سازشیوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ ایک نے آگے بڑھ کر کہا: سرکارِ عالیجاہ! ہم نے جو آپ کی حکومت کی توسیع کے لیے اتنے بڑے بڑے کارنامے اور خدماتِ لائقہ انجام دی ہیں، کیا ان کے صلے میں ہمارے جرم کو معاف نہیں کیا جا سکتا؟ بادشاہ نے بگڑ کر کہا: چپ رہ خبیث! تم نے میرے وزیر کو قتل کر کے۔ جسے میں اپنا قائم مقام مقرر کر کے گیا تھا۔ میرے ساتھ نمک حرامی کی ہے۔ رہی وہ خدمات جو تم نے انجام دی ہیں تو وہ اکیلا اس سے کئی گنا زیادہ کر سکتا تھا جو تم سب نے مل کر کیا ہے۔"

یہ قصّہ سن کر سب ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم مطلب سمجھ گئے۔

میں نے کہا: اب اس آخری فقرے پر آیئے جو ان پروفیسر صاحب نے کہا تھا کہ جب علیؑ کو خلافت مل گئی تو انھوں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا اور ہر چیز کو اتھل پتھل کر دیا!

ہم سب کو معلوم ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ طوفان تو حضرت عثمان کے عہد میں مچا اور ہر چیز اس وقت اُتھل پُتھل ہوئی جب انھوں نے اقربا پروری کے نتیجے میں اپنے فاسق و فاجر رشتہ داروں کو مسلمانوں پر مسلّط کر دیا حالانکہ اس وقت بہترین صحابہ موجود تھے، جنھیں اس کے سِوا کیا ملا کہ انھیں زدوکوب کیا گیا[1] شہر بدر کیا گیا[2] اور ان کی ہڈی پسلیاں توڑی گئیں[3] اسلام اس وقت پیچھے ہٹنے اور ناکام ہونے لگا جب مسلمان بنی اُمیّہ کے غلام بن گئے۔

پروفیسر صاحب! آپ یہ سب حقائق لوگوں کو اور خصوصاً اپنے شاگردوں کو

---

[1] جیسے عمّار بن یاسرؓ کو زدوکوب کیا گیا، ان کی آنت اُتر آئی، مہینوں علاج کراتے رہے۔

[2] ابوذر غِفاریؓ نے بورژوا طبقے کی مخالفت کی تو شہر بدر کیے گئے۔ اکیلے پڑے ہوئے جان دے دی۔

[3] عبد اللہ بن مسعودؓ نے فاسقوں کو مسلمانوں کا مال دینے پر اعتراض کیا تو وہ مار دی گئی کہ پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

کیوں نہیں بتلاتے اور ان کی صحیح رہنمائی کیوں نہیں کرتے۔ جب امام علیؑ کو خلافت ملی تو انھوں نے دیکھا کہ کچھ بے دین ہیں، کچھ ظالم ہیں اور کچھ غدّار ہیں باقی جو بچے وہ سب منافق ہیں۔ حقیقی مسلمان صرف چند تھے جنھوں نے علیؑ کی ان ہی اُمور پر بیعت کی جن اُمور پر رسول اللہؐ کی بیعت کی تھی۔ امام علیؑ نے بگاڑ کو دُور کرنے، عدالت کو قائم کرنے اور مُعاملات کو رُوبراہ لانے کی اپنی سی پوری کوشش کی یہاں تک کہ وہ اسی اصلاح کی کوشش میں شہید ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے بیٹے شہید ہوئے انھیں زہر دیا گیا اور وہ بھی اصلاح کی راہ میں قربان ہو گئے۔ اس کے بعد امام علیؑ کے دُوسرے بیٹے امام حسینؑ اپنے ساتھیوں، بھائیوں، بیٹوں اور اہلِ بیت سمیت شہید ہوئے[1]۔ ائمۂ اہلبیتؑ میں سے ہر امام نے شہادت پائی خواہ تلوار سے مقتول ہو کر یا زہر سے مسموم ہو کر۔ ان سب ائمہؑ نے اپنے نانا کی اُمّت کی اصلاح کی خاطر اپنی جان کی قربانی دی۔

میں یہاں ایک لطیفہ بیان کرنا چاہتا ہوں، اس سے آپ کو امام علی بن ابی طالبؑ کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوگا:

ایک دفعہ ایک شخص امام علیؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا امیرالمومنین! میں آپ سے ایک بات پُوچھنا چاہتا ہوں۔ امامؑ نے فرمایا: جو چاہو پُوچھو۔ اس نے کہا: یہ کیا بات ہے کہ ابوبکر اور عُمر کے زمانے میں تو حالات ٹھیک رہے لیکن آپ کے زمانے میں ٹھیک نہ ہو سکے۔ امام علیؑ نے برجستہ جواب دیا: ابوبکر اور عُمر مجھ جیسے لوگوں پر حکومت کرتے تھے اور میں تم جیسے لوگوں پر حکومت کرتا ہوں۔ اِسی لیے یہ انتشار پیدا ہو گیا۔

کیا خُوب اور شافی جواب ہے اس کی طرف سے کہ تاریخ نے رسول اللہؐ کے بعد اس جیسا معلّم نہیں دیکھا۔

اِس قصّے کو سُن کر سب حاضرین بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ آخر علیؑ

---

[1] ذرا غور فرمائیے کہ وہ کون سے حالات اور اسباب تھے کہ رسول اللہؐ کی رحلت کے صرف پچاس سال بعد رسول اللہؐ کے نام لیواؤں نے رسول اللہؐ کی اولاد کو بھوکا پیاسا شہید کر دیا۔ (ناشر)

شہرِ علم کا دروازہ تھے۔

میں نے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کردی کہ: ہمارے پروفیسر صاحب نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں خلفائے ثلاثہ کی تنقیص کرتا ہوں اور ان کے کردار کی پاکیزگی میں شبہ پیدا کرتا ہوں، تو یہ محض تہمت ہے۔ کیونکہ میں نے فقط وہی کچھ کہا ہے جو بخاری و مسلم نے کہا ہے اور اہلِ سُنّت مورخین نے کہا ہے۔ اگر آپ اسے تنقیص اور کردار کشی تصوّر کرتے ہیں تو مجھے الزام دینے کے بجائے ان لوگوں کو الزام دیں۔ مجھ سے تو آپ فقط یہ مطالبہ کرسکتے ہیں کہ میں کوئی ایسی سَنَد دکھاؤں جو اہلسُنّت کے نزدیک قابلِ اعتماد ہو۔ مجھے آپ صرف اس وقت الزام دے سکتے جب آپ خُود ان سَنَدوں کو دیکھ کر میرا کوئی ایک بھی جھوٹ پکڑ سکیں۔

سب نے یک زبان ہو کر کہا: واقعی اس طرح کی بحثوں میں یہی ہونا بھی چاہیے۔ سب نے پروفیسر صاحب پر زور دیا کہ مجھ سے معذرت کریں۔ چنانچہ انھوں نے معذرت کرلی۔ فَلِلّٰہِ الحمد

امام علیؑ کی وَلایت کے دُوسرے شواہد

چُونکہ اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ کی مشیّت یہ ہوئی کہ امام علیؑ کی ولایت کو مسلمانوں کے لیے آزمائش قرار دیا جائے، اس لیے اس بارے میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ مگر چونکہ اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان بھی ہے اور وہ اگلوں کی حرکتوں کا پچھلوں سے مُواخذہ نہیں کرتا۔ اس لیے اس کی حکمت کا اقتضاء یہ ہوا کہ اس واقعہ کے ساتھ کچھ اور ایسے اہم واقعات کو منسلک کردیا جائے جن کی نوعیت تقریباً معجزات کی ہو، تاکہ یہ واقعات اس بات کا محرک بن جائیں کہ ولایتِ علیؑ کے واقعہ میں موجود لوگ اس واقعہ کو نقل کرتے رہیں اور بعد میں آنے والے اس واقعہ سے منسلک دوسرے واقعات سے عبرت پکڑیں، شاید اس طرح اس واقعہ پر مُسلسل گفتگو کے نتیجہ میں لوگ راہِ حق پر گامزن ہوسکیں۔

پہلا واقعہ: اس واقعے کا تعلق اس شخص کی سزا سے ہے جس نے ولایتِ علیؑ کو اس وقت جھٹلایا تھا جب غدیرِ خُم میں امام علیؑ کے مسلمانوں پر

خلیفہ مقرر ہونے کی خبر مشتہر ہو چکی تھی اور سب لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں، وہ یہ خبر ان لوگوں تک پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں۔

ہُوا یوں کہ جب حارِث بن نُعمان فِہری کو یہ خبر ملی تو اسے ذرا پسند نہیں آئی۔ وہ رسول اللہ صلعم کے پاس آیا اور اپنی اُونٹنی مسجد کے دروازے کے سامنے بٹھا کر سیدھا رسول اللہ صلعم کی خدمت میں پہنچا اور کہنے لگا: اے محمدؐ! تم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم یہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور تم اللہ کے رسول ہو، ہم نے تمھاری یہ بات مان لی۔ تم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم دن رات میں پانچ نمازیں پڑھیں رمضان کے روزے رکھیں، بیتُ اللہ کا طواف کریں، اپنے اَموال کی زکوٰۃ دیں ہم نے یہ بات بھی مان لی۔ لیکن تم نے اس پر بس نہیں کی، اپنے چچا کے بیٹے کو اُونچا اٹھا دیا۔ اسے سب لوگوں سے بڑھا دیا اور کہہ دیا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ۔ اب یہ بات تمھاری اپنی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے [1]

رسول اللہ صلعم کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ آپ نے فرمایا: خُدائے وَاحِد کی قسم! یہ اللہ کی طرف سے ہے، میری طرف سے نہیں۔ آپ نے اس بات کو تین بار دہرایا۔ حارِث وہاں سے اُٹھا اور کہنے لگا: اے اللہ! محمدؐ جو کہہ رہے ہیں اگر وہ

---

[1] اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بَدّو مدینے سے باہر رہتے تھے، وہ علی بن ابی طالبؑ کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان سے بُغض رکھتے تھے بلکہ وہ تو رسول اللہ صلعم کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ گنوار رسول اللہ صلعم کے پاس آتا ہے تو سلام نہیں کرتا، آپ کا نام لے کر پکارتا ہے۔ سچ کہا ہے اللہ تعالیٰ نے:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَنْ لَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ۔

"عرب کے بدو سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل ہیں کہ جو کچھ اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے اس کی حدوں سے واقف ہی نہ ہوں"

(سورۂ توبہ۔ آیت ۹۷)

سچ ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب بھیج۔

راوی کہتا ہے کہ وہ ابھی اپنی اُونٹنی تک نہیں پہنچا تھا کہ آسمان سے ایک پتھر آیا جو اس کے سر پر گرا اور وہ وہیں ہلاک ہوگیا۔ تب آیہ سَاَلَ سَائِلٌ اُتری۔

علاوہ ان مآخذوں کے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے[۵] اور بھی بہت سے علمائے اہلِ سُنّت نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ جسے مزید حوالوں کی تلاش ہو، وہ علامہ امینی کی الغدیر کا مُطالعہ کرے۔

دوسرا واقعہ : اِس کا تعلّق ان لوگوں کی سزا سے ہے جنھوں نے واقعۂ غدیر کو چھپانے کی کوشش کی اور انھیں امام علیؑ کی بددعا لگی۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب امام علیؑ نے یوم رحبہ، کوفہ میں لوگوں کے مجمع میں منبر پر سے اعلان کیا کہ :

"میں ہر مسلمان کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ اگر اس نے غدیرِ خُم میں رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہو کہ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ تو وہ کھڑے ہو کر جو کچھ اس نے سُنا ہو اس کی گواہی دے لیکن وہ شخص کھڑا ہو جس نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ دیکھا ہو اور اپنے کانوں سے سُنا ہو۔"

یہ سُن کر تیس صحابی کھڑے ہوگئے، جن میں سے سولہ اصحابِ بدر تھے۔ ان سب نے شہادت دی کہ رسول اللہؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں سے کہا تھا کہ:

کیا تمھیں معلوم ہے کہ مومنین پر ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ میرا حق ہے؟ سب نے کہا: جی ہاں! پھر آپ نے کہا:
مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا مَوْلَاہُ. اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ.

---

[۵] حافظ حسکانی، شواہد التنزیل جلد ۲ صفحہ ۲۸۶ - ابو اسحاق ثعلبی، تفسیر الکشف والبیان - محمد بن احمد قرطبی تفسیر الجامع لاحکام القرآن جلد ۱۸ صفحہ ۲۷۸ - محمد رشید رضا، تفسیر المنار جلد ۸ صفحہ ۲۶۸ - حافظ قندوزی حنفی ینابیع المودۃ صفحہ ۸۲۳ - حاکم نیشاپوری، مستدرک علی الصحیحین جلد ۲ صفحہ ۵۰۲ - علی بن برہان الدین حلبی، سیرت حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۲۷۵ -

لیکن بعض صحابہ جو واقعۂ غدیر میں موجود تھے، علیؑ سے حَسَد اور بُغض کی وجہ سے بیٹھے رہے اور شہادت دینے کے لیے کھڑے نہیں ہوئے، ان میں اَنَس بن مالک بھی تھے۔ جب امام علیؑ منبر پر سے اُترے تو آپ نے ان سے کہا: اَنَس! کیا بات ہے تم دوسرے صحابہ کے ساتھ اس دن جو کچھ تم نے سُنا تھا اس کی شہادت دینے کے لیے کھڑے نہیں ہوئے؟ اَنَس نے کہا: امیرُالمومنین! اب میں بُڈھا ہوگیا ہوں مجھے یاد نہیں رہا کیا بات ہوئی تھی۔ امام علیؑ نے کہا: اگر تم جھوٹ بول رہے ہو تو اللہ تمھیں برص کی بیماری میں مُبتلا کردے۔ چنانچہ اَنَس ابھی وہاں سے اٹھے بھی نہ تھے کہ ان کے چہرے پر برص کے داغ پڑگئے۔ اَنَس روتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے شہادت کو چھپایا تھا، اس لیے مجھے عَبْدِ صالح، علیؑ کی بددُعا لگ گئی۔

یہ مشہور قصہ ہے۔ اِس کو ابن قتیبہ نے کتاب المعارف[1] میں بیان کیا ہے جہاں باب البرص میں انس بن مالک کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جن کی بیماری سے شکل بگڑ گئی تھی۔

امام احمد بن حنبل نے بھی مُسند[2] میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ سب کھڑے ہوگئے سوائے تین آدمیوں کے جنھیں علیؑ کی بددُعا لگ گئی۔

مُناسب ہوگا کہ یہاں ہم ان تین اشخاص کی تصریح کردیں جن کا ذکر امام احمد بن حنبل نے احمد بن یحییٰ بَلاذُری کے حوالے سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"جب امام علیؑ نے شہادت طلب کی اس وقت منبر کے نیچے انس بن مالک، براء بن عازب اور جریر بن عبداللہ بَجَلی بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان تین میں سے کوئی بھی نہیں اُٹھا۔ امام علیؑ نے اپنی بات کو دُہرایا پھر بھی ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر امام نے کہا: "یا الٰہی! جو کوئی جانتے بوجھتے اس شہادت کو چھپائے اسے اس وقت تک دنیا سے نہ اٹھانا جب تک اس پر کوئی ایسی نشانی نہ لگ جائے جس سے وہ پہچانا جائے۔" چنانچہ اَنَس بن مالک کو برص

---

[1] ابن قتیبہ، کتاب المعارف صفحہ ۲۵۱۔

[2] امام احمد بن حنبل، مسند جلد ۱ صفحہ ۱۱۹

کی بیماری لگ گئی - بَرا بن عازِب کی بینائی جاتی رہی اور جَریر، ہجرت کے بعد دوبارہ بَدّو بن گئے اور شرات جاکر اپنی ماں کے گھر مرے۔

یہ ایک مشہور قصّہ ہے جس کو بہت سے مؤرخین نے نقل کیا ہے۔[1]

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَلْبَابْ.

جو شخص بھی اس واقعہ کے مختلف[2] پہلوؤں پر غور کرے گا، جو تقریباً فراموش کیا جاچکا تھا اور جسے امام علیؑ نے چوتھائی صدی گزرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا تھا، وہ امام علیؑ کی عظمت، بلند ہمتی اور خلوص کا قائل ہوجاتے گا انھوں نے نہ صرف صبر کا حق ادا کردیا بلکہ صبر کے حق سے بھی زیادہ صبر کیا - جب بھی انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ضرورت محسوس کی تو بے کہے، ابوبکر، عمُر اور عُثمان کو نصیحت کرنے اور مفید مشورے دینے سے گریز نہیں کیا - لیکن اس سب کے باوجود واقعہ غدیر ان کے ذہن میں ہمیشہ مستحضر رہا اور جب بھی موقع ملا انھوں نے اسے زندہ کیا - یہاں تک کہ بھرے مجمع میں علی الاعلان انھوں نے دوسروں سے بھی اِس واقعہ کی گواہی چاہی -

دیکھیے امام علیؑ نے اس واقعہ کی یاد کو زندہ کرنے اور سب مسلمانوں پر خواہ وہ اس واقعہ کے وقت موجود تھے یا نہیں اتمام حجّت کرنے کا کیا دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا ہے - اگر امام علیؑ یہ کہتے کہ لوگو! غدیرِ خُم میں رسول اللہؐ نے خلافت کے لیے مجھے نامزد کیا تھا، تو حاضرین پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا بلکہ وہ اُلٹا اعتراض کرتے کہ امام نے اتنی طویل مدت تک خاموشی کیوں اختیار کی -

---

[1] ابن عساکر، تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۷ اور جلد ۳ صفحہ ۱۵۰ - شرح نہج البلاغہ تحقیق محمد ابوالفضل جلد ۱۹ صفحہ ۲۱۷ - میر حامد حسین موسوی، عبقات الانوار جلد ۲ صفحہ ۳۰۹ - ابن مَغازلی، مناقب علی بن ابی طالبؑ صفحہ ۲۳ - علی بن برہان الدین حلبی، سیرۃ حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۳۳۷ -

[2] ایک پہلو یہ ہے کہ امام علیؑ نے صحابہ کو دعوت دی تھی کہ حدیثِ غدیر کی شہادت دیں - اس واقعہ کو محدثین اور مورخین کی ایک بڑی تعداد نے بیان کیا ہے، جن کا ذکر پہلے ہوچکا - جیسے امام احمد بن حنبل، ابن عساکر، ابن ابی الحدید وغیرہ -

لیکن جب آپ نے یہ کہا کہ میں ہر مُسلمان کو قسم دیتا ہوں کہ اگر اس نے وہ سُنا ہو جو رسول اللہؐ نے غدیر کے دن فرمایا تھا، تو وہ کھڑے ہو کر اس کی شہادت دے، تو اس واقعہ کو حدیثِ نبوی کے طور پر تیس ۳۰ صحابیوں نے بیان کیا جن میں ۱۶ بدری تھے۔ اس طرح امامؑ نے جھٹلانے والوں، شک کرنے والوں اور اتنی طویل مُدّت تک خاموشی اختیار کرنے پر اعتراض کرنے والوں کا مُنہ بند کر دیا۔ کیونکہ اب آپ کے ساتھ ساتھ ان تیس صحابہ کا سُکوت اس بات کی روشن دلیل تھا کہ معاملہ دراصل نازک تھا اور جیسا کہ ظاہر ہے اس موقع پر سُکوت ہی میں اسلام کا مفاد تھا۔

شوریٰ پر تبصرہ

گزشتہ اوراق میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ شیعوں کے بقول خلیفہ کا تعیّن اللہ کے ہاتھ میں ہے جو رسول اللہؐ وحی آنے پر کرتے تھے۔ یہ قول احکامِ اسلامی کے فلسفے سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔ کیونکہ سُورۂ قصص میں ہے: يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ۔

اور چُونکہ اللہ سُبحانہٗ کی مشیّت یہ ہے کہ اُمّت محمّدیہ بہترین اُمّت ہو جو انسانوں کے لیے پیدا کی گئی ہے، اِس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی قیادت دانشمندی پختگی، قوت، شجاعت، ایمان اور زہد و تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر فائز ہو۔ یہ صفات صرف اس فرد میں پائی جا سکتی ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا ہو اور قیادت وسیادت کی خصوصی صفات سے نوازا ہو۔ سورۂ حج آیت ۷۵ میں ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ۔

اللہ اِنتخاب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والوں کا اور اسی طرح آدمیوں میں سے بھی۔ بے شک اللہ خوب سُننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔

جس طرح اللہ سُبحانہٗ انبیاء کا انتخاب کرتا ہے اسی طرح اوصیاء کا بھی

وہی انتخاب کرتا ہے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

لِكُلِّ نَبِيٍّ وَصِيٌّ، وَأَنَا وَصِيِّي عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍؑ

ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ میرے وصی علی بن ابی طالبؑ ہیں[1]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

أَنَا خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ وَعَلِيٌّ خَاتَمُ الْأَوْصِيَاءِ.

میں خاتم الانبیاء ہوں اور علیؑ خاتم الاوصیاء ہیں[2]

اس طرح شیعوں نے دوسروں کو بھی بے فکر کر دیا اور خود بھی آرام سے ہو گئے۔ انھوں نے اپنا معاملہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے سپرد کر دیا ہے۔ اب ان میں نہ کوئی خلافت کا دعویٰ کر سکتا ہے، نہ کسی کو خلافت کا لالچ ہو سکتا ہے، نہ کسی نص کی بنیاد پر اور نہ خود اپنی مرضی سے۔ کیونکہ ایک تو نص اختیار اور شوریٰ کی نفی کرتی ہے، دوسرے نص میں رسول اللہؐ نے خود مخصوص اشخاص کا ناموں کے ساتھ تعین کر دیا ہے[3]

اسی لیے شیعوں میں تو کسی کو خلافت کا دعویٰ کرنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر بالفرض کوئی ایسی جسارت کرے بھی تو اسے فاسق اور دین سے خارج سمجھا جائے گا۔

لیکن اہلِ سنّت کے نزدیک خلافت کا فیصلہ شوریٰ اور لوگوں کی پسند سے ہوتا ہے۔ اس طرح اہلِ سنّت نے ایسا دروازہ کھول دیا ہے جسے اُمّت میں سے کسی شخص کے لیے بھی بند نہیں کیا جا سکتا اور اس طرح ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے لیے موقع ہے کہ وہ خلافت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے۔ خلافت کا حصول

---

[1] ابنِ عساکر، تاریخ دمشق جلد ۳ صفحہ ۵۔ خوارزمی، مناقب خوارزمی صفحہ ۴۲۔ ینابیع المودة صفحہ ۷۹۔

[2] حافظ قندوزی حنفی، ینابیع المودة جلد ۲ صفحہ ۳ بحوالہ دیلمی۔ خوارزمی، مناقب۔ محب الدین طبری، ذخائر العقبیٰ۔

[3] تعداد کی روایت بخاری و مسلم میں ہے۔ اور تعداد اور اسماء کی روایت کے لیے دیکھیے ینابیع المودة جلد ۳ صفحہ ۹۹۔

قریش ہی کے لیے نہیں بلکہ ایرانیوں، ترکوں، مغلوں حتیٰ کہ غلاموں کے لیے بھی ممکن ہوگیا۔ ایک شاعر نے خلافتِ اسلامیہ کا یوں نقشہ کھینچا ہے ؎

هَزَلَتْ حَتّٰى بَانَ مِنَ الْهُزَالِ
كِلَاهَا وَحَتّٰى اسْتَامَهَا كُلُّ مُفْلِسٍ

خلافت اس قدر لاغر ہوگئی ہے کہ دُبلے پن سے اس کے
گُردے نظر آنے لگے اور ہر مُفلس قلّاش نے اسے اپنی ماں بنالیا۔

وہ سب اقدار اور شرائط جن کا خلیفہ میں ہونا ضروری تھا، بھاپ بن کر ہوا میں اُڑ گئیں۔ ایسا ہونا قدرتی تھا کیونکہ بَشَر آخر بشر ہے، اس کے انسانی جذبات ہیں، خودغرضی اس کی جبلّت ہے۔ وہ اقتدار ملتے ہی بدل جاتا ہے اور پہلے سے بدتر ہوجاتا ہے۔

ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تصدیق اسلامی تاریخ سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں پر ایسے ایسے بدکاروں اور بدکرداروں نے حکومت کی ہے جن میں نہ حَیا تھی، نہ اَخلاق اور نہ ہی ایمان۔

مجھے ڈر ہے کہ بعض قارئین اسے مُبالغہ تصور کریں گے۔ لیکن اگر وہ اُمَویوں اور عبّاسیوں وغیرہ کی تاریخ کا مُطالعہ کریں تو انھیں معلوم ہوجائے گا کہ کوئی امیرُ المؤمنین کھُلّم کھُلّا شراب پیتے تھے، بندروں سے کھیلتے تھے اور بندروں کو سونے کے زیور پہناتے تھے۔ کسی امیرالمُومنین نے اپنی ایک کنیز کو اپنا لباس پہنا کر مُسلمانوں کو نماز پڑھانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ ایک امیرالمؤمنین کی حبابہ نامی باندی مرگئی تو یہ حضرت ہوش وحواس ہی کھو بیٹھے تھے۔ ایک امیرالمؤمنین کسی شاعر کے شعر سُن کر ایسے مَستائے کہ لگے اس کا عُضوِ تناسُل چُومنے۔ ہم ان لوگوں کے حالات بیان کرنے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ ان کے متعلق مسلمانوں کا پہلے ہی فیصلہ ہے کہ یہ محض کَٹ کھَنی بادشاہت کی نمائندگی کرتے تھے خلافت کی قطعاً نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم سے ایک قول منسوب ہے کہ

اَلْخِلَافَةُ مِنْ بَعْدِیْ ثَلَاثُوْنَ عَامًا ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَضُوْضًا.

میرے بعد تیس سال خلافت رہے گی اس کے بعد کٹ کھنی
بادشاہت ہوگی۔

میرے خیال میں اِس قول کو رسول اللہؐ سے منسوب کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان کو۔ جنھیں حضرت علیؑ سے افضل شمار کیا جاتا ہے بلکہ ذُوالنُّورَین اور کامِلُ الحَیاءِ وَالاِیمان کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے قتل کردیا تھا کیونکہ وہ ان سے تنگ آئے ہوئے تھے یہاں تک کہ انھوں نے حضرت عثمان کو مسلمانوں کے قبرستان "جنّتُ البقیع" میں دفن بھی نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ان کو بے غسل وکفن بقیع سے ملحق یہودیوں کے قبرستان "حشِّ کوکب" میں سپردِ خاک کیا گیا۔

جو شخص تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرے گا، اسے یہ دیکھ کر تعجّب ہوگا کہ خلفاء کے کرتوت عام لوگوں سے بھی بدتر تھے لیکن اس وقت ہماری بحث کا موضوع یہ نہیں ہے۔ جسے اِس بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق ہو، وہ طبری کی تاریخ الامم والملوک، ابنِ اثیر کی کامل التاریخ، ابو الفداء کی المختصر فی تاریخ البشر اور ابنِ قتیبہ دینوری کی الامامۃ والسیاسۃ وغیرہ سے رجوع کرے۔ میں صرف اپنی پسند سے خلیفہ مقرّر کرنے کی خرابی اور اس نظریہ کا بنیادی بانجھ پن دکھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ جس کو ہم آج پسند کرتے ہیں، عین ممکن ہے کہ کل وہ ہماری نظروں میں مردود قرار پائے اور یہ معلوم ہو کہ ہم نے غلطی کی تھی اور ہماری پسند صحیح نہیں تھی۔ ایسا ہو چکا ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے خود عثمان بن عفّان کو خلافت کے لیے پسند کیا لیکن بعد میں پچھتائے مگر اس وقت کیا ہو سکتا تھا جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔ عبدالرحمٰن بن عوف سابقینِ اوّلین میں سے ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ جب ان کی پسند درست ثابت نہیں ہوئی تو کیسے کوئی ہوش مند شخص ایسے بانجھ اور بے ثمر نظریے سے مطمئن ہو سکتا ہے جس نے صرف فتنہ وفساد، افراتفری اور خونریزی کو جنم دیا ہو۔ جب ابوبکر کی بیعت کی جا رہی تھی ـــ جو بقول عمر بن خطاب اچانک ہوگئی تھی لیکن اللہ نے اس کے بُرے نتائج سے محفوظ رکھا ـــ جس کی کتنے ہی صحابہ نے مخالفت کی اور جب علیؑ کی بیعت جو برسرِ عام ہوئی تھی بعض صحابہ نے

توڑ دی جس کے نتیجے میں جنگِ جَمَل، جنگِ صِفّین اور جنگِ نہروان واقع ہوئیں تو کیسے کوئی دانش مند اس نظریے سے مطمئن ہو سکتا ہے جو آزمایا گیا لیکن شروع ہی سے قطعی ناکام رہا بلکہ مُسلمانوں کے لیے وَبال ثابت ہوا۔ بالخصوص جب کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ جو شُوریٰ کے ذریعے سے خلیفہ کے انتخاب کے قائل ہیں ایک دفعہ کسی کے خلیفہ مقرر ہو جانے کے بعد نہ اسے تبدیل کر سکتے ہیں اور نہ معزول کر سکتے ہیں۔ جب عُثمان کو مسلمانوں نے معزول کرنا چاہا تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جو قمیص اللہ نے مجھے پہنائی ہے میں اسے نہیں اُتاروں گا۔

مغرب کی متمدّن قومیں جو جمہوریت کی چیمپئن بنی ہوئی ہیں سربراہِ مملکت کے انتخاب سے متعلق ان کے طریقہ کار کو دیکھ کر ہمیں اس نظریے سے اور بھی نفرت ہو جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیاں اقتدار کی دوڑ میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں، مختلف اداروں سے سودے بازی کرتی ہیں اور ہر قیمت پر اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اِس مقصد کے لیے اربوں ڈالر پروپیگنڈے پر خرچ کیے جاتے ہیں، جب کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقے کو اس رقم کی سخت ضرورت ہوتی ہے جیسے ہی کوئی شخص اس سیاسی کھیل کے ذریعے اقتدار کی کرسی تک پہنچ جاتا ہے تو وہ فوراً اپنے حامیوں، پارٹی ممبروں، دوستوں اور عزیز رشتہ داروں کا وزارت کے منصبوں، اعلیٰ عہدوں اور کلیدی انتظامی ذمّہ داریوں پر تقرر کر دیتا ہے اور دُوسرے لوگ سربراہی کی معینہ مُدّت ختم ہونے تک حزبِ اختلاف میں رہتے ہیں۔ اور اس پوری مدّت میں نہ صرف سربراہ کے لیے مشکلات اور رُکاوٹیں پیدا کرتے رہتے ہیں بلکہ حتیّٰ الامکان کوشش کرتے ہیں کہ اسے بدنام کریں اور ہو سکے تو عدمِ اعتماد کی تحریک کے ذریعے اس کا اقتدار ہی ختم کر دیں۔ اس سارے قضیے میں مجبور اور بے دست و پا قوم کی تقدیر میں صرف خسارہ ہی خسارہ ہے۔

مغربی نظامِ جمہوریت کے نتیجے میں کتنی انسانی اقدار پامال ہوتی ہیں اور آزادی اور جمہوریت کے نام پر اور پُرکشش نعروں کی آڑ میں کتنی سیاہ کاریاں فروغ پاتی ہیں!! یہاں تک کہ (بعض یورپی ملکوں شلاً برطانیہ میں) لواطت کو قانوناً جائز

قرار دے دیا گیا- اور نکاح کے بجائے زنا کو ترقی پسندی شمار کیا گیا- میں حیران ہوں کہ مغربی تہذیب کی برکات کو کہاں تک گنواؤں ! ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خُدا کی بستی دُکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خُودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اب دیکھیے! شیعہ عقیدہ کتنا عظیم اور کتنا فراخدلانہ ہے کہ اس کے مطابق خلافت اُصولِ دین میں شامل ہے، کیونکہ مُعاشرتی اور انفرادی زندگی کی درستگی کا دارومدار اسی پر ہے-

شیعوں کا یہ قول کہ منصب خلافت اللہ کے اختیار میں ہے ایک عاقلانہ اور صحّت مندانہ نظریہ ہے، جس کو عقل قبول کرتی ہے، ضمیر کا اطمینان ہوتا ہے اور جس کی تائید قرآن وسُنّت سے ہوتی ہے اور ساتھ ہی اس سے لالچیوں، غدّاروں اور مُنافقوں کی ہمّت شکنی ہوتی ہے اور ظالموں، گردن کشوں اور مُلوک وسلاطین کا غُرور خاک میں ملتا ہے-

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ.

ایک گروہ کو اس نے راہ دکھا دی اور ایک گروہ ہے کہ اس پر گمُراہی ثابت ہو چکی- انھوں نے شیطانوں کو اپنا رفیق بنالیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ ہم راہ پائے ہوئے ہیں-

(سورۂ اعراف - آیت ۳۰)

مسئلہ تقدیر - اہلِ سُنّت کی نظر میں

میری گزشتہ زندگی میں قضا و قدر کا موضوع میرے لیے ایک چیستان بنا ہوا تھا کیونکہ مجھے اس کی کوئی ایسی وضاحت نہیں ملتی تھی جو میرے دل کو لگے اور جس سے مجھے اطمینان حاصل ہو۔ میں اس سلسلے میں حیران و پریشان تھا۔

مجھے اہلِ سُنّت کے مدرسے میں یہ سکھایا گیا تھا کہ انسان اپنے افعال میں آزاد نہیں، وہ وہی کچھ کرتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے اور وہی کچھ بنتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ جب بچّہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس دو فرشتے بھیجتا ہے جو اس کی عمر، اس کی روزی اور اس کے اعمال کے بارے میں تفصیل لکھ دیتے ہیں۔ اور یہ بھی لکھ لیتے ہیں کہ وہ شقی ہوگا یا سعید[1] یعنی خوش نصیب ہوگا یا بدنصیب۔

میں عجب مخمصے میں گرفتار تھا کیونکہ ایک طرف تو مجھے یہ تعلیم دی گئی تھی، دُوسری طرف میری عقل اور میرا ضمیر یہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ عادِل ہے، وہ اپنی مخلوق پر ظُلم نہیں کرتا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کسی کو ایسے افعال پر مجبور کرے جس کا وہ بعد میں مُحاسبہ کرے یا کسی کو ایسے جرم کی پاداش میں عذاب دے جو خود اس نے اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہو اور جس کے اِرتکاب پر اسے مجبور کیا ہو۔ دوسرے مُسلمان نوجوانو کی طرح میں بھی اسی فِکری تضاد میں مُبتلا تھا اور میرا تصوّر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ قوی اور جبّار ہے، اس کی شان یہ ہے کہ

اس سے کچھ باز پُرس نہیں کی جا سکتی، اوروں سے باز پُرس ہوگی[2]۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب القدر۔

[2] لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (سورۂ انبیاء - آیت ۲۳)

وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیدُ ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اُس نے مخلوق کو پیدا کیا، کچھ کو جنّتی بنایا اور کچھ کو جہنمی۔ پھر یہ کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے وہ اپنے بندوں پر ذرّہ برابر بھی ظُلم نہیں کرتا۔ جیساکہ قرآن میں ہے:

تمھارا پروردگار اپنے بندوں پر ظُلم نہیں کرتا۔[1]

ایک اور آیت میں ہے:

"بے شک اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظُلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنے اوپر ظُلم کرتے ہیں"۔[2]

اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ شفیق ہے جتنی ماں اپنے بچّے پر ہوتی ہے"۔[3]

میں اسی فکری تضاد کے پیچ و خم میں الجھا ہوا تھا اور اس کی جھلک میرے قرآن کے سمجھنے میں بھی نظر آتی تھی۔ میں کبھی کہتا تھا کہ انسان خُود اپنا نگران ہے اور وہی اپنے اعمال کا ذمّہ دار ہے جیساکہ قرآن میں آیا ہے:

"جو کوئی ذرا سی نیکی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرا سی بدی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا"۔[4]

کبھی تو میں یہ سمجھتا تھا کہ انسان کو کوئی دوسری طاقت چلاتی ہے، اس کی اپنی کوئی قُوّت ہے اور نہ طاقت، وہ خُود اپنے کو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اور نہ اپنے لیے روزی کا بندوبست کرسکتا ہے۔ کیونکہ بفحوائے قرآن:

---

[1] وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (سورۂ حٰمٓ سجدہ۔ آیت ۴۶)

[2] اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (سُورۂ یونس۔ آیت ۴۴)

[3] صحیح بخاری جلد ۷ صفحہ ۷۵۔

[4] فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (سورۂ زلزال۔ آیت ۷-۸)

تم تو بس وہی چاہ سکتے ہو جو اللہ چاہے [1]

میں ہی نہیں بلکہ اکثر مسلمان اِسی فِکری تضاد میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر عُلماء و مشائخ سے جب قضا و قدر کے بارے میں گفتگو کی جائے تو ان سے کوئی ایسا جواب نہیں بن پڑتا جس سے دُوسروں کو تو کیا خُود انھیں بھی اطمینان ہو سکے۔ بس یہی کہہ دیتے ہیں کہ اس موضوع پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں بلکہ بعض تو تقدیر کی اِس بحث کو ہی حرام قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمان کے لیے صِرف اتنا ایمان لانا ضروری ہے کہ اچھّی بری تقدیر اللہ کی طرف سے ہے۔

اگر کوئی ضدّی ان سے پُوچھ بیٹھے کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ پہلے تو اپنے بندے کو گناہ کے اِرتکاب پر مجبور کرے اور پھر اسے نارِ جہنّم میں جھونک دے" تو فوراً اس پر کافر و زندیق ہونے کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم دین سے نکل گئے۔ غرض ایسے ہی لغو الزام لگائے جاتے ہیں۔

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلیں ٹھٹر کر رہ گئی ہیں اور لوگوں کا عقیدہ یہ ہو گیا ہے کہ جوڑے آسمانوں میں بنتے ہیں یعنی نکاح پہلے سے قسمت میں لکھا ہوتا ہے اور اسی طرح طلاق بھی۔ اور حد تو یہ ہے کہ زِنا بھی مقدّر ہوتا ہے۔ تقدیرِ مُبرَم کے ماننے والے کہتے ہیں کہ عورت کی شرمگاہ پر ان سب مردوں کے نام لکھے ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ صُحبت کرنے والے ہیں۔ یہی حال شراب پینے اور کسی کو قتل کرنے کا ہے۔ بلکہ یہی صُورت کھانے پینے کی ہے۔ تم وہ چیز کھا پی سکتے ہو جو اللہ نے تمھارے مقدّر میں لکھ دی ہے۔

ایک مرتبہ یہ مسائل پیش کرنے کے بعد میں نے اپنے یہاں کے ایک عالِم سے کہا کہ قُرآن تو ان خیالات کی تکذیب کرتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ رسولؐ، قرآن کے برعکس کچھ کہے۔ نکاح کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

جو عورتیں تمھیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو [2]

---

[1] وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (سورہ اِنسان - آیت ۳۰)

[2] فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ (سورہ نِساء - آیت ۳)

اِس آیت سے صاف اختیار اور آزادی کا اظہار ہوتا ہے۔
طَلاق کے متعلق قرآن کریم میں ہے:
"طَلاق تو دو ہی مرتبہ ہے، پھر یا تو رکھ لینا ہے قاعدے
کے مطابق یا چھوڑ دینا ہے خُوش دِلی کے ساتھ۔"[1]
یہاں بھی وہی اختیار کی بات ہے۔
زِنا کے متعلق ارشاد ہے:
"زنا کے پاس نہ پھٹکو کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔"[2]
اِس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار
سے کرتا ہے۔
شراب کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے:
"شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے ذریعے تمھارے
آپس میں دشمنی اور کینہ ڈال دے اور تمھیں ذِکرِ الٰہی اور نماز
سے روک دے۔ تو کیا تُم ان کاموں سے باز آجاؤ گے؟"[3]
اِس آیت میں شراب اور جُوئے کی مُمانعت کی گئی ہے جس کے معنیٰ یہی
ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے کہ چاہے تو شراب پیئے اور جُوا کھیلے یا پھر یہ کام نہ کرے۔
قتلِ عَمد کے بارے میں ارشاد ہے۔
"اللہ نے جس انسان کی جان کو محترم قرار دیا ہے اسے ناحق
قتل مت کرو۔"[4]

---

[1] اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ۔ سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۲۹
[2] وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِیْلًا۔ سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۱۳۲
[3] اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ سورۂ مائدہ۔ آیت ۹۱ - [4] وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ سورۂ انعام آیت ۱۵۲۔

ایک اور آیت میں ہے :

"جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنّم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا - اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور اس کے لیے دردناک عذاب تیار رکھے گا"[1]

اِس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اختیار ہے کہ وہ کسی کو قتل کرے یا نہ کرے -

کھانے پینے کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ حُدود مقرر کی ہیں - چنانچہ ارشاد ہے :

"کھاؤ پیو لیکن اِسْراف نہ کرو - اللہ اِسْراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"[2]

یہ آیت بھی آدمی کے اختیار پر ہی دلالت کرتی ہے -

یہ تمام آیات سُنانے کے بعد میں نے ان عالِم سے کہا : قبلہ! ان تمام قرآنی دلائل کے بعد بھی آپ یہی کہتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور بندہ اپنے افعال میں مختار نہیں، مجبور ہے ؟

ان عالم نے جواب دیا : تنہا اللہ تعالیٰ ہی ہے جو کائنات میں جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے - اور دلیل کے طور پر انھوں نے یہ آیت پڑھی :

"اے دُنیا جہان کے مالک تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے اور جسے چاہے عزّت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے - ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے -

---

[1] وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَاَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ۔ (سورۂ نساء - آیت ۹۳)

[2] وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا اِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ - (سورۂ اعراف آیت ۳۱)

بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے [1]

میں نے کہا کہ ہمارا اختلاف اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے بارے میں نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہے تو سب جنّ وانس اور دیگر تمام مخلوقات مل کر بھی اس کی مشیّت کے خلاف نہیں کر سکتے۔ سوال بندوں کے افعال کا ہے کہ آیا وہ ان کے افعال ہیں یا وہ اللہ کی طرف سے ہیں ؟؟

اِس پر ان عالم صاحب نے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (تمھارا عقیدہ تمھارے ساتھ اور میرا عقیدہ میرے ساتھ) کہہ کر بحث کا دروازہ بند کر دیا۔ ہمارے جو عُلمائے کرام اپنی رائے پر قائم رہتے ہیں اور اسے بدلنے پر کبھی تیار نہیں ہوتے عموماً ان کی آخری دلیل یہی ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ دو دن کے بعد میں اُن عالم صاحب سے پھر ملا اور میں نے کہا :

اگر آپ کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ کرتا ہے اور بندوں کو کچھ اختیار نہیں، تو آپ خلافت کے بارے میں بھی یہی بات کیوں نہیں کہتے کہ اللہ سُبحانہٗ جو چاہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے پسند کرتا ہے، بندوں کی مرضی کو کوئی دخل نہیں۔

وہ : جی ہاں ! میں یہی تو کہتا ہوں۔ اللہ نے ہی پہلے اَبُوبکر کو پسند کیا، پھر عُمر کو، پھر عُثمان کو، پھر علی کو۔ اگر اللہ یہ چاہتا کہ علی خلیفۂ اول ہوں تو جنّ وانس مل کر بھی علیؑ کو خلیفہ اوّل ہونے سے نہیں روک سکتے تھے۔

میں : یہ کہہ کر تو آپ پھنس گئے۔

وہ : میں کیسے پھنس گیا ؟

---

[1] قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (سورہ آل عمران - آیت ۲۶)

میں : اب یا تو آپ یہ کہیں کہ اللہ نے چار خُلفائے رَاشِدین کو تو خود پسند کرلیا، اس کے بعد یہ کام لوگوں پر چھوڑ دیا کہ جس کو چاہیں پسند کرلیں یا پھر یہ کہیں کہ اللہ نے لوگوں کو بالکل اختیار نہیں دیا بلکہ رسول اللہ صؐ کی وفات سے لے کر تا قیامِ قیامت سب خُلفاء کو وہی پسند کرتا ہے؟

وہ : میں دوسری شق کا قائل ہوں : قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ۔

میں : اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ اسلام میں بادشاہوں اور کجکلاہوں کی وجہ سے کجی واقع ہوئی وہ اللہ کی طرف سے تھی۔ کیونکہ اللہ ہی نے انھیں حکومت عطا کرکے مسلمانوں پر مسلّط کیا تھا۔

وہ : جی ہاں! یہی بات ہے۔ بعض صُلحاء نے اس آیت میں اَمَرْنَا کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی : وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّھْلِكَ قَرْیَةً اَمَّرْنَا مُتْرَفِیْھَا۔ مطلب یہ کہ ہم نے اُنھیں حاکِم بنادیا۔

میں : (تعجّب سے) اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہی نے چاہا تھا کہ ابنِ مُلجَم علیؑ کو قتل کرے اور یزید کے ہاتھوں حُسینؑ بن علیؑ کا قتل ہو۔

وہ : (فتحمندانہ لہجے میں) جی ہاں! بالکل۔ کیا آپ نے نہیں سُنا کہ رسول اللہ صؐ نے حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہٗ سے فرمایا تھا کہ بعد میں آنے والوں میں سب سے شقی وہ ہوگا جو تمھارے سر کو دو پارہ کرکے چہرے کو خُون سے تربتر کردے گا۔ اِسی طرح رسول اللہ صؐ نے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات بتادی تھی کہ سَیّدنا حُسینؑ کو کربلا میں قتل کردیا جائے گا۔ نیز آپ نے یہ خبر بھی دی تھی کہ سیّدنا حَسن رَضِی اللہُ عنہ مُسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صُلح کرائیں گے اس طرح ہر شے ازل سے لکھی ہوئی ہے۔ جو کچھ مُقدّر میں لکھا ہے اس سے انسان کو مَفَر نہیں۔ اس طرح آپ ہار گئے ہیں، میں نہیں۔

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ پھُولے نہیں سما رہے ہیں۔ کیونکہ بخیالِ خویش وہ میرے مقابلے میں جیت گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اِن حضرت کو کیسے سمجھاؤں کہ اللہ تعالیٰ کو کسی واقعے کا علم ہونے کے قطعی یہ معنیٰ نہیں کہ اللہ

نے وہ واقعہ تقدیر میں لکھ دیا ہے یا لوگوں کو اس پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ یہ نظریہ ان صاحب کے دماغ میں بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ اِس لیے میں نے ایک اور سوال کیا کہ

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نئے اور پُرانے سب بادشاہ اور وہ سب لوگ جو اسلام اور مُسلمانوں سے لڑتے رہے ہیں، اللہ کے مقرّر کیے ہوئے ہیں؟

وہ : اِس میں کیا شک ہے۔

میں : کیا وہ فرانسیسی نوآبادیاتی حکومت جس نے تیونس، الجزائر اور مراکش پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ بھی اللہ کی طرف سے تھی؟

وہ : جی ہاں! اور جب مقررہ وقت آیا تو فرانس ان ملکوں سے نکل گیا۔

میں : بہت خوب! پھر آپ پہلے کیسے اہلِ سُنّت کے اِس نظریہ کا دفاع کر رہے تھے کہ رسول اللہؐ نے وفات پائی مگر خلافت کا معاملہ شوُرٰی پر چھوڑ دیا کہ مسلمان جسے چاہیں خلیفہ بنالیں؟

وہ : جی ہاں! میں اب بھی اسی پر قائم ہوں اور انشاءاللہ قائم رہونگا۔

میں : پھر آپ ان دونوں باتوں میں کیسے تطبیق دیتے ہیں: ایک اللہ کا اختیار اور دُوسرے شوُرٰی کے ذریعے مُسلمانوں کا اختیار؟

وہ : جب مسلمانوں نے ابُوبکر کو پسند کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بھی انھیں پسند کر لیا۔

میں: کیا سقیفہ میں خلیفہ کو منتخب کرنے کے بارے میں کوئی وحی نازل ہوئی تھی؟

وہ : اَستَغفِرُاللہ! محمدؐ کے بعد کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ یہ شیعوں کا عقیدہ ہے۔

میں : شیعوں کو اور ان کے باطل عقائد کو چھوڑیے۔ آپ اپنے عقیدے کے مطابق ہمیں قائل کیجیے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ابُوبکر کو پسند کر لیا تھا؟

وہ : اگر اللہ کا ارادہ کچھ اور ہوتا تو مُسلمان اور سارا جہان مل کر بھی اللہ

کے ارادے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔
اس وقت میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ نہ سوچتے ہیں، نہ قرآنی آیات پر غور کرتے ہیں۔ ان کی رائے کبھی بھی کسی علمی نظریے کے مطابق نہیں ہو سکتی۔
اِس پر مجھے ایک اور قصہ یاد آگیا:
ایک دن میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کھجور کے باغ میں ٹہل رہا تھا اور ہم قضا و قدر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں میرے سر پر ایک پکی ہوئی کھجور گری۔ میں نے اسے کھانے کے لیے گھاس پر سے اُٹھا کر مُنہ میں رکھ لیا۔ میرے دوست نے کہا: تم وہی چیز کھا سکتے ہو جو تمھارے نصیب میں ہو کیونکہ دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔
میں نے کہا: اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لکھی ہوئی ہے تو پھر میں اسے نہیں کھاؤں گا یہ کہہ کر میں نے اسے پھینک دیا۔
میرے دوست نے کہا: سُبحان اللہ! اگر کوئی چیز تمھارے نام پر لکھی ہوئی نہ ہو تو اللہ اسے تمھارے پیٹ میں سے بھی نکال لے گا۔
میں نے کہا: اگر یہ بات ہے تو میں اسے کھا لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے اسے دوبارہ اٹھا لیا۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کا کھانا یا نہ کھانا میرے اپنے اختیار میں ہے۔ میرا دوست مجھے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ میں اس کھجور کو چبا کر نگل گیا۔ اس وقت میرے دوست نے کہا: دیکھا یہ تمھارے نام پر ہی لکھی ہوئی تھی۔ اس طرح وہ اپنے خیال میں مجھ سے جیت گیا۔ کیونکہ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اب میں اس کھجور کو پیٹ میں سے نکال لیتا۔
جی ہاں! اہل سُنّت کا قضا و قدر کے بارے میں یہی عقیدہ ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ جب میں سُنّی تھا تو میرا یہی عقیدہ تھا۔
قدرتی بات ہے کہ میں اس عقیدے کی وجہ سے جو فکری تضاد پر مبنی تھا پریشان رہتا تھا اور یہ بھی قدرتی بات ہے کہ اس عقیدے کی وجہ سے ہم لوگ جمُود کا شکار ہیں۔ ہم اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ اللہ ہماری حالت بدل دے۔ یہ نہیں کہ ہم خود اپنی حالت بدلیں تاکہ اللہ واقعی ہماری حالت بدل دے

ہم اپنی ذمہ داری سے بھاگتے ہیں اور اپنی ذمہ داری کو اللہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ کسی چور، ڈاکو سے یا شرابی، زانی اور جواری سے یا اس مجرم سے بات کریں جس نے کسی نابالغ لڑکی کو اغوا کر کے اس سے اپنی شہوت کی آگ بجھانے کے بعد اسے قتل کر دیا ہو، تو وہ یہی کہے گا کہ ع "وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔" میں کیا کر سکتا تھا، میری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ یہ عجب خدا ہے جو پہلے تو انسان کو حکم دیتا ہے کہ اپنی بیٹی کو زندہ دفن کر دے۔ پھر پوچھتا ہے کہ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ۔

یہ بھی جان لیجیے کہ ان باتوں کی وجہ سے مغربی مفکرین اور دانشور ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہماری کم سمجھی پر ہنستے ہیں۔ اہلِ یورپ اسی عقیدۂ تقدیر کو عربوں کی جہالت اور ان کی پس ماندگی کا خاص سبب بتلاتے ہیں۔

یہ بھی قدرتی امر ہے کہ محققین نے دریافت کیا ہے کہ اس عقیدہ کو اُموی حکمرانوں نے رواج دیا۔ وہ کہتے تھے چونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکومت عطا کی ہے اس لیے ان کی اطاعت فرض ہے۔ جس نے ان کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو ان کی مخالفت کرتا ہے وہ باغی ہے اور بغاوت کی سزا موت ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کے متعدد شواہد موجود ہیں۔

عثمان بن عفان ہی کی مثال لیں۔ جب لوگوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں، تو انھوں نے کہا کہ میں وہ قمیص نہیں اتاروں گا جو اللہ نے مجھے پہنائی ہے[1] گویا ان کی رائے کے مطابق خلافت وہ لباس تھا جو اللہ نے انھیں پہنایا تھا۔ کسی کو حق نہیں تھا کہ وہ یہ لباس ان سے چھین لے، بجز اللہ تعالیٰ کے کہ وہی یہ لباس اتار سکتا ہے یعنی ان کی موت کی صورت میں۔

اسی طرح معاویہ بن ابی سفیان نے اپنے ایک خطبے میں کہا تھا کہ "میں نے تم سے اس لیے جنگ نہیں کی تھی کہ تم نماز پڑھو، روزے رکھو یا حج کرو اور زکات دو۔ میں نے تو اس لیے جنگ کی تھی کہ تم پر حکومت

---

[1] تاریخ طبری اور تاریخ ابن اثیر "عثمان کا محاصرہ"

کروں - اللہ نے میری یہ خواہش پوری کردی حالانکہ تمھیں یہ بات ناگوار ہے۔"

یہ عثمان سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ پر الزام ہے، کہ اس نے مسلمانوں کے قتل میں مدد دی - معاویہ کا یہ خطبہ مشہور ہے - [1]

لوگوں کی مرضی کے خلاف یزید کو زبردستی ولی عہد مقرر کرتے وقت بھی معاویہ نے یہی دعویٰ کیا تھا کہ اللہ نے یزید کو میرا جانشین بنا دیا ہے - مورخین نے معاویہ کا وہ مکتوب نقل کیا ہے جو اس نے اس موقع پر چہار طرف بھیجا تھا - والئ مدینہ مروان بن حکم کو لکھا تھا کہ

"اللہ نے میری زبان سے بیعتِ یزید کا فیصلہ صادر کرا دیا ہے۔" [2]

جب امام زین العابدینؑ کو زنجیروں میں باندھ کر فاسق و فاجر ابنِ زیاد کے سامنے لے جایا گیا تو اس نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ علی بن الحسینؑ ہیں - اس نے کہا: کیا اللہ نے حسینؑ بن علیؑ کو ہلاک نہیں کر دیا؟ امام زین العابدینؑ کی پھوپھی جناب زینبؑ نے جواب دیا: نہیں! انھیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں نے قتل کر دیا - ابنِ زیاد نے کہا: دیکھا! اللہ نے تمھارے گھر والوں کے ساتھ کیا کیا؟ اس پر جناب زینبؑ نے کہا: میں نے تو جو کچھ دیکھا اچھا ہی دیکھا ہے - اللہ نے ان کے لیے قتل ہونا لکھا تھا سو وہ اپنی قبروں میں جا سوئے عنقریب اللہ تجھے اور انھیں ایک جگہ جمع کرے گا وہاں دیکھ لینا کیا ہوتا ہے تیری ماں تجھ پر روئے اے ابنِ مرجانہ! [3]

اِس طرح یہ عقیدہ بنی اُمیّہ اور ان کے حامیوں سے چل کر اُمّتِ اسلامیہ میں پھیل گیا۔

---

[1] ابوالفرج اصفہانی، مقاتل الطالبیین صفحہ ۷۰ - حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۱ - شرح نہج البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۱۶
[2] ابنِ قتیبہ، الامامہ والسیاسہ جلد ۱ صفحہ ۱۵۱
[3] ابوالفرج اصفہانی، مقاتل الطالبیین مقتل حسین -

قضا و قدر کے بارے میں شیعہ عقیدہ

جیسے ہی شیعہ علماء[1] سے میری واقفیت ہوئی اور میں نے ان کی کتابیں پڑھیں، قضا وقدر کے بارے میں ایک بالکل نیا علم مجھ پر منکشف ہوگیا۔ایک مرتبہ کسی نے امام علی علیہ السلام سے قضا وقدر کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ نے غیر مبہم، صاف اور جامع الفاظ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"افسوس! شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ قضا و قدر نے لازمی اور حتمی فیصلہ کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر جزا و سزا کا سوال ہی نہ ہوتا اور نہ وعدہ وعید کا کچھ مطلب ہوتا۔ اللہ نے اپنے بندوں کو جن کاموں کا حکم دیا ہے، ان کا اختیار بھی دیا ہے اور جن کاموں سے منع کیا ہے، ان کا نقصان بھی بتلا دیا ہے اللہ نے انسان کو تھوڑے سے کام کا مکلف ٹھہرایا ہے اور کوئی مشکل کام نہیں بتلایا۔ پھر یہ کہ تھوڑے کام پر بہت زیادہ اجر کا وعدہ کیا ہے۔ نہ کوئی اللہ کی نافرمانی پر مجبور ہے اور نہ کسی پر اس کی اطاعت کے لیے زبردستی ہے۔ اس نے انبیاء کو کھیل کے طور پر نہیں بھیجا اور کتابوں کو فضول نہیں اتارا۔ اس نے آسمانوں کو، زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ یہ تو کافروں کا گمان ہے۔ ان کافروں کی تو دوزخ میں شامت آجائے گی۔"[2]

یہ بیان کتنا واضح اور کتنا غیر مبہم ہے۔ میں نے اِس موضوع پر اس سے جامع و قاطع بیان اور حقیقت کے اظہار میں اس سے بہتر دلیل نہیں دیکھی۔ اللہ

---

[1] جیسے آیت اللہ سید محمد باقر صدر جن سے میں نے خوب استفادہ کیا۔ آیت اللہ سید ابوالقاسم خوئی، علامہ محمد علی طباطبائی اور سید حکیم وغیرہ۔

[2] شیخ محمد عبدہٗ، شرح نہج البلاغہ جلد ۴ صفحہ ۶۷۳۔

نے ہمیں حکم دیا ہے لیکن اسے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار بھی دیا ہے۔
یہی مطلب ہے اس کا کہ اللہ نے اپنے بندوں کو جن کاموں کا حکم دیا ہے ان کا اختیار بھی دیا ہے۔ اسی طرح جن کاموں سے اللہ سُبحانہٗ نے منع کیا ہے ان کے بارے میں تنبیہ بھی کردی ہے کہ اس قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں وہ سزا کا مستحق ہوگا۔
امام علی علیہ السلام نے اس مسئلے کی یہ کہہ کر مزید توضیح فرمادی ہے کہ نہ کوئی اللہ کی نافرمانی پر مجبور ہے اور نہ کسی پر اس کی اطاعت کے لیے زبردستی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ اپنے بندوں کو کسی کام پر مجبور کرنا چاہتا تو اس سے کون جیت سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے خُود اپنے بندوں کو اطاعت اور نافرمانی کی طاقت اور اختیار دے دیا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔

آپ کہہ دیجیے کہ حق تمھارے پروردگار کی طرف سے آچکا ہے، اب جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔
(سورۂ کہف ۔ آیت ۲۹)

اِس کے بعد امامؑ انسانی ضمیر کو مخاطب کرتے ہیں تاکہ بات دل کی گہرائیوں تک اُتر جائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ
"انسان اپنے افعال میں مجبور ہوتا تو انبیاء کا بھیجا جانا اور کتابوں کا نازل کیا جانا محض ایک مذاق ہوتا، جس سے اللہ جَلَّ شَانُہٗ پاک ہے، کیونکہ انبیاء کا آنا اور کتابوں کا نازل ہونا محض لوگوں کی اصلاح، ان کی رُوحانی بیماریوں کے علاج اور کامیاب زندگی گزارنے کے بہترین طریقے کی وضاحت کے لیے ہے۔"
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ۔

بیشک یہ قرآن ایسے طریقے کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا

ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل۔آیت ۹)

امامؑ اپنی بات کو یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ

"عقیدۂ جبر کے یہ معنیٰ ہیں کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اس کو بے مقصد پیدا کیا گیا ہے حالانکہ ایسا کہنا کفر ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے عذابِ جہنّم کی دھمکی دی ہے۔"

جب ہم قضا و قدر کے بارے میں شیعہ نظریے کا بغور مُطالعہ کرتے ہیں تو اسے مناسب اور معقول پاتے ہیں جب کہ ان کے مقابل میں ایک گروہ نے تفریط سے کام لیا اور وہ جبر کا قائل ہوگیا، دوسرے نے اِفراط سے کام لیا اور وہ تفوِیض کا قائل ہوگیا۔ پھر عقائد کی درستگی کے لیے ائمہؑ آئے تو انھوں نے ان دونوں فریقوں کو حق کا راستہ دکھایا اور کہا کہ

لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِیْضَ وَلٰکِنْ اَمْرٌ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ.

کام میں نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے اس بات کو ایک ایسی سادہ مثال سے سمجھایا ہے جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جو ہر شخص کی عقل کے مطابق ہے۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ "نہ جبر نہ تفویض بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک چیز"؟ آپ نے اس کے جواب میں کہا: تمھارے زمین پر چلنے اور زمین پر گرنے میں فرق ہے۔ مطلب یہ تھا کہ زمین پر ہم اپنے اختیار سے چلتے ہیں لیکن جب ہم گرتے ہیں تو یہ گرنا ہمارے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی گرنا نہیں چاہتا۔ کون چاہے گا کہ گرے تاکہ اس کی کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ جائے اور وہ معذور ہوجائے؟

اِس لیے قضا و قدر جبر و تفویض کے درمیان ایک چیز ہے۔ یعنی کچھ کام ایسے ہیں جو ہم اپنے ارادے اور اختیار سے کرتے ہیں، اور کچھ کام ایسے ہیں جن پر ہمارا بس نہیں چلتا اور اگر ہم ان کو روکنا بھی چاہیں تو روک نہیں سکتے۔ پہلی قسم کے کاموں کا ہمیں حساب دینا ہوگا اور دوسری قسم کے کاموں کا حساب

نہیں ہوگا۔ اس طرح انسان کو بیک وقت اختیار ہے بھی اور نہیں بھی۔
الف : جن کاموں کا انسان کو اختیار ہے وہ ان کو سوچ سمجھ کر کرتا ہے کیونکہ اسے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا وہ اس کام کو کرے یا نہ کرے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں اشارہ کیا ہے :

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ
تَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا

قسم ہے جان کی اور جس نے اسے درست کیا، پھر نیکی اور بدی کی دونوں راہیں اسے بتا دیں۔ وہ یقیناً بامُراد ہوگیا جس نے اپنی جان کو پاک کرلیا۔ اور وہ یقیناً نامُراد ہوا جس نے اسے گناہ کرکے دبا دیا۔ (سورۂ شمس۔ آیت ۶ تا ۱۰)

نَفْس کو پاک کرنا یا نہ کرنا نتیجہ ہے اس کا کہ انسانی ضمیر کو اختیار حاصل ہے۔ اسی طرح کامرانی اور نامُرادی منصفانہ نتیجہ ہے اختیار کے استعمال کا۔
ب : جن کاموں کا انسانوں کو اختیار نہیں وہ، وہ قوانینِ فطرت ہیں جو کُلّی طور پر اللہ کی مشیّت کے تابع ہیں۔ مثلاً مرد یا عورت ہونا انسان کے اپنے اختیار میں نہیں۔ نہ اس کا رنگ رُوپ اس کے اپنے اختیار میں ہے، نہ یہ اس کے بس میں ہے کہ اس کے ماں باپ کون ہوں، وہ غریب گھرانے میں پیدا ہو یا خُوشحال گھرانے میں۔ نہ اس کا اپنے قد وقامت پر بس ہے نہ اپنی شکل وصورت پر اختیار ہے۔
انسان متعدد زبردست عوامل کے تابع ہے جیسے موروثی امراض، یا طبعی قوانین جو اس کے فائدے کے لیے کام کرتے ہیں اور اسے ان کے سلسلے میں کوئی مشقّت برداشت نہیں کرنی پڑتی۔ چنانچہ انسان جب تھک جاتا ہے تو اُسے نیند آجاتی ہے اور وہ سو جاتا ہے اور جب آرام کرچکتا ہے تو جاگ جاتا ہے جب بُھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتا ہے اور جب پیاس لگتی ہے تو پانی پیتا ہے۔ جب خُوش ہوتا ہے کِھلکِھلا اُٹھتا ہے، ہنستا ہے اور جب غمگین ہوتا ہے، پژمُردہ ہوجاتا ہے، روتا ہے۔ اس کے جسم کے اندر فیکٹریاں اور ورکشاپیں کام کررہی ہیں جو

ہارمون، زندہ خلیے اور سیّال مادّے بناتی ہیں اور ساتھ ہی جسم کی عجب متوازن طریقے سے تعمیر کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ انسان کو احساس بھی نہیں ہونے پاتا کہ عنایاتِ ربّانی ہر لحظہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس کی زندگی میں بھی بلکہ مرنے کے بعد بھی۔ اِس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى.

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یُونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا یہ پہلے ایک قطرۂ منی نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا۔ پھر وہ خُون کا لوتھڑا ہوگیا۔ پھر اللہ نے اسے بنایا اور درست کیا۔ پھر اس کی دو قسمیں کردیں مرد و عورت۔ تو کیا اللہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کردے۔ (سورۂ قیامت۔ آیات ۳۶ تا ۴۰)

سچ کہا تونے اے ہمارے پالنہار! تونے ہی ہمیں پیدا کیا اور ہمارے اعضاء کو درست کیا۔ تُو ہی مَوت دے گا اور تُو ہی پھر زندہ کرے گا۔ پھٹکار ان پر جو تیری مخالفت کرتے ہیں اور تجھ سے دُوری اختیار کرتے ہیں، انھوں نے تجھے نہیں پہچانا۔

ہم اِس بحث کو امام علی رضاؑ کے ایک قول پر ختم کرتے ہیں۔ مامون الرشید کے عہد میں جب کہ ابھی آپ کی عمر پورے چودہ سال کی بھی نہیں تھی کہ آپ کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم تسلیم کرلیا گیا تھا[1]

ایک دفعہ کسی شخص نے آپ سے آپ کے دادا امام جعفر صادقؑ کے اِس قول کے معنیٰ پُوچھے کہ لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيْضَ وَلٰكِنْ اَمْرٌ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ تو آپ نے فرمایا: جو شخص یہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ کرتا ہے پھر اللہ ان افعال پر ہمیں عذاب بھی دیتا ہے، وہ جَبر کا قائل ہے۔ اور جو شخص

---

[1] ابنِ عبدِ ربّہٖ اندلسی، العقد الفرید جلد ۳ صفحہ ۴۲

یہ کہتا ہے کہ اللہ نے پیدا کرنے اور رِزق دینے کا کام اماموں کے سپرد کر دیا ہے، وہ تفویض کا قائل ہے۔ جو شخص جبر کا قائل ہے وہ کافر ہے اور جو تفوِیض کا قائل ہے، وہ مُشرک ہے۔

اَلْاَمْرُ بَیْنَ الْاَمْرَیْن کے معنیٰ ہیں ان افعال کو بجالانا جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان افعال سے بچنا جن سے اس نے منع کیا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ قُدرت بخشی ہے کہ وہ بُرائی کرے یا نہ کرے۔ ساتھ ہی اسے بُرائی سے منع کیا ہے۔ اِسی طرح اسے یہ بھی قُدرت بخشی ہے کہ وہ نیکی کا کام کرے یا نہ کرے۔ لیکن اسے نیکی کے کام کرنے کا حکم دیا ہے۔

جانِ عزیز کی قسم! قضا و قدر کے بارے میں امامِ ثامن کا یہ بیان کافِی وشافِی ہے، جس کو ہر شخص تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سمجھ سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سچ فرمایا ہے، جب آپ نے ائمّہ کے بارے میں کہا:

> "ان سے آگے نہ بڑھنا اور ان سے پیچھے نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان کو سکھانے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔" [۱]

قضا و قدر کی بحث کے ضمن میں خلافت پر تبصرہ

اِس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ اہلِ سُنّت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اور بندوں کے اعمال اللہ چلاتا ہے اور بندوں کو اس ضمن میں کوئی اختیار نہیں۔ لیکن خلافت کے معاملے میں وہ کہتے ہیں کہ اسے رسول اللہ ص نے شوریٰ پر چھوڑ دیا تھا کہ لوگ جس کو پسند

---

[۱] ابن حجر، الصواعق المحرقہ صفحہ ۱۴۸۔ ہیثمی، مجمع الزوائد جلد ۹ صفحہ ۱۶۳۔ سلیمان قندوزی، ینابیع المودة صفحہ ۴۱۔ سیوطی، الدر المنثور جلد ۲ صفحہ ۶۰۔ علی متّقی ہندی کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۱۶۸ ابنِ اثیر اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۱۳۷۔ حامد حسین عبقات الانوار جلد ۱ صفحہ ۱۸۴۔

کریں اسے خلیفہ بنالیں ۔
اس کے بالکل برعکس ، اگرچہ شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے سب اعمال کا اختیار ہے اور اللہ کے بندے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں مگر خلافت کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہاں بندوں کو پسند کا کوئی حق نہیں ۔
پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ سُنّت کے نقطۂ نظر میں بھی تضاد ہے اور اہلِ تشیّع کے نقطۂ نظر میں بھی تضاد ہے ۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ۔
جب اہلِ سُنّت یہ کہتے ہیں کہ "اللہ اپنے بندوں کے اعمال چلاتا ہے" تو ان کا یہ قول فی الواقع جو کچھ ہوتا ہے اس سے متضاد ہے ۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اگرچہ اصل اختیار اللہ کو ہے لیکن ظاہری طور پر کچھ اختیار بندوں کو بھی ہے چنانچہ بروزِ سقیفہ بظاہر تو ابوبکر کو عمرؓ اور دوسرے بعض صحابہ نے منتخب کیا تھا ، لیکن درحقیقت وہ اللہ کے حکم کو عملی جامہ پہنا رہے تھے اور ان کی حیثیت اہلِ سُنّت کے خیال کے مطابق محض ایک واسطے کی تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔
اس کے برخلاف شیعہ جب یہ کہتے ہیں کہ اللہ سُبحانہٗ نے اپنے بندوں کو ان کے افعال کا اختیار دیا ہے تو ان کے اس قول میں اور اس قول میں کہ خلافت کے معاملے کا اختیار صرف اللہ کو ہے ، کوئی تضاد نہیں ہوتا ۔ کیونکہ نبوّت کی طرح خلافت بھی بندوں کا عمل نہیں اور نہ اس کو طے کرنا ان کے سپرد ہے ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو انسانوں میں سے پسند کر کے مبعوث فرماتا ہے ، بالکل یہی صورت خلیفۂ رسول کی ہے ۔ لوگوں کو اختیار ہے کہ وہ اللہ کے حکم کی تعمیل کریں یا اس کی نافرمانی کریں ۔ خود انبیاءؑ کی زندگی میں ہمیشہ ایسے ہی ہوتا رہا ہے ۔
اللہ کی پسند کے بارے میں بھی بندوں کو آزادی ہے ۔ نیک اور مومن اللہ کی پسند کو قبول کرتے ہیں اور کُفرانِ نعمت کرنے والے اللہ کی پسند کو قبول کرنے سے انکار کرتے اور اس کے خلاف بغاوت اور سرکشی کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی وَمَنْ
اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ

يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰى
وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا
فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۔

جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا اور نہ تکلیف میں پڑے گا اور جو کوئی میری نصیحت سے مُنہ موڑے گا اس کے لیے تنگی کا جینا ہو گا اور قیامت کے دن ہم سے اندھا اُٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے میرے پروردگار! تُو نے مجھے اندھا کیوں اُٹھایا میں تو آنکھوں والا تھا؟ اللہ کہے گا: یہ تو ٹھیک ہے لیکن جیسے تیرے پاس ہماری نشانیاں پہنچی تھیں اور تُو نے انھیں بُھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج ہم تجھے بھلا دیں گے۔"
(سورۂ طٰہٰ۔ آیات ۱۲۳ تا ۱۲۶)

پھر اہلِ سُنّت والجماعت کا نظریہ اِس خاص مسئلے یعنی خلافت کے بارے میں دیکھیے۔ وہ کسی فریق کو بھی الزام نہیں دیتے۔ کیونکہ جو کچھ ہُوا اور جتنا خُون بہایا گیا اور جو بھی بدعُنوانیاں ہوئیں، سب اللہ کی طرف سے تھیں۔ ایک شخص نے جو صاحبِ علم ہونے کا مُدّعی تھا مجھ سے کہا تھا:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ

اگر تیرا پروردگار نہ چاہتا تو وہ یہ سب کچھ نہ کرتے۔

لیکن شیعہ نظریہ یہ ہے کہ ہر اس شخص کو ذمّہ داری اُٹھانی پڑے گی جو بھی کجروی کا سبب بنا اور جس نے بھی اللہ کی نافرمانی کی اس کو نہ صرف اپنی غلطی کا بوجھ اُٹھانا ہو گا بلکہ ان کی غلطیوں کا بھی جو قیامت تک اس کا اتباع کریں گے، کیونکہ

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ۔

تم میں سے ہر شخص اپنے زیرِ سرپرستی افراد کا ذمّہ دار ہے۔

رسولؐ کے ترکہ کے بارے میں اختلاف

گزشتہ مباحث سے ہمیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ خلافت کے بارے میں اہلسنّت کی کیا رائے ہے، اور شیعوں کی کیا رائے ہے، اور ہر فریق کے قول کے بموجب رسول اللہؐ نے اس سلسلے میں کیا اقدام کیا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کیا رسول اللہؐ نے کوئی ایسی قابل اعتماد چیز چھوڑی ہے جس کی طرف اختلاف کی صورت میں رُجوع کیا جاسکے۔ کیونکہ اختلاف کا ہونا تو فطری ہے جیسا کہ خود کتابُ اللہ سے معلوم ہوتا ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا.

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور ان کی جو تم میں سے اُولی الامر ہیں۔ اگر تم میں کسی بات پر کوئی نزاع پیدا ہو تو اس کو لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روزِ آخرت پر۔ یہ طریقہ اچھا ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔ (سورۂ نساء۔ آیت ۵۹)

جی ہاں! رسول اللہؐ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُمّت کے لیے کوئی ایسی بُنیاد چھوڑ جائیں جو اُمّت کے لیے سہارے کا کام دے۔ رسول اللہؐ تو رحمۃٌ للعالمین تھے، ان کی شدید خواہش تھی کہ اُن کی اُمّت دنیا میں بہترین اُمّت ہو اور آپ کے بعد اس میں اختلاف پیدا نہ ہو۔ اِسی لیے صحابہ اور مُحدثین سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

میں تمھارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ تم جب تک ان کو تھامے رہوگے میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے کتابُ اللہ اور میرے اہلِ بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے

کبھی جُدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر پہنچ جائیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم میرے بعد ان کے ساتھ کیسا سُلوک کرتے ہو۔

یہ صحیح حدیث ہے اور فریقین کے محدّثین نے اپنی کتابوں میں تیس سے زیادہ صحابہ کے حوالے سے اسے روایت کیا ہے۔

چُونکہ میری عادت ہے کہ میں شیعوں کی کتابوں اور شیعہ علماء کے اقوال سے استدلال نہیں کیا کرتا۔ اس لیے میرے لیے ضروری ہے کہ میں ان علمائے اہلِ سُنّت کے نام گنواؤں جنھوں نے اس حدیثِ ثقلین کی صحّت کا اعتراف کیا ہے اور اسے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اگرچہ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ شیعہ اقوال سے بھی استدلال کیا جائے۔ بہرحال یہ ہے مختصر فہرست ان عُلمائے اہلِ سُنّت کی، جنھوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے:

۱ــــ مُسلم بن حجّاج نیشاپوری، صحیح مُسلم فضائل علی بن ابی طالبؑ جلد ۷ صفحہ ۱۲۲

۲ــــ محمد بن عیسیٰ سَلمی ترمذی، جامعُ الترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۸

۳ــــ احمد بن شعیب بن علی نسائی خصائِص امیرالمومنین صفحہ ۲۱

۴ــــ احمد بن محمد بن حنبل مُسند احمد جلد ۳ صفحہ ۱۷

۵ــــ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری المُستدرک علَی الصّحِیحَین، جلد ۳ صفحہ ۱۰۹

۶ــــ علاء الدین علی متّقی ہندی کنزُ العُمّال من سُنَنِ الاقوالِ و الافعالِ جلد ۱ صفحہ ۱۵۴

۷ــــ محمد بن سعد زہری بصری الطبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۹۴

۸ــــ عزّ الدین ابنِ اثیر جزری جامعُ الأصول جلد ۱ صفحہ ۱۸۷

۹ــــ حافظ جلال الدین سُیوطی الجامعُ الصغیر جلد ۱ صفحہ ۳۵۳

۱۰ــــ حافظ نُور الدین علی بن ابی بکر ہیثمی مجمعُ الزوائد ومَنبعُ الفوائد جلد ۹ صفحہ ۱۶۳

۱۱۔۔۔ نبہانی الفتحُ الکبیر جلد ۱ صفحہ ۴۵۱
۱۲۔۔۔ عزّالدین ابنِ اثیر جزری اُسدُ الغابۃ فی مَعرفۃ الصحابۃ جلد ۲ صفحہ ۱۲
۱۳۔۔۔ علی بن حُسین دمشقی المعروف بہ ابن عساکر تاریخ مدینۃ دمشق، جلد ۵ صفحہ ۴۳۶
۱۴۔۔۔ اسماعیل بن عمر المعروف بہ ابنِ کثیر تفسیرُ القرآن العظیم جلد ۴ صفحہ ۱۱۳
۱۵۔۔۔ منصور علی ناصف التاجُ الجامعُ لِلاُصول جلد ۳ صفحہ ۳۰۸

اِن کے علاوہ ابن حجر نے اپنی کتاب صَواعِق مُحرِقہ میں اس حدیث کو بیان کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ نیز ذَہبی نے بھی تلخیص میں اسے عَلٰی شرطِ الشیخین (بُخاری و مُسلم) صحیح قرار دیا ہے۔ خُوارِزمی حَنَفی اور ابن مَغازِلی شافعی نے بھی یہ روایت بیان کی ہے۔ طبرانی نے اپنی کتاب مُعجَم میں اسے نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں سیرتِ حَلَبیہ کے حاشیہ پر، سیرت نبَویّہ میں اور یَنابیعُ المودہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

کیا اس کے بعد بھی کوئی دعوٰی کر سکتا ہے کہ حدیث ثَقَلَین (کِتَابَ اللہِ وَعِترَتِی اَھلَ بَیتِی) سے اہلِ سنت واقف نہیں، یہ شیعوں کی وضع کی ہوئی احادیث میں سے ہے۔ تعصّب، تنگ نظری، فکری جمُود اور جاہلانہ کٹّرپن پر خُدا کی مار!

آیئے ان لوگوں کو تو ان کے حال پر چھوڑیں جو اس حدیث کو وضعی بتلاتے ہیں اور ہم اپنی بحث ان روشن خیال لوگوں کے ساتھ جاری رکھیں جن کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے حق کی تلاش ہے۔ امید ہے کہ وہ سلامتی کا راستہ پانے میں کامیاب ہوں گے۔

صحیح بات یہ ہے کہ حدیثِ ثَقَلَین جس میں رسول اللہؐ نے کتابُ اللہ اور عِترتِ طاہرہ سے وابستہ و پیوستہ رہنے کی وصیت کی ہے وہ اہلِ سُنّت کے نزدیک بھی صحیح حدیث ہے اور شیعوں کے یہاں تو اور بھی زیادہ تواتُر اور صحّتِ سَنَد کے ساتھ

ائمۂ طاہرین سے منقول ہے۔ پھر نہیں معلوم بعض لوگ کیوں اِس حدیث میں شک پیدا کرتے اور اپنی سعی پوری کوشش کرتے ہیں کہ اس کے الفاظ کو وہ کِتَابَ اللّٰہِ وَ سُنَّتِی سے بدل دیں۔ اس کے باوجود کہ مِفْتَاحُ کُنُوزِ السُّنَّۃ نامی کتاب کے صفحہ ۴۷۸ پر مُصنّف نے وَصِیَّتُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ سَلَّمَ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَسُنَّۃِ رَسُوۡلِہٖ کا عنوان بُخاری ومُسلم، تِرمذی اور ابنِ ماجہ کے حوالے سے باندھا ہے لیکن اگر آپ ان چاروں کتابوں میں یہ حدیث تلاش کریں تو اس کا دُور دُور پتہ نہیں چلے گا۔ بُخاری میں ایک عُنوان البتہ ہے کِتَابُ الۡاِعۡتِصَامِ بِالۡکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ[1] لیکن اس عنوان کے تحت بھی کتاب میں اس حدیث کا وجود نہیں۔

زیادہ سے زیادہ بُخاری میں ایک حدیث ملتی ہے کہ

طلحہ بن مصرف کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن اَبِی اَوْفیٰ (رضی اللہ عنہما) سے پُوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ وصیّت فرمائی تھی، انھوں نے کہا: نہیں۔ میں نے کہا: پھر باقی سب لوگوں کو وصیّت کا حُکم کیوں ہے؟ عبداللہ بن ابی اَوْفیٰ نے کہا: آپ نے کتابُ اللہ کے متعلق وصیّت کی تھی[2]

لیکن یہاں بھی اس حدیث کا وُجود نہیں کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا:

تَرَکۡتُ فِیۡکُمُ الثَّقَلَیۡنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیۡ۔

میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں: ایک کتابُ اللہ، دوسرے میری سُنّت۔

اگر فرض کرلیا جائے کہ کسی کتاب میں یہ حدیث موجود بھی ہے جب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اجماعِ حدیث کے دُوسرے الفاظ پر ہے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا۔

علاوہ ازیں اگر ہم کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیۡ والی حدیث پر ذرا غور کریں تو مختلف وجوہ سے یہ حدیث واقعات کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی، نہ عقلاً نہ نقلاً:

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۸ صفحہ ۱۳۷۔

[2] صحیح بُخاری جلد ۳ صفحہ ۱۶۸۔

پہلی وجہ : مؤرخین اور محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث کی کتابت سے منع فرمایا تھا۔ آپ کے زمانے میں کسی کو سُنّتِ نبوی کو مدوّن کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے یہ بات دل کو نہیں لگتی کہ آپ نے تَرَکۡتُ فِیۡکُمۡ کِتَابَ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیۡ فرمایا ہوگا۔ اس کے برخلاف جہاں تک کتابُ اللہ کا تعلق ہے وہ لکھی ہوئی موجود تھی۔ کاتبانِ وحی اس کے لکھنے پر مامور تھے نیز اسے صحابہ یاد کرتے تھے، وہ سینوں میں محفوظ تھی اس لیے ہر صحابی کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ کتابُ اللہ سے رجوع کر سکے، خواہ وہ حافظِ قرآن ہو یا نہ ہو۔

جہاں تک سُنّتِ نبوی کا تعلق ہے وہ آپ کے زمانے میں لکھی ہوئی نہیں تھی، نہ آپ کے زمانے میں کوئی احادیث کا مجموعہ تحریری شکل میں موجود تھا، جیسا کہ معلوم ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ سُنّتِ نبوی میں آنحضرتؐ کے اقوال، افعال اور وہ تمام اُمور شامل ہیں جن کی آپ نے عملاً تصویب کی ہو یعنی صحابہ کو کرتے دیکھ کر منع نہ کیا ہو۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ صحابہ کو خاص طور پر سُنّتِ نبوی سکھانے کے لیے کبھی جمع نہیں کیا کرتے تھے بلکہ مختلف موقعوں کی مناسبت سے گفتگو فرماتے رہتے تھے۔ ان موقعوں پر کچھ اصحاب موجود ہوتے تھے اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس وقت آپ کے ساتھ صرف ایک ہی صحابی ہوں۔ تو ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہؐ یہ فرما دیتے کہ میں تمھارے درمیان اپنی سُنّت چھوڑ رہا ہوں۔

دوسری وجہ : جب وفات سے تین دن قبل رسول اللہؐ کے مرض میں اضافہ ہوگیا اور تکلیف شدید ہوگئی تو آپ نے موجودین سے فرمایا کہ شانے کی ہڈی اور دوات لے آؤ میں کچھ لکھ دوں تاکہ تم پھر کبھی گمراہ نہ ہو۔ لیکن عمر بن خطاب نے کہا : حَسۡبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ[1] (ہمارے لیے کتابُ اللہ کافی ہے) اگر اس سے پہلے رسول اللہؐ یہ فرما چکے ہوتے کہ تَرَکۡتُ فِیۡکُمۡ کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیۡ، تو اس صورت میں عمر بن خطاب کے لیے یہ کہنا کسی طرح جائز نہیں تھا کیونکہ اس

---

[1] صحیح بخاری باب مرض النبیؐ و وفاتہ جلد ۵ صفحہ ۱۳۸ - صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الوصیہ -

کے معنیٰ یہ ہوتے کہ وہ اور دُوسرے صحابہ جنھوں نے ان کی تائید کی تھی، رسول اللہؐ کی تردید کر رہے ہیں جب کہ معلوم ہے کہ رسول اللہؐ کی تردید کرنے والا بلاشبہ کافر ہے۔ میرے خیال میں اہلِ سُنّت والجماعت کو یہ بات کبھی بھی پسند نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ یہ بھی اضافہ کر لیجیے کہ عُمر بن خطّاب نے خود احادیث بیان کرنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔

اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حدیث اہلِ بیت کے کسی مخالف کی گھڑی[1] ہوئی ہے اور غالباً اہلِ بیتؑ کو خلافت سے محروم کرنے کے بعد گھڑی گئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے یہ حدیث وضع کی ہے وہ خود حیران تھا کہ کیا بات ہے کتابُ اللہ سے تو لوگ تمسّک کرتے ہیں مگر عترت کو چھوڑ کر دوسروں کی پیروی کرنے لگے ہیں، اس لیے اس نے سوچا کہ وہ یہ حدیث گھڑ کر ان لوگوں کی رَوش کے لیے ایک وجہِ جواز مہیّا کر دے تاکہ صحابہ پر یہ اعتراض نہ کیا جا سکے کہ انھوں نے رسول اللہؐ کی وصیّت پر عمل کیوں نہیں کیا اور اس کے خلاف کیوں کیا۔

تیسری وجہ: ہمیں معلوم ہے کہ اپنی خلافت کے اوائل میں ابُوبکر کو جس مسئلے سے سب سے پہلے دوچار ہونا پڑا وہ ان کا یہ فیصلہ تھا کہ مانعینِ زکات سے جنگ کی جائے۔ عُمر بن خطّاب نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور دلیل کے طور پر کہا تھا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ

جو توحید و رسالت کی گواہی دے اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ محمد رسول اللہ کہے اس کی جان اور اس کا مال میری طرف سے محفوظ ہے، بجز اس کے کہ کسی حق کی وجہ سے ہو اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

اگر سُنّتِ رسولؐ کوئی معلوم شے ہوتی تو ابُوبکر اس سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کو تو سب سے پہلے اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔

بعد میں عُمر اس حدیث کی اس تاویل سے مطمئن ہو گئے جو ابُوبکر نے کی۔ اور ابُوبکر کی یہ بات تسلیم کر لی کہ زکات مال کا حق ہے۔ لیکن رسول اللہؐ کی وہ فعلی

---

[1] احادیث کی گھڑنت کے بارے میں علامہ مرتضیٰ عسکری کی کتاب "احیائے دین میں ائمۂ اہلبیت کا کردار" دیکھیے!

سُنّت جس کی تاویل ممکن نہیں دانستہ یا نادانستہ ان لوگوں نے نظرانداز کردی۔ یہ ثعلبہ کا قصّہ ہے، جس نے رسول اللہؐ کو زکات ادا کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اس کے کے بارے میں قرآن کی ایک آیت بھی نازل ہوئی تھی لیکن رسول اللہؐ نے اس سے جنگ نہیں کی اور نہ اسے زکات ادا کرنے پر مجبور کیا۔ کیا ابوبکر اور عُمر کو اُسامہ بن زید کا قصّہ بھی معلوم نہیں تھا؟ اُسامہ کو رسول اللہؐ نے ایک سریّہ پر بھیجا تھا، جس میں دشمن کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد دشمن کا ایک آدمی اُسامہ کو ملا جس نے مسلمانوں کو دیکھتے ہی کہا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ لیکن اُسامہ نے اسے قتل کردیا۔ جب یہ بات رسول اللہؐ کو معلوم ہوئی تو آپ نے اُسامہ سے کہا:

کیا تم نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنے کے بعد بھی اسے قتل کردیا؟

اُسامہ کہتے ہیں کہ

میں نے عرض کیا: اُس نے تو اپنی جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا۔ لیکن رسول اللہؐ بار بار وہی بات دُہراتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! میں آج ہی اسلام لایا ہوتا۔[1]

اِن تمام باتوں کے پیشِ نظر ہمارے لیے کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ والی حدیث پر یقین کرنا ممکن نہیں ہے۔ جب صحابہ ہی کو سُنّتِ نبوی کا عِلم نہیں تھا تو بعد میں آنے والوں کا تو ذکر ہی کیا؟ اور ان لوگوں کے متعلق کیا کہا جائے جو مدینے سے دُور رہتے تھے۔

چوتھی وجہ: ہمیں معلوم ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صحابہ کے بہت سے اعمال سُنّتِ رسولؐ کے منافی تھے۔ لہٰذا ہمارے سامنے اب دو ہی صورتیں ہیں: یا تو کہیں کہ صحابہ سُنّتِ رسول سے ناواقف تھے، یا پھر یہ کہیں کہ وہ عمداً سُنّتِ رسول کو چھوڑ کر اپنے اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ اگر ہم دُوسری صورت کے قائل ہوجائیں تو وہ اس آیت کا مصداق ہوجائیں گے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۸ صفحہ ۳۶ وصحیح مُسلم جلد ۱ صفحہ ۶۷ کتابُ الدیات۔

رَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا۔

کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی کام کا فیصلہ کر دیں تو وہ یہ کہیں کہ انھیں اپنے کام میں کچھ اختیار ہے۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی تو وہ صریحاً گمراہ ہو گیا۔

(سورۂ احزاب - آیت ۳۶)

اور اگر ہم یہ کہیں کہ صحابہ سُنّتِ رسولؐ سے ناواقف تھے، تو ایسی حالت میں رسول اللہؐ یہ کیسے فرما سکتے تھے کہ میں تمھارے درمیان اپنی سُنّت چھوڑ رہا ہوں جب کہ آپ کو معلوم تھا کہ آپ کے اصحاب اور مقربین سُنّت کا پورا علم نہیں رکھتے بعد میں آنے والوں کا تو ذکر کیا جنھوں نے آپ کو دیکھا تک نہیں۔ ایسی حالت میں تو آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ صحابہ کو احادیث لکھنے کا حکم دیتے تاکہ یہ مجموعۂ احادیث مسلمانوں کے لیے قرآن کے بعد مرجعِ ثانی کا کام دیتا۔

رہا یہ کہنا کہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں قرآن و سُنّت خلط ملط نہ ہو جائیں تو اس کا لغو ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ یہ ممکن تھا کہ وحی ایک خاص رجسٹر میں جمع کی جاتی اور سُنّت ایک دوسرے رجسٹر میں۔ اس طرح دو الگ الگ کتابیں تیار ہو جاتیں، جیسا کہ ہمارے یہاں آجکل قاعدہ ہے، اس صورت میں ضرور یہ کہنا صحیح ہوتا کہ میں تمھارے درمیان کتابُ اللہ کو اپنی سُنّت کو چھوڑ رہا ہوں۔

پانچویں وجہ : یہ تو معلوم ہے کہ سُنّت کی تدوین عبّاسی دور میں ہوئی اس سے پہلے نہیں۔ حدیث کی جو پہلی کتاب لکھی گئی، وہ مؤطّا امام مالک ہے یہ فاجعۂ کربلا اور واقعۂ حرّہ کے بعد کی بات ہے۔ واقعۂ حرّہ میں تین دن تک مدینہ منورہ میں فوجیوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ جو جی چاہے کریں۔ اس سانحے میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد شہید ہوئی۔ ان حادثات کے بعد اُن راویوں کا کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے جنھوں نے دُنیا کمانے کی غرض سے حکّامِ وقت کا قرب حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اضطراب اور تناقض پیدا ہوا اور اُمّتِ مسلمہ

فرقوں میں بٹ گئی۔ چنانچہ ایک فرقے کے نزدیک جو بات ثابت شدہ تھی وہ دوسرے کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی اور جسے ایک فرقے نے صحیح قرار دیا دوسرے نے اس کی تکذیب کی۔

اِن حالات میں ہم کیسے مان لیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہو کہ تَرَکْتُ فِیکُمْ کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ۔ رسول اللہؐ کو خوب معلوم تھا کہ مُنافقین اور مُنحرفین آپ سے جھوٹی باتیں منسوب کریں گے۔ آپ نے خود فرمایا تھا:

مجھ سے بہت سی جھوٹی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ پس جو شخص مجھ سے جان بوجھ کر جھوٹ منسوب کرے، وہ اپنا ٹھکانا جہنّم میں بنالے۔[1]

جب آپ کی زندگی ہی میں آپ سے بکثرت جھوٹی باتیں منسوب کی گئی ہوں، تو آپ کیسے اپنی اُمّت کو اپنی سُنّت کے اتباع کا حکم دے سکتے تھے جب کہ آپ کے بعد صحیح و غلط میں تمیز دشوار ہو گئی۔

چھٹی وجہ: اہلِ سُنّت کی صحاح میں روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنے بعد ثَقَلَین یعنی دو جانشین یا دو چیزیں چھوڑیں۔ اہلِ سُنّت کبھی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّۃَ رَسُوْلِہٖ فرمایا اور کبھی کہتے ہیں کہ آپ نے عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث سے کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول اللہؐ میں، سُنّتِ خلفاء کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اس طرح شریعت کے ماخذ دو کے بجائے تین ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ سب اس حدیثِ ثَقَلَین کے منافی ہے جس پر اہل سنت اور شیعوں کا اتفاق ہے۔ اِس حدیث میں کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ کے الفاظ ہیں اور اس کے لیے ہم نے بیس سے زیادہ اہلِ سُنّت کی معتبر کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ شیعہ مآخذ اس کے علاوہ ہیں جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا۔

ساتویں وجہ: رسول اللہؐ کو بخوبی علم تھا کہ آپ کے اصحاب — گو

---

[1] صحیح بُخاری کتابُ العِلم جلد ا صفحہ ۳۵۔

قرآن ان کی زبان میں اور جیسا کہ مشہور ہے، ان کے لہجے میں نازل ہوا ہے۔ بہت سے مقامات کی تفسیر اور تاویل سے ناواقف تھے۔ پھر یہ کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ بعد میں آنے والے، خصوصاً وہ رُومی، ایرانی، حبشی اور دُوسرے عجمی جن کی زبان عربی نہیں تھی اور جو نہ عربی سمجھتے تھے اور نہ بولتے تھے، قرآن کو کما حقّہ سمجھ پاتیں گے

روایت ہے کہ جب ابُوبکر سے اللہ تعالیٰ کے قول وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا کے معنیٰ پُوچھے گئے تو انھوں نے کہا: میری کیا مجال کہ میں کتابُ اللہ کے بارے میں کوئی ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہ ہو۔[1]

اسی طرح عُمر بن خطّاب کو بھی اس کے معنیٰ معلوم نہیں تھے۔ اَنَس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک دفعہ عُمر بن خطاب نے منبر پر یہ آیت پڑھی:

فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضۡبًا وَّزَیۡتُوۡنًا وَّنَخۡلًا وَّحَدَآئِقَ غُلۡبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا.

اس کے بعد کہا: اور تو سب ہمیں معلوم ہے مگر یہ اَبّ کیا ہے؟ اس کے بعد کہنے لگے: چھوڑو، ایسی ٹوہ محض تکلف ہے۔ اگر تمھیں اَبّ کے معنیٰ معلوم نہیں تو نہ ہوں، اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ کتابُ اللہ میں جو واضح ہدایت ہے اس پر عمل کرو اور جو سمجھ میں نہ آئے اسے اس کے ربّ پر چھوڑ دو۔[2]

جو کچھ یہاں کتابُ اللہ کی تفسیر کے بارے میں کہا گیا ہے، اس کا اطلاق سُنّتِ نبوی کی تفسیر پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ کتنی ہی احادیث ہیں جن کے بارے میں صحابہ میں، مختلف فرقوں میں اور شیعوں اور سُنّیوں میں اختلاف رہا ہے۔ کبھی اس بارے میں کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف اور کبھی اس بارے میں کہ حدیث کا مفہوم کیا ہے۔ وضاحت کے لیے میں اس اختلاف کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

---

[1] قسطلانی، ارشاد الساری جلد ۱۰ صفحہ ۲۹۸ - ابن حجر، فتح الباری فی شرح صحیح البخاری جلد ۱۳ صفحہ ۲۳۰

[2] تفسیر طبری جلد ۳ صفحہ ۳۸ - کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۲۶۷ - مُستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱۴ - تاریخ بغداد جلد ۱۱ صفحہ ۴۶۸ - تفسیر کشّاف جلد ۳ صفحہ ۲۵۳ - تفسیر خازن جلد ۴ صفحہ ۳۷۴ - ابن تیمیہ، مقدمہ اصول تفسیر صفحہ ۳۰ - ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم جلد ۴ صفحہ ۴۷۳ -

۱۔ حدیث کی صحّت اور عدمِ صحّت کے بارے میں صحابہ میں اختلاف

یہ صورت خلافت ابو بکر کے ابتدائی ایام میں اس وقت پیش آئی جب فاطمہ بنتِ رسول ؐ ابو بکر کے پاس آئیں اور فدک کی واگزاری کا مطالبہ کیا۔ جنابِ فاطمہ ؑ کا دعویٰ تھا کہ فدک ان کے والد نے اپنی زندگی میں انھیں عطا کر دیا تھا، لیکن ان کے والد کی وفات کے بعد ان سے لے لیا گیا۔ ابو بکر نے اس دعوے کو غلط قرار دیا اور اس کی تردید کی کہ رسول اللہ ؐ نے اپنی زندگی میں فدک جناب فاطمہ ؑ کو دے دیا تھا۔ جناب فاطمہ ؑ نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ان کے والد کی میراث انھیں دی جائے۔ لیکن ابو بکر نے کہا کہ

رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے:
نَحْنُ مَعْشَرُ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ
ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

جناب فاطمہ ؑ نے اس حدیث کو مَن گھڑت قرار دیا اور اس کے مقابلے میں قرآنی آیات پیش کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف اور جھگڑا بڑھ گیا۔ جناب فاطمہ ؑ مرتے دم تک ابو بکر سے ناراض رہیں، ان سے بات نہیں کرتی تھیں۔ جیسا کہ خود صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں آیا ہے۔

ایک اور مثال ام المومنین عائشہ اور ابو ہریرہ کے اختلاف کی ہے:
اگر کوئی شخص رمضان میں صبح کو ناپاک اٹھے تو عائشہ کہتی تھیں کہ اس کا روزہ درست ہے۔ ابو ہریرہ کی رائے تھی کہ وہ افطار کرے۔ امام مالک نے مؤطّا میں اور بخاری نے اپنی صحیح میں اُمُّ المومنین عائشہ اور اُمُّ المومنین ام سلمہ سے روایت کی ہے، وہ دونوں کہتی ہیں کہ رمضان میں رسول اللہ ؐ صبح کو جُنب اٹھتے تھے ہم بستری کی وجہ سے، احتلام کی وجہ سے نہیں، پھر روزہ رکھ لیتے تھے۔
ابو بکر بن عبد الرحمن کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ جن دنوں مروان بن حکم

مدینے کا امیر تھا، ایک دن میں اور میرے والد اس کے پاس تھے۔ اس کے سامنے ذکر آیا کہ ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جو شخص صبح کو جُنب اُٹھے وہ اس دن افطار کرے۔

مروان کہنے لگا: عبدالرحمٰن! میں تمھیں قسم دیتا ہوں کہ تم اُمّ المومنین عائشہ اور اُمّ المومنین اُمّ سلمہ کے پاس جاکر ذرا اس بارے میں دریافت تو کرو۔ اس پر عبدالرحمٰن اور میں حضرت عائشہ کے پاس گئے۔ وہاں جاکر عبدالرحمٰن نے سلام کیا اور کہا: اُمّ المومنین! ہم مروان بن حکم کے پاس تھے، وہاں ذکر آیا کہ ابُوہریرہ کہتے ہیں کہ جو صبح کو جُنب ہو وہ اس دن افطار کرے، روزہ نہ رکھے۔ عائشہ نے کہا: اس طرح نہیں جیسے ابوہُریرہ کہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن! کیا تمھیں رسول اللہؐ کا طریقہ پسند نہیں؟ عبدالرحمٰن نے کہا: بخدا یہ بات نہیں۔ عائشہ نے کہا: اگر ایسا ہے تو میں گواہی دیتی ہوں کہ رسول اللہؐ احتلام کے بغیر ہم بستری سے صبح کو جُنب ہوتے تھے اور پھر اس دن کا روزہ رکھ لیتے تھے۔ ابوبکر بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ہم وہاں سے نکل کر حضرت اُمّ سلمہ کے یہاں گئے۔ ہم نے ان سے پوچھا تو انھوں نے بھی وہی کہا جو عائشہ نے کہا تھا۔ اس کے بعد ہم واپس مروان بن حکم کے پاس پہنچے اور جو کچھ ان دونوں نے کہا تھا وہ مروان کو بتایا۔

مروان نے کہا: ابومحمد! دروازے پر سواری موجود ہے۔ تم فوراً سوار ہوکر ابوہُریرہ کے پاس جاؤ، وہ عتیق میں اپنی زمین پر ہیں، انھیں جاکر سب بات بتلاؤ۔

چنانچہ عبدالرحمٰن سوار ہوئے میں بھی ان کے ساتھ سوار ہوا اور ہم دونوں ابوہریرہ کے پاس پہنچے۔ عبدالرحمٰن نے کچھ دیر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں پھر اصل موضوع پر آئے۔ ابوہُریرہ نے کہا: مجھے تو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں، مجھ سے تو کسی نے کہا تھا۔[1]

دیکھیے! ابوہُریرہ جیسے صحابی جو اہلِ سُنّت کے نزدیک اسلام میں احادیث کے سب سے بڑے راوی ہیں، کیسے دینی احکام سے متعلق محض ظن و تخمین کی بناپر

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۳۲ باب الصائم یُصْبِحُ جُنُباً - تنویر الحوالک شرح موطا مالک جلد ۱ صفحہ ۲۷۲ مَا جَاءَ فِی الذی یُصْبِحُ جُنُباً فِی رَمَضَانَ -

فتوے دے دیتے ہیں اور پھر اسے رسول اللہ ص سے منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ انھیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بات انھیں کس نے بتلائی تھی۔ ایسے احکام جن کا ماخذ بھی معلوم نہیں اہل سُنّت ہی کو مُبارک ہوں۔

ابو ہُریرہ کا ایک اور قصّہ

عبداللہ بن محمد کہتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا ہشام بن یوسف نے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں بتلایا معمر نے، وہ روایت کرتے ہیں زُہری سے، وہ ابوسلمہ سے، وہ ابو ہُریرہ رضی اللہ عنہ سے، وہ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"چھوت، یرقان اور ہامہ (ایک فرضی پرندہ جو جاہلی عربوں کے خیال کے مطابق اس وقت تک چیختا رہتا ہے جب تک مقتول کا بدلہ نہ لے لیا جائے) کوئی چیز نہیں۔ اس پر ایک اعرابی نے کہا کہ یا رسول اللہ ص! پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اُونٹ صحرا میں خوبصورت ہرنوں کی طرح کلیلیں کرتے پھرتے ہیں پھر ان میں کوئی خارش زدہ اُونٹ آملتا ہے تو سب کو خارش ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ ص نے کہا: یہ بتاؤ، پہلے اُونٹ کو بیماری کس نے لگائی تھی؟"

ابوسلمہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے بعد میں ابو ہُریرہ کو یہ کہتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"بیمار کو تندرست کے پاس نہ لے جاؤ۔"

ابوہریرہ نے پہلی حدیث کا انکار کیا تو ہم نے کہا: آپ نے نہیں کہا تھا کہ چھوت کوئی چیز نہیں۔ اس پر ابوہریرہ نے حبشی زبان میں کچھ کہا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ابوسلمہ کہتے ہیں کہ اور کوئی حدیث ہم نے ابوہریرہ کو بھولتے نہیں دیکھا۔[1]

---

[1] صحیح بخاری جلد ۷ صفحہ ۳۱ باب لاہامۃ۔ صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۳۲ باب لاعدوٰی ولاطیرہ۔

تو قارئین! یہ ہے سُنّتِ رسولؐ بلکہ یوں کہیے، یہ ہیں وہ روایات جو خُدا کے رسولؐ سے منسوب کی گئی ہیں۔ کبھی تو ابوہُریرہ یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے پہلے جو حدیث سُنائی تھی اس کا انھیں کچھ علم نہیں، اِن سے تو یہ بات کسی نے کہی تھی۔ اور کبھی جب ان کی بیان کردہ احادیث میں تناقض کی نشان دہی کی جاتی ہے تو وہ کچھ جواب نہیں دیتے بلکہ حبشی زبان میں کچھ بُڑبُڑا دیتے ہیں۔

معلوم نہیں اہلِ سُنّت کیسے انھیں اسلام کا سب سے بڑا راوی حدیث قرار دیتے ہیں؟

عائشہ اور ابن عُمر کا اختلاف

عُروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں اور ابنِ عُمر اُمّ المؤمنین عائشہ کے حُجرے کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھے تھے اور ہمیں ان کے مسواک کرنے کی آواز آرہی تھی، اتنے میں مَیں نے پوچھا: اے ابوعبدالرحمٰن! کیا رسول اللہؐ نے رَجَب کے مہینے میں بھی عمرہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں کیا ہے۔ میں نے عائشہ سے کہا: اماں جان! آپ سُن رہی ہیں ابوعبدالرحمٰن کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا: کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا: یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے رَجَب میں عُمرہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ابوعبدالرحمٰن کو اللہ معاف کرے۔ آپؐ نے رَجَب میں کبھی عُمرہ نہیں کیا۔ اور جب بھی عُمرہ کیا یہ تو ہر دفعہ آنحضرتؐ کے ساتھ تھے۔ عُروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ابنِ عمر یہ گفتگو سن رہے تھے مگر انھوں نے نہ اُمّ المومنین کی تصدیق کی نہ تردید، بس چپکے ہو رہے[1]

عائشہ اور ازواجِ نبی کا اختلاف

اُمّ المومنین عائشہ بیان کرتی ہیں کہ سَہلہ بنت سُہیل ابوحُذیفہ کی جورو جو بنی عامر کی اولاد میں سے تھی رسول اللہؐ کے پاس آئی اور بولی: یارسول اللہؐ!

---

[1] صحیح بخاری جلد ۵ باب عمرۃ القضاء۔ صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الحج۔

ہم (ابوحذیفہ کے غلام) سالم کو اپنا بچّہ سمجھتے تھے اور یہ کہ جب میں بے لباس ہوتی تھی وہ گھر میں اندر چلا آتا تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس صرف ایک ہی گھر ہے۔ یہ سُن کر رسول اللہ ص نے فرمایا: اسے دُودھ پلا دو۔ سہلہ نے کہا: میں اسے کیونکر دُودھ پلا سکتی ہوں، اب تو وہ جوان ہو گیا ہے اور اس کے داڑھی مُونچھ ہے۔ اس پر رسول اللہ ص مُسکرائے اور بولے: اسے دُودھ پلاؤ، اس میں تمھارا کیا جائے گا، اگر کچھ جائے گا تو ابوحُذیفہ کا جائے گا۔

اُمّ المؤمنین عائشہ اس حدیث پر عمل کیا کرتی تھیں اور جس آدمی کو چاہتیں کہ اُن کے پاس آیا جایا کرے تو اپنی بہن اُمّ کلثوم کو حکم کرتیں اور اپنی بھتیجیوں کو بھی کہ اس آدمی کو اپنا دُودھ پلا دیں لیکن دوسری اُمّہاتُ المومنین اس کا انکار کرتی تھیں کہ بڑھاپے میں رضاعت کے سبب کوئی ان کا محرم بن کر ان کے پاس آ جا سکتا ہے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ رسول اللہ ص نے یہ رخصت خاص سہلہ بنت سُہیل کو دی تھی۔ بخدا! ایسی رضاعت کے سبب کوئی ہمارا محرم نہیں بن سکتا۔[1]

تحقیق کرنے والا جب ایسی روایات دیکھتا ہے تو اسے یقین نہیں آتا۔ لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ایسی روایات جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عصمت پر حرف آتا ہے حدیث کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ روایات رسول اللہ ص کو۔ جو خصائلِ حسنہ کے پیکر تھے اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعُوث ہوئے تھے۔ ایک ایسے شخص کے رُوپ میں پیش کرتی ہیں جو اَخلاقی اَقدار کی دھجیاں بکھیرتا ہے اور دینِ اسلام میں ایسی مضحکہ خیز باتیں داخل کرتا ہے کہ فرزانے تو کیا دیوانے بھی بے ساختہ ہنس پڑیں۔ (غُلامیٔ رسول ص میں، مَوت بھی قبول ہے کا نعرہ بلند کرنے والے) مسلمان کیا ایسی کوئی حدیث قبول کر سکتے ہیں جو خُدا کے عظیم الشان رسول ص کا استخفاف کرتی ہو، عقل کی کسوٹی اور اَخلاق کے معیار پر پوری نہ اُترتی ہو، ایمانی غیرت کے منافی ہو اور شرم و حیا کا جنازہ نکال دے۔

کیا کوئی غیرت مند مسلمان اپنی بیوی کو اس بات کی اجازت دے سکتا ہے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الرضاع جلد ۴ صفحہ ۱۱۶ - مؤطا امام مالک کتاب الرضاع جلد ۲ صفحہ ۱۱۶

کہ وہ کسی جوان آدمی کو دُودھ پلائے تاکہ وہ اس کی ماں بن جائے ؟؟

اے اللہ کے رسولؐ! آپ کی ذاتِ والاصفات ایسی بیہودہ باتوں سے بہت بلند ہے اور یہ آپ پر بُہتانِ عظیم ہے۔ میں کیسے باور کرلوں کہ وہ رسولؐ، جس نے مرد کے لیے نامحرم عورت کو چھُونا اور اس سے ہاتھ مِلانا حرام قرار دیا ہے، وہ بڑھاپن میں عورت کا دُودھ پینا جائز قرار دے سکتا ہے۔ (العَیاذُ باللہ)

میں اِس حدیث سازی کا مقصد تو نہیں جانتا البتہ یہ جانتا ہوں کہ بات اس حدیث کی حُدود سے نکل کر آگے بڑھ گئی اور سُنّتِ جاریہ بن گئی۔ کیونکہ اُمّ المؤمنین عائشہ اِس حدیث پر عمل کرتی تھیں۔ وہ جس شخص کو چاہتیں کہ ان کے پاس آیا جایا کرے اسے رضاعت کے لیے اپنی بہن اُمِّ کلثوم کے پاس بھیجا کرتی تھیں۔

ذوقِ آگہی رکھنے والوں کی معلومات کے لیے بتاتا چلوں کہ لوگوں کا اُمّ المومنین عائشہ کا محرم بن کر ان کے پاس آنا جانا صرف اسی صورت میں جائز ہوسکتا تھا جب ان کی رضاعت پانچ دفعہ ہوئی ہو کیونکہ اُمّ المومنین ہی کی روایت ہے کہ اللہ نے دس دفعہ رضاعت والی آیت اتاری تھی، پھر یہ پانچ دفعہ رضاعت والی آیت سے منسوخ ہوگئی۔ پس یہ آیت برابر پڑھی جاتی تھی یہاں تک کہ رسول اللہؐ کے انتقال کے بعد بھی قرآن میں تھی [1] (لیکن اب قرآن میں موجود نہیں ہے۔[2])

---

[1] صحیح مسلم جلد ۴ صفحہ ۱۶۷ باب التحریم بخمس رضعات۔

[2] یہ قرآن جو ہمارے ہاتھوں میں ہے وہی ہے جو خاتم الانبیاء حضرت محمد مُصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا تھا اور اِس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے۔ تیسری صدی کے شیخ صدوق علیہ الرحمہ سے لے کر پندرھویں صدی کے آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی تک شیعہ علماء کبھی تحریفِ قرآن کے قائل نہیں رہے، ان کی کتابیں اوران کے فتوے اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ لیکن خُدا معلوم کیوں کچھ لوگ مقطوعُ السَّنَد اَخبارِ آحاد کے سہارے شیعہ دشمنی کی بھڑاس نکالتے ہیں اور شیعوں پر یہ سنگین تُہمت لگاتے ہیں کہ ان کا قرآن چالیس پاروں کا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اگر کچھ مُرسَل، ضَعیف یا مقطوعُ السند روایتیں شیعہ کتب میں ہیں تو اس سے کہیں زیادہ روایات سُنّی کتب احادیث میں بھی ہیں لیکن یہ کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ مثلاً

اُمّ المومنین بی بی عائشہ آیۂ رضاعت (عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَّعْلُوْمَاتٍ)

کو جزوِ قرآن بتاتی ہیں اور یہ آیت صحیح مُسلم، سننِ ابی داؤد، سننِ نسائی، سننِ دارمی اور مؤطّا مالک میں لکھی ہے۔

عُمر بن خطّاب آیۂ رجم (اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ) کو جزوِ قرآن بتاتے ہیں اور یہ آیت صحیح بُخاری، صحیح مُسلم، جامع ترمذی، سُننِ ابی داؤد، سُننِ ابنِ ماجہ اور مؤطّا مالک میں لکھی ہے۔

عُمر بن خطّاب کہتے ہیں کہ آیت: لَا تَرْغَبُوْا عَنْ اٰبَائِکُمْ فَاِنَّهٗ کُفْرٌ بِکُمْ اِنْ تَرْغَبُوْا عَنْ اٰبَآئِکُمْ قرآن کا جُزو تھی اور ہم اسے پڑھا کرتے تھے۔ یہ آیت صحیح بُخاری ومُسندِ احمد بن حنبل میں دیکھی جاسکتی ہے۔

سُننِ ابنِ ماجہ میں ہے کہ اُمّ المومنین نے کہا:

زانی اور زانیہ کو سنگسار کرنے کی آیت (آیۂ رجم) نازل ہوئی تھی۔ نیز یہ کہ بڑھ پن میں دس دفعہ دُودھ پلانے کی آیت (وَرَضَاعَةُ الْکَبِیْرِ عَشْرًا) نازل ہوئی تھی اور ایک کاغذ پر لکھی ہوئی میرے تخت کے نیچے رکھی تھی، جب رسول اللہ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ہم افراتفری کے عالم میں تھے تو بکری اسے کھا گئی۔

اور صحیح مُسلم میں ترقیم ہے کہ ابو مُوسیٰ اشعری نے بصرے میں تین سو قاریانِ قرآن کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

ہم ایک سُورہ پڑھا کرتے تھے جو طویل تھا اور جس کا مضمون سورۃ توبہ کی طرح سخت تھا۔ بعد میں ہم وہ سُورہ بھول گئے البتہ اس کی یہ آیت میرے حافظہ میں باقی ہے: لَوْ کَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِیَانِ مِنْ مَّالٍ لَابْتَغٰی وَادِیًا ثَالِثًا وَلَا یَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ۔

اسی طرح ہم ایک اور سُورہ بھی پڑھا کرتے تھے جو "مُسبّحات" میں سے ایک کے مشابہ تھا۔ ہم وہ سُورہ بھُول گئے اور مجھے اس کی فقط یہ آیت یاد رہ گئی ہے یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ فَتُکْتَبُ شَهَادَةً فِیْۤ اَعْنَاقِکُمْ فَتُسْئَلُوْنَ عَنْهَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔

۲۔ سُنّتِ رسولؐ کے بارے میں فقہی مذاہب کا اختلاف

سُنّتِ رسولؐ کے بارے میں ابوبکر اور عُمر میں اختلاف تھا[۱] ابوبکر کا فاطمہؑ سے اختلاف تھا[۲] ازواجِ رسولؐ کا آپس میں اختلاف تھا[۳] ابوہریرہ کا عائشہ سے اختلاف تھا[۴] عبداللہ بن عُمر اور عائشہ کے مابین اختلاف تھا[۵]

حدیث کی معتبر کتابوں سے یہ چند نمونے ہم نے ان لوگوں کو آئینہ دکھانے کے لیے پیش کیے ہیں جو کہتے پھرتے ہیں کہ شیعوں کا موجودہ قرآن پر ایمان نہیں۔ حالانکہ قرآن یہی ہے جو دفتین کے بیچ میں ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ اور سب مسلمانوں کا اِسی پر ایمان ہے۔ جو ہم پر بہتان باندھتا ہے، ہم اس کا اور اپنا معاملہ اللہ کی عدالت میں پیش کرتے ہیں کہ وہ احکم الحاکمین ہے۔

ہم تو بس اتنی سی بات جانتے ہیں کہ قرآن میں تحریف نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ آخری آسمانی شریعت ہے اور خُدا نے اس کی حفاظت کا ذمّہ لیا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ۔ (ناشر)

۱ؔ مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کے بارے میں اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔ ہم نے اِس قصّہ کے مآخذ بیان کردیے ہیں۔

۲ؔ قصّہ فدک اور حدیث نَحْنُ مَعْشَرُ الْاَنْبِیَاءِ لَا نُوْرِثُ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے مآخذ کا بیان بھی گزر چکا۔

۳ؔ بالغ مرد کو دودھ پلانے کے قصّے کی طرف اشارہ ہے جو عائشہ سے مروی ہے۔ لیکن دیگر ازواجِ رسولؐ نے اس کے برخلاف کہا ہے۔

۴ؔ ابوہُریرہ کی اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہؐ صبح کو جُنب ہوتے تھے اور روزہ رکھ لیتے تھے۔ عائشہ نے ابوہُریرہ کی اس بات کو غلط بتلایا ہے۔

۵ؔ اشارہ ہے اس روایت کی طرف کہ رسول اللہؐ نے چار عُمرے کیے جن میں سے ایک رَجَب میں تھا۔ عائشہ نے اس کی تردید کی ہے۔

عبداللہ بن عبّاس اور عبداللہ بن زُبیر کے درمیان اختلاف تھا[1] علی بن ابی طالبؑ اور عُثمان بن عفّان کے درمیان اختلاف تھا[2] جب صحابہ کے درمیان ہی اتنا اختلاف تھا[3] تو تابعین کے درمیان تو اور بھی بڑھ گیا حتّیٰ کہ فقہی مذاہب ستر سے بھی زیادہ ہوگئے۔ ابنِ مسعود صاحبِ مذہب تھے، اِسی طرح ابنِ عمر، ابنِ عباس، ابن زُبیر، ابن عُیَیْنَہ، ابن جُریج، حسَن بصری، سُفیان ثوری، مالک بن اَنس، ابوحنیفہ، شافِعی، احمد بن حنبل سب کے سب صاحبِ مذہب تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت ہیں۔ لیکن سلطنتِ عبّاسیہ نے اہلِ سُنّت کے چار مشہور مذاہب کو چھوڑ کر باقی سب کا خاتمہ کردیا۔

اگرچہ اب فقہی مذاہب چند ہی رہ گئے ہیں، پھر بھی ان کے درمیان اکثر فقہی مسائل میں اختلاف ہے۔ اور اس کی وجہ وہی سُنّتِ رسول ص کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک مذہب کسی مسئلے میں حکم کی بنیاد کسی حدیث پر رکھتا ہے جسے وہ اپنے زعم میں صحیح سمجھتا ہے، تو دُوسرا مذہب اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہے یا کسی دوسرے مسئلے پر نص اور حدیث کی عدم موجودگی کی وجہ سے قیاس کرتا ہے۔ اسی وجہ سے، مثلاً رضاعت کے مسئلے میں بہت اختلاف ہے کیونکہ اس بارے میں احادیث باہم متضاد ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ایک مذہب کے مطابق ایک قطرہ دُودھ پینے سے بھی حرمت ثابت ہوجاتی ہے۔ جبکہ دُوسرے مذہب کی رو سے دس یا پندرہ دفعہ دودھ پلانا ضروری ہے۔

۳۔ سُنّتِ رسولؐ کے بارے میں شیعہ سُنّی اختلاف

اِس معاملے میں شیعہ سُنّی اختلاف عموماً دو وجہ سے ہوتا ہے: ایک تو یہ

---

[1] اشارہ ہے ان کے درمیان مُتعہ کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں اختلاف کی طرف۔ دیکھیے صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۲۹۔

[2] اشارہ ہے ان کے درمیان مُتعۂ حج کے بارے میں اختلاف کی طرف۔ دیکھیے صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۵۳۔

[3] بِسم اللہ کے بارے میں، وضو کے بارے میں، مُسافر کی نماز کے بارے میں اور ایسے ہی ان گنت دوسرے مسائل۔

شیعہ اس حدیث کو صحیح نہیں مانتے جس کے راوی کی عدالت پایۂ اعتبار سے ساقط ہو خواہ وہ صحابی ہی کیوں نہ ہو۔ اہلِ سُنّت کے برخلاف شیعہ اس بات کے قائل نہیں کہ تمام صحابہ ثِقَہ اور عادل تھے۔

اس کے علاوہ شیعہ کسی ایسی حدیث کو بھی قبول نہیں کر سکتے جو ائمۂ اہلِ بیت کی روایت سے متصادم ہو۔ وہ ائمۂ اہل بیت کی روایت کو دُوسروں کی روایت پر ترجیح دیتے ہیں خواہ دُوسروں کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ اِس سلسلے میں ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جن کی قرآن و سُنّت سے تائید ہوتی ہے اور جن کو ان کے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض چیزوں کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

شیعہ سُنّی اختلاف کا ایک اور سبب یہ ہے کہ اہلِ سُنّت کے نزدیک حدیث کا مفہوم کچھ ہے اور شیعہ اس کے کچھ اور معنی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً وہ حدیث جس کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں یعنی :

اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ

اہل سُنّت تو اس حدیث کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ فقہی مسائل میں مذاہبِ اربعہ کا اختلاف مسلمانوں کے لیے رحمت ہے۔

جبکہ شیعوں کے نزدیک اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک دُوسرے کے پاس سفر کر کے جانا اور ایک دُوسرے سے عِلم حاصل کرنا رحمت ہے۔ یہ تشریح امام جعفر صادقؑ کی ہے اور ہم اسے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

بعض دفعہ شیعہ سُنّی اختلاف حدیثِ رسول کے مفہوم میں نہیں ہوتا بلکہ اس بارے میں ہوتا ہے کہ جس شخص یا اشخاص کا حدیث میں ذکر ہے اس سے کون مُراد ہے۔ مثلاً قولِ رسولؐ ہے کہ

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ.

اہلِ سُنّت خلفائے راشدین سے ابوبکر، عمرُ، عُثمان اور علی مراد لیتے ہیں، مگر شیعہ بارہ ائمہؑ مُراد لیتے ہیں۔

اِسی طرح رسول اللہؐ کا ایک اور قول ہے :

اَلْخُلَفَاءُ مِنْ بَعْدِیْ اثْنَیْ عَشَرَ کُلُّھُمْ مِّنْ قُرَیْشٍ.

"میرے بعد بارہ خلیفہ ہوں گے جو سب قریش سے ہوں گے"۔
شیعہ بارہ خُلفاء سے بارہ ائمہؑ اہلِ بیت مراد لیتے ہیں جبکہ اہلِ سُنّت والجماعت کے یہاں اس کی کوئی تشریح ہے ہی نہیں۔

کبھی شیعہ سُنّی اختلاف ان تاریخی واقعات کے بارے میں ہوتا ہے جن کا تعلّق رسول اللہؐ کی ذات سے ہے۔ جیساکہ آپؐ کے یومِ ولادت کے بارے میں اختلاف ہے۔ اہلِ سُنّت ۱۲ ربیع الاوّل کو میلادالنبی مناتے ہیں جبکہ شیعہ اس مہینے کی ۱۷ تاریخ کو محافل میلاد منعقد کرتے ہیں۔

سُنّتِ نبوی کے بارے میں ایسا اختلاف ہونا قدرتی ہے۔ اس سے بچنا ممکن نہیں۔ کیونکہ کوئی ایسا مرجع موجود نہیں جس کی طرف سب رجوع کرسکیں اور جس کے حکم کو سب مانیں اور جس کی رائے کو سب قبول کریں اور جس پر سب کو اسی طرح اعتماد ہو جیسے رسول اللہؐ کی زندگی میں آپ پر تھا۔

اُمّت کی زندگی میں ایسے شخص کا وجود ہر وقت ضروری ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے، اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ رسول اللہؐ اس ضرورت کو نظرانداز کردیتے۔ آپ کو معلوم تھا اور عَلَّامُ الغُیوب نے آپ کو اطلاع دے دی تھی کہ آپ کی اُمّت آپ کے بعد قرآن کی تاویل کرے گی۔ اس لیے آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ کوئی ایسا مُعلّم مقرر کریں کہ اگر اُمّت صراطِ مُستقیم سے ہٹنے لگے تو وہ اس کی صحیح راہ نمائی کرسکے۔ اور آپ نے اُمّت کے لیے واقعی ایک ایسے عظیم قائد کا انتظام کردیا تھا جس کی تعلیم و تربیت میں آپ نے ابتدا ہی سے پوری کوشش صرف کی تھی اور جب وہ درجۂ کمال کو پہنچ گیا اور آپ سے اس کی نسبت وہ ہوگئی جو حضرت ہارونؑ کی جناب موسیٰؑ سے تھی تو آپ نے یہ جلیلُ القدر کام یہ کہہ کر اس کے سپرد کردیا کہ

اَنَا اُقَاتِلُھُمْ عَلٰی تَنْزِیْلِ الْقُرْاٰنِ وَاَنْتَ تُقَاتِلُھُمْ عَلٰی تَاْوِیْلِہٖ۔ [1]

---

[1] مناقب خوارزمی صفحہ ۴۴۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۲۳۳۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۔ کفایۃ الطالب صفحہ ۳۳۴۔ منتخب کنزالعمال جلد ۵ صفحہ ۳۶۔ احقاق الحق جلد ۶ صفحہ ۳۷۔

"اے علی! میں تنزیلِ قرآن کی خاطر لڑتا رہا ہوں، اب تم تاویلِ قرآن کے لیے لڑو۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا:

اَنْتَ یَا عَلِیُّ! تُبَیِّنُ لِاُمَّتِیْ مَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنْ بَعْدِیْ

علی! جس بات میں میری اُمّت میں میرے بعد اختلاف ہو تم اس بات کو واضح کر دینا۔[1]

قرآن جو اللہ کی کتاب ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اس کی تفسیر اور توضیح کے لیے لڑے یعنی جانفشانی کرے کیونکہ یہ ایک خاموش کتاب ہے جو خود نہیں بولتی مگر ساتھ ہی متعدد معانی کی حامل ہے۔ اس کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ جب قرآن کی یہ صورت ہے تو سُنّت کی تشریح و توضیح تو اور بھی ضروری ہے، اور جب قرآن و سُنّت دونوں تشریح طلب ہوں تو رسول اللہ ؐ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ دونوں ثقلین ایسے چھوڑیں جو خاموش اور گونگے ہوں اور جن کی حسبِ منشا تاویل وہ لوگ کر سکیں جن کے دل میں کجی ہے اور جو فتنہ برپا کرنا اور دُنیا کمانا چاہتے ہیں اور جن کے متعلق معلوم ہے کہ بعد میں آنے والوں کے لیے گمراہی کا سبب بنیں گے کیونکہ لوگ ان کے ساتھ حُسنِ ظن رکھیں گے، انھیں عادل سمجھیں گے لیکن بعد میں قیامت کے دن پشیمان ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا۔

جس دن ان کے چہرے آگ میں اُلٹائے جائیں گے تو وہ کہیں گے اے کاش! ہم اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرتے۔ اور کہیں گے

---

[1] مُستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۲ - تاریخِ دمشق جلد ۲ صفحہ ۴۸۸ - مناقب خُوارزمی صفحہ ۲۳۶ - کنوزُ الحقائق صفحہ ۲۰۳ - منتخب کنزُ العمال جلد ۵ صفحہ ۳۳ - ینابیعُ المودۃ صفحہ ۱۸۲ -

کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کا کہا مانا تو انھوں نے ہمیں گمراہ کردیا۔ اے پروردگار! اُن کو دُگنا عذاب دے اور اُن پر بڑی لعنت کر۔

(سورۂ احزاب - آیات ۶۶ تا ۶۸)

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ.

جب ایک کے بعد ایک جماعت (جہنّم میں) داخل ہوگی تو وہ اپنے جیسی دُوسری جماعت پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب ساری جماعتیں جمع ہوجائیں گی تو پچھلی جماعت پہلی کی نسبت کہے گی کہ اے ہمارے پروردگار یہ تھے وہ جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، پس تو ان کو آگ کا دوہرا عذاب دے۔ اللہ کہے گا تم میں سے ہر جماعت کے لیے دوہرا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔

(سورۂ اعراف - آیت ۳۸)

گمراہی کا سبب یہی ہے۔ کوئی اُمت ایسی نہیں گزری جس کے پاس اللہ نے نبیؑ یا ہادی نہ بھیجا ہو۔ اور اس کی اُمّت نے اس کے بعد اللہ کے کلام میں تحریف نہ کی ہو۔

کیا کوئی شخص بشرطِ صحّت اور بقائمیٔ ہوش وحواس یہ تصوّر کرسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں سے کہا ہوگا کہ میں خُدا ہوں، ہرگز نہیں! قرآن شریف میں ہے:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖ

خُدایا! میں نے ان سے وہی کہا جس کا تونے مجھے حکم دیا۔

لیکن لالچ اور حبِ دُنیا نے عیسائیوں کو تثلیث کے عقیدے کی طرف دھکیل دیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیروکاروں کو حضرت محمدؐ کی آمد کی بشارت دی تھی

اسی طرح ان سے پہلے حضرت موسیٰؑ نے بھی یہ بشارت دی تھی لیکن عیسائیوں نے محمدؐ اور احمد ناموں کی تاویل کر کے ان کا مطلب نجات دہندہ بنالیا اور آج تک وہ اس نجات دہندہ کا انتظار کر رہے ہیں۔

اُمّتِ محمدیہؐ بھی تاویل کی بدولت ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہوگئی جس میں سوائے ایک کے سب جہنمی ہیں۔ اب ہم انھی فرقوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن کیا کوئی ایک فرقہ بھی ایسا ہے جو خود کو گمراہ سمجھتا ہو؟ بالفاظِ دیگر کیا کوئی ایک بھی فرقہ ایسا ہے جو یہ کہتا ہو کہ ہم کتاب وسُنّت کی مخالفت کرتے ہیں؟ اس کے برعکس ہر فرقے کا یہی دعویٰ ہے کہ ہم کتاب وسُنّت پر قائم ہیں۔ آخر پھر حل کیا ہے؟

کیا رسول اللہؐ کو اس کا حل معلوم نہیں تھا یا خُود اللہ تعالیٰ کو حل معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ رسول اللہؐ تو عَبدِ مَامُور تھے یعنی وہ تو وہی کرتے تھے جو انھیں حُکم ملتا تھا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے : فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ[1]۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور وہ ان کی بھلائی چاہتا ہے، اس لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اس مشکل کا کوئی حل تجویز نہ کرے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلائل کو دیکھنے کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلائل کو دیکھنے کے بعد زندہ رہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں کو نظر انداز کر دے اور انھیں بغیر ہدایت کے چھوڑ دے۔ سوائے اس صورت کے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا منشا ہی یہ ہے کہ اس کے بندے افتراق و انتشار اور گمراہی میں مُبتلا ہوں تاکہ وہ انھیں آتشِ دوزخ میں جھونک دے۔ یہ اعتقاد بالکل غلط اور باطل ہے میں اللہ سے عفو کا طلب گار ہوں اور توبہ کرتا ہوں اس قول سے جو اللہ کی جلالت اور حکمت کے منافی ہے۔

---

[1] آپ انھیں نصیحت کرتے رہیں کہ آپ نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔ سورۃ غاشیہ

اِس لیے رسول اللہ صؐ سے منسوب یہ قول کہ آپ نے اپنے بعد کتاب اور سُنّت چھوڑی ہے، ہماری مشکل کا کوئی معقول حل نہیں ہے، بلکہ اس سے پیچیدگی مزید بڑھتی ہے اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کی جڑ نہیں کٹتی۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب لوگوں نے اپنے امام کے خلاف بغاوت کی تو انھوں نے یہی نعرہ لگایا تھا کہ

لَيْسَ الْحُكْمُ لَكَ يَا عَلِيُّ وَ اِنَّمَا الْحُكْمُ لِلّٰهِ.

علی! تمھارا نہیں اللہ کا حکم چلے گا۔

بہ ظاہر یہ نعرہ بڑا دلکش ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نعرہ لگانے والا اللہ کے حکم کا نفاذ چاہتا ہے اور غیر اللہ کا حکم ماننے سے انکاری ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ.

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کی گفتگو دُنیا کی زندگی میں تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے ما فی الضمیر پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہیں۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۰۴)

جی ہاں! ہم اکثر دلِ فریب نعروں سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ان کے پیچھے کیا ہے، لیکن امام علیؑ بات کو سمجھتے تھے کیونکہ وہ شہرِ علم کا دروازہ تھے۔ اِس لیے آپ نے جواب دیا کہ

كَلِمَةُ حَقٍّ يُّرَادُ بِهَا بَاطِلٌ.

ان کی بات صحیح مگر مقصد غلط ہے۔

جی ہاں! ایسا اکثر ہوا ہے کہ صحیح بات کو غلط مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ آیئے اس کو سمجھ لیں کہ کیسے؟:

جب خوارج امام علیؑ سے یہ کہتے تھے کہ حکم آپ کا نہیں اللہ کا چلے گا، تو کیا ان کا مطلب یہ تھا کہ اللہ زمین پر اتر کر آئے گا اور سب کے سامنے ظاہر ہو کر ان کے اختلافی مسائل کا تصفیہ کرے گا۔ یا وہ یہ تو جانتے تھے کہ اللہ کا حُکم تو قرآن میں ہے لیکن یہ سمجھتے تھے کہ علیؑ نے قرآن کی غلط تاویل کی ہے۔ اگر ایسا تھا تو ان کے پاس

اس کی کیا دلیل تھی، جب کہ علیؑ ان سے زیادہ عالم تھے، ان سے زیادہ راستباز تھے اور ان سے پہلے اسلام لاتے تھے۔ کیا علیؑ سے بڑھ کر بھی کوئی اسلام کا ہمدرد اور وفادار ہو سکتا تھا؟

معلوم ہُوا کہ یہ محض دل فریب نعرہ تھا جس کا مقصد سیدھے سادھے لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کی تائید اور جنگ میں ان کی مُعاونت حاصل کرنا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہی زمانہ وہی لوگ۔ مکروفریب کم نہیں ہوتے بلکہ بڑھتے جاتے ہیں۔ کیونکہ آج کے مکّار اور عیّار لوگ اگلوں کے تجربے سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ صحیح بات کو غلط مقصد کے حصُول کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

آج بھی چمکتے دمکتے ہوئے دل فریب نعرے لگائے جاتے ہیں۔ مثلاً: وہّابی، توحید کی حمایت اور شرک کی مُخالفت کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اب کون مسلمان ہے جو اس اصُول سے اتفاق نہیں کریگا۔ ایک فرقے نے تو اپنا نام ہی اہل سُنّت و الجماعت رکھ چھوڑا ہے۔ کون مُسلمان نہیں چاہے گا کہ وہ اس جماعت کے ساتھ ہو جو سُنّتِ رسولؐ کا اتباع کرتی ہو۔

بعث پارٹی کا نعرہ ہے:

أُمَّةٌ عَرَبِيَّةٌ وَّاحِدَةٌ ذَاتَ رِسَالَةٍ خَالِدَةٌ.

غیر فانی پیغام کی حامِل ایک مُتحد عرب قوم۔

کون مسلمان اس نعرے سے دھوکا نہیں کھائے گا اگر اسے اِس پارٹی اور اس کے عیسائی بانی مائیکل عَفلق کے خُفیہ عزائم کا علم نہیں۔

آفرین ہے آپ کو اے علی بن ابی طالبؑ! آپ کے حکیمانہ اقوال آج بھی قائم ودائم ہیں اور ہمیشہ زمانے کے کانوں میں گونجتے رہیں گے!

فَكَمْ مِّنْ كَلِمَةِ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلُ

کتنی ہی بار ایسا ہوتا ہے کہ صحیح بات کا غلط مطلب لیا جاتا ہے۔

ایک عالِم نے منبر پر چڑھ کر بہ آواز بلند فرمایا:

جو کہے گا کہ میں شیعہ ہوں، ہم اُس سے کہیں گے کہ تو کافر ہے اور جو کوئی کہے گا کہ میں سُنّی ہوں، ہم اس سے بھی کہیں گے کہ تو کافر ہے۔ ہمیں شیعہ چاہئیں نہ سُنّی۔ ہمیں فقط مسلمان چاہئیں۔

یہاں بھی صحیح بات کا غلط مطلب لیا گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ عالم کس اسلام کی بات کر رہا تھا؟

آج دُنیا میں متعدد اسلام ہیں بلکہ قرنِ اول ہی میں متعدد اسلام تھے۔ علیؑ کا بھی اسلام تھا اور مُعاویہ کا بھی اسلام تھا اور دونوں کے پیروکار بھی تھے، آخر لڑائی تک نوبت پہنچی۔

پھر حُسینؑ کا بھی اسلام تھا اور یزید کا بھی اسلام تھا جس نے اہلِ بیت کو اسلام ہی کے نام پر تہہ تیغ کیا۔ اُس نے دعویٰ کیا تھا کہ چونکہ حُسینؑ نے اس کے خلاف خرُوج کیا ہے اس لیے وہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں۔

پھر ائمہؑ اہلِ بیت اور ان کے حامیوں کا اسلام تھا اور حُکمرانوں اور ان کے عوام کا اسلام تھا۔ تاریخ کے ہر دَور میں مسلمانوں میں اس طرح کا اختلاف رہا ہے۔

آج بھی ایک طرف تو ان لوگوں کا اسلام ہے جنھیں مغرب اعتدال پسند اور روشن خیال کہتا ہے کیونکہ اس اسلام کے پیروکاروں نے یہود و نصاریٰ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہوا ہے اور یہ لوگ سپر پاورز کے سامنے سجدہ ریز ہیں ۔ دوسرا اسلام ان کٹّر مسلمانوں کا ہے جنھیں مغرب بُنیاد پرست، متعصّب، دقیانوسی اور مذہبی دیوانے کہتا ہے۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ اس عالِم اور خطیب نے بعد میں اپنے خیالات سے رُجوع کر لیا تھا۔

ان اسباب کے پیشِ نظر جو ہم نے گزشتہ اوراق میں بیان کیے، اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ کِتَابَ اللهِ وَسُنَّتِیْ والی حدیث کو صحیح تسلیم کیا جا سکے۔

اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہو جاتی ہے کہ دُوسری حدیث کِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِیْ ہی صحیح ہے جس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اِس حدیث سے تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اگر ہم اہلِ بیتؑ کی طرف رُجوع کریں جن کی

طرف رجوع کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، تو پھر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ خصوصاً اگر یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ آئمہ جن کو خود رسول اللہؐ نے مقرر کیا ہے وہی اس کام کے اہل ہیں اور مسلمانوں میں کوئی ان کے علم کی وسعت میں اور ان کے زہد و تقویٰ میں شک نہیں کرتا۔ وہ تمام فضائل میں دوسروں سے بڑھ کر ہیں۔ اللہ نے انھیں ہر نجاست سے پاک رکھا ہے اور ان کو اپنی کتاب کا وارث بنایا ہے۔ لہٰذا وہ قرآن کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور نہ اس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں بلکہ تا قیامِ قیامت اس سے جدا نہیں ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے:

> میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں: ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے جو مثل رسّی کے آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے اور دوسری میری عترت یعنی میرے اہلِ بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں گے۔

چونکہ میں سچوں کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں اس لیے ضروری ہے کہ میں فقط حق بات کہوں اور کسی کی ملامت یا اعتراض کی پروا نہ کروں۔ میرا مقصد لوگوں کو خوش کرنے کے بجائے اللہ سُبْحَانَہٗ کی رضا کا حصول اور خود اپنے ضمیر کا اطمینان ہو کیونکہ غیروں کا تو یہ حال ہے کہ

> وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ.
>
> تم سے ہرگز خوش نہیں ہوں گے نہ یہود اور نہ نصاریٰ، جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہ کرنے لگو۔

اس تمام بحث میں شیعہ ہی حق پر ہیں، کیونکہ اہلِ بیتؑ کے معاملے میں انھوں نے رسول اللہؐ کی وصیّت پر عمل کیا ہے۔ اہلِ بیتؑ کی امامت کو تسلیم کیا ہے اور اہلِ بیتؑ کی اطاعت اور ان کی متابعت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پس شیعوں کو دنیا اور آخرت کی یہ کامیابی مبارک ہو۔ حدیث میں

ہے کہ " آدمی کا حشر اس کے ساتھ ہو گا جس سے وہ محبّت رکھتا ہے"۔ پھر کیا کہنے اس شخص کے جو اہلِ بیت سے محبت بھی رکھتا ہو اور ان کا اتباع بھی کرتا ہو۔

زمخشری نے اِس بارے میں کہا ہے:

کَثُرَ الشَّکُّ وَالاِخْتِلَافُ وَ کُلٌّ
یَدَّعِی اَنَّہُ الصِّرَاطُ السَّوِیّ
فَتَمَسَّکْتُ بِلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
وَ حُبِّیْ لِاَحْمَدَؐ وَعَلِیؑ
فَازَ کَلْبٌ بِحُبِّ اَصْحَابِ کَہْفٍ
فَکَیْفَ اَشْقٰی بِحُبِّ اٰلِ النَّبِیؐ

شک اور اختلاف بہت بڑھ گیا ہے اور ہر شخص کا دعویٰ ہے، کہ وہ سیدھی راہ پر ہے۔ ایسے میں میں نے دو چیزوں کو مضبوطی سے تھام لیا ہے: ایک رِیسمانِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کو اور دُوسرے احمدؐ وعلیؑ کی محبّت کو۔ اصحابِ کہف سے محبّت کے سبب اگر ایک کُتّا کامیاب ہو سکتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آلِ محمدؐ سے محبّت کے باوجود مجھے دُرِّ مقصد نہ ملے۔

سعدی گر عاشقی کنی و جوانی
عشقِ محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

اے اللہ! تو ہمیں ان لوگوں میں سے بنا دے جنھوں نے وِلائے اہلِ بیتؑ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے، جو اُن کے راستے پر گامزن ہیں، اُن کی کشتی پر سوار ہیں، ان کی امامت کے قائل ہیں اور جو اُن کی جماعت میں محشور ہوں گے۔ بے شک تو جس کو چاہتا ہے صراطِ مُستقیم پر چلنے کی توفیق دے دیتا ہے۔

خمس

یہ بھی اُن مسائل میں سے ہے جن پر شیعوں اور سُنّیوں میں اختلاف ہے اس سے قبل کہ ہم کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ کریں، خمس کے موضوع پر مختصر بحث ضروری ہے، جس کی ابتدا ہم قرآنِ کریم سے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔

اور یہ جان لو کہ جو مال تمھیں حاصل ہو اس کا پانچواں حصّہ اللہ اور رسولؐ کے لیے، رسولؐ کے قرابتداروں کے لیے اور یتیموں ناداروں اور مُسافروں کے لیے ہے۔ (سورۂ انفال۔ آیت ۴۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے :

اٰمُرُکُمْ بِاَرْبَعٍ : اَلْاِیْمَانِ بِاللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ وَصِیَامِ رَمَضَانَ وَاَنْ تُؤَدُّوا اللّٰہَ خُمُسَ مَا غَنِمْتُمْ۔

اللہ تعالیٰ نے تمھیں چار چیزوں کا حُکم دیا ہے : ایمان باللہ کا، نماز قائم کرنے کا، زکات دینے کا اور اس کا کہ تُم جو کچھ کماؤ اس کا پانچواں حصّہ اللہ کو ادا کرو۔[۱]

چنانچہ شیعہ تو ائمۂ اہلِ بیتؑ کی پیروی کرتے ہوئے جو مال انھیں سال بھر میں حاصل ہوتا ہے اس کا خُمس نکالتے ہیں۔ اور غنیمت کی تشریح یہ کرتے ہیں

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۴۴۔

کہ اس سے مُراد وہ نفع ہے جو آدمی کو عام طور پر حاصل ہوتا ہے۔
اس کے برخلاف اہلِ سُنّت کا اس پر اتفاق ہے کہ خمس[5] اس مالِ غنیمت سے مخصوص ہے جو کُفّار سے جنگ کے دوران میں حاصل ہو۔ ان کے نزدیک مَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ کے معنیٰ ہیں کہ جو کچھ تمہیں جنگ کے دوران میں لُوٹ کے مال سے حاصل ہو (جبکہ آیت میں دارالحرب کا خصوصیت سے ذکر نہیں اور مِنۡ شَیۡءٍ کے الفاظ عمومیت کے حامل ہیں)۔

---

[5] خمس کے موضوع پر صحیح بُخاری کے علاوہ صحیح مُسلم، جامع ترمذی، سُنن ابی داؤد، سُنن نسائی اور سُنن ابن ماجہ میں حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی متعدد احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ نے نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ خمس کی ادائیگی کو بھی واجب قرار دیا تھا۔
اختصار کے پیشِ نظر ہم یہاں صرف صحیح مُسلم سے ایک روایت کا متن درج کر رہے ہیں۔ طالبانِ تفصیل علاّمہ سیّد ابنِ حسن نجفی صاحب کی کتاب مسئلۂ خُمس ملاحظہ فرمائیں۔

> ابن عبّاس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبدالقیس کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہٖ) وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہؐ! ہم ربیعہ کے قبیلے سے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان مُضَر کا کافر قبیلہ حائل ہے اور حُرمت والے مہینوں کے علاوہ دوسرے زمانے میں ہم آپ تک نہیں پہنچ سکتے! لہٰذا آپ ہمیں کوئی ایسی ہدایت فرمائیں جس پر ہم خود بھی عمل پیرا ہوں اور اپنے دوسرے لوگوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی دعوت دیں۔ آپ نے فرمایا: تم کو حکم دیتا ہوں چار باتوں کے لیے اور منع کرتا ہوں چار باتوں سے۔ پھر آپ نے توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ گواہی دو اس بات کی کہ کوئی معبود برحق نہیں سوائے خُدا کے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ نیز نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اپنی کمائی میں سے خمس ادا کرو۔
>
> (صحیح مُسلم جلد ۱ صفحہ ۹۳ ـ مطبوعہ لاہور)

(ناشر)

یہ خلاصہ ہے خُمس کے بارے میں فریقین کے اقوال کا۔ میں حیران ہوں کہ کیسے میں خُود کو یا کسی اور کو اہلِ سُنّت کے قول کی صِحّت کا یقین دلاؤں جب کہ میرا خیال ہے کہ اس بارے میں اہلِ سُنّت نے اُموی حکمرانوں کے قول پر اعتماد کیا ہے خصُوصاً مُعاوِیہ بن ابی سُفیان کی رائے پر۔ جب کہ مُعاویہ بن ابی سُفیان نے مسلمانوں کے اموال پر قبضہ کر کے سب سونا چاندی اپنے لیے اور اپنے مقرّبین کے لیے مخصوص کر لیا تھا اور اس کا نگراں اپنے بیٹے یزید کو بنایا تھا جو بندروں اور کُتّوں کو سونے کے کنگن پہناتا تھا جب کہ بعض مُسلمان بھُوکے مرتے تھے۔

اِس لیے اِس میں کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ اہلِ سُنّت خمُس کو دارالحرب سے مخصوص کرتے ہیں کیونکہ یہ آیت ان آیات کے درمیان واقع ہوئی ہے جن کا تعلّق جنگ سے ہے۔ ایسی بہت سی آیات ہیں جن کی تفسیر اہلِ سُنّت اگر کوئی مصلحت اس کی مقتضی ہو تو ان سے پہلی یا بعد کی آیات کے معنیٰ کی مُناسبت سے کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ آیۂ تطہیر ازواجِ رسولؐ سے مخصوص ہے کیونکہ اس سے پہلی اور بعد کی آیات میں ازواجِ رسولؐ ہی کا ذکر ہے۔

اِسی طرح اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ اہلِ کتاب سے مخصوص ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

جو لوگ سونا چاندی جوڑ کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں دردناک عذاب کی خُوشخبری دیدیجیے۔

(سورۂ توبہ۔ آیت ۳۴)

اس سلسلے میں ابُوذر غِفاریؓ کے مُعاویہ اور عُثمان سے اختلاف کا اور ابوذرؓ کا رَبَذہ میں شہر بدر کیے جانے کا قصّہ مشہور ہے۔ ابوذرؓ جو سونا چاندی جمع کرنے پر اعتراض کرتے تھے وہ اسی آیت سے استدلال کرتے تھے۔ لیکن عُثمان نے کعب الاحبار سے مشورہ کیا تو کعب الاحبار نے کہا کہ یہ آیت اہلِ کتاب سے مخصوص ہے۔ اس پر ابوذر غفاریؓ غصّے سے بولے: یہودی کے بچّے! تیری ماں تجھے روئے اب تو ہمیں ہمارا دین سکھائے گا؟ اس پر عُثمان ناراض ہو گئے اور ابوذرؓ کو ربذہ

میں شہر بدر کر دیا۔ وہ وہیں اکیلے پڑے پڑے کس مپرسی کی حالت میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی بیٹی کو کوئی ایسا شخص بھی دستیاب نہ ہو سکا جو اُن کو غسل وکفن دے سکتا۔

اہلِ سُنّت نے آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کی تاویل کو ایک فن بنا دیا ہے۔ ان کی فقہ اس سلسلے میں مشہور ہے۔ اس مُعاملے میں وہ ان خُلفائے اوّلین اور مشاہیر صحابہ کا اتباع کرتے ہیں جو نصُوصِ صریحہ کی تاویل کرتے ہیں [1]

اگر ہم ایسے تمام نصُوص گنوانے لگیں تو ایک الگ کتاب کی ضرورت ہوگی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ النص والاجتہاد نامی کتاب کا مُطالعہ کرے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ تاویل کرنے والوں نے کس طرح اللہ کے احکام کو کھیل بنا دیا۔

اگر میرا مقصد تحقیق ہے تو پھر مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کی اپنی خواہش کے مطابق یا جس مذہب کی طرف میرا رُجحان ہے اس کے تقاضوں کے مطابق تاویل کرنے لگوں۔

لیکن اس کا کیا علاج کہ اہلِ سُنّت نے خود ہی اپنی صِحاح میں وہ روایات بیان کی ہیں جن کے مطابق دارُالحرب سے باہر خمُس کی فرضیت کا ثبوت ملتا ہے اور اس طرح اپنے مذہب اور اپنی تاویل کی خود ہی تغلیط اور تردید کر دی ہے۔

مگر معمّا پھر بھی حل نہیں ہوتا۔

معمّا یہ ہے کہ آخر اہلِ سُنّت ایسی بات کیوں کہتے ہیں جس پر عمل نہیں کرتے۔ وہ اپنی حدیث کی کتابوں میں وہی اقوال بیان کرتے ہیں جن کے شیعہ قائل ہیں۔ لیکن ان کا عمل سراسر مختلف ہے۔ آخر کیوں؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔

خمُس کا موضوع بھی ان ہی مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں سُنّی خُود اپنی روایات پر عمل نہیں کرتے۔

---

[1] علامہ شرف الدین نے اپنی کتاب النص والاجتہاد میں نصُوص صریحہ میں تاویل کی سَو سے زیادہ مثالیں جمع کی ہیں جسے تحقیق مقصود ہو وہ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔

صحیح بُخاری کے ایک باب میں ایک عُنوان ہے : فِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ (دفینے میں خمُس ہے)۔ مالک اور ابنِ ادریس کہتے ہیں کہ رِکاز وہ مال ہے جو قبل از اسلام دفن کیا گیا تھا۔ یہ تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں خمُس ہے۔ جبکہ معدنی ذخائر رِکاز یا دفینہ نہیں ہیں۔ رسول اللہ ص نے فرمایا ہے کہ رِکاز میں خمُس ہے۔[1]

ابنِ عباس رض کہتے ہیں کہ عنبر رکاز نہیں ہے۔ وہ تو ایک چیز ہے جسے سمندر پھینکتا ہے لیکن حسن بصری کہتے ہیں کہ عنبر اور موتی میں بھی خمُس ہے۔[2]

اِس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غنیمت کا وہ مفہوم جس پر اللہ تعالیٰ نے خمُس واجب کیا ہے دارُالحرب سے مخصوص نہیں کیونکہ رِکاز یا دفینہ وہ خزانہ ہے جو زمین کے اندر سے نکالا جائے۔ یہ خزانہ ملکیت ہوتا ہے اسی کی جو اس کو نکالے لیکن اس پر خمُس کی ادائیگی واجب ہے اس لیے کہ دفینہ بھی مالِ غنیمت ہے۔ اِسی طرح عنبر اور موتی جو سمندر سے نکالے جائیں ان پر بھی خمُس نکالنا واجب ہے، کیونکہ وہ بھی مالِ غنیمت ہیں۔

بخاری نے اپنی صحیح میں جو روایات بیان کی ہیں ان سے اور مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اہلِ سُنّت کے اقوال اور ان کے افعال میں تضاد ہے، ورنہ بُخاری تو اہلِ سُنّت کے معتبر ترین محدّث ہیں، ان کی روایات پر عمل نہ کرنے کے کیا معنیٰ؟

شیعوں کی رائے ہمیشہ مبنی بر حقیقت ہوتی ہے۔ اس میں نہ کوئی تضاد ہوتا ہے نہ اختلاف۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد میں بھی اور احکام میں بھی آئمہ اہلبیتؑ کی طرف رُجوع کرتے ہیں جن کی شان میں آیۂ تطہیر اُتری ہے اور جن کو رسول اللہ ص نے کتابُ اللہ کے ہمدوش قرار دیا ہے۔ پس جس نے ان کا دامن پکڑ لیا وہ گمراہ نہیں ہو سکتا اور جس نے ان کی پناہ حاصل کر لی وہ محفوظ ہو گیا۔

علاوہ ازیں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ہم جنگوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ یہ بات

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۲ صفحہ ۱۳۷ باب فِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ۔

[2] صحیح بُخاری جلد ۲ صفحہ ۱۳۶ باب مَا یُسْتَخْرَجُ مِنَ الْبَحْرِ۔

اسلام کی وسیع النظری اور صُلح پسندی کے خلاف ہے۔ اسلام کوئی سامراجی حکومت نہیں ہے جس کا مقصد دوسری قوموں کا استحصال کرنا، ان کے وسائل سے ناجائز فائدہ اُٹھانا اور انھیں لُوٹنا ہو۔ یہ تو وہ الزام ہے جو اہل مغرب ہم پر لگاتے ہیں جو اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام طاقت اور تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور اس کا مقصد غیر قوموں کے وسائل پر ناجائز قبضہ کرنا ہے۔

مال زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اسلام کا اقتصادی نظریہ یہ ہے کہ لوگوں کو معاشی تحفظ کی ضمانت دی جائے جسے آج کل کی اصطلاح میں سوشل سیکیورٹی کہا جاتا ہے اور ہر فرد کی ماہوار یا سالانہ کفالت کا انتظام کیا جائے نیز معذوروں اور حاجت مندوں کو باعزّت روزی کی ضمانت فراہم کی جائے۔

ایسی حالت میں اسلامی حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس آمدنی پر انحصار کرے جو اہلِ سُنّت زکات کے نام سے نکالتے ہیں جس کی مقدار زیادہ سے زیادہ ڈھائی فیصد ہوتی ہے۔ یہ تناسب اتنا کم ہوتا ہے کہ حکومت کی ایسی ضروریات کے لیے ناکافی ہے مثلاً افواج کو کیل کانٹے سے لیس کرنا، اسکول اور کالج بنانا، ڈسپنسریاں اور ہسپتال قائم کرنا، سڑکیں اور پل تعمیر کرنا وغیرہ۔ حالانکہ حکومت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شہری کو اتنی آمدنی کی ضمانت دے جو اس کے گزر بسر کے لیے کافی ہو۔

اسلامی حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی اور اپنے اداروں اور افراد کی بقا اور ترقی کے لیے خوں ریز جنگوں پر انحصار کرے یا ان مقتولین کی قیمت پر ترقی کرے جو اسلام میں دلچسپی نہ رکھنے کی پاداش میں قتل کردیے گئے ہوں۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ سب بڑی اور ترقی یافتہ حکومتیں تمام اشیائے صرف پر ٹیکس لگاتی ہیں جس کی مقدار تقریباً بیس فیصد ہوتی ہے۔ خمس کی بھی اتنی ہی مقدار اسلام نے اپنے ماننے والوں پر فرض کی ہے۔ اہلِ فرانس جو T.V.A ادا کرتے ہیں اس کی مقدار ۱۸۶۵ فیصد ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر انکم ٹیکس کا اضافہ کرلیا جائے تو یہ مقدار ۲۰ فیصد یا کچھ زیادہ ہوجاتی ہے۔

ائمہ اہلِ بیتؑ کو قرآن کے مقاصد کا دُوسروں سے زیادہ علم تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ ترجمانِ قرآن تھے۔ اسلامی حکومت کی اقتصادی اور اجتماعی حکمت عملی وضع کرنا ان کا کام تھا بشرطیکہ ان کی بات مانی جاتی مگر افسوس کہ اقتدار اور اختیار دوسروں کے ہاتھ میں تھا، جنھوں نے طاقت کے بل پر زبردستی خلافت پر قبضہ کرلیا تھا اور متعدد صحابہ صالحین کو قتل کردیا تھا اور اپنی سیاسی اور دُنیوی مصلحتوں کے مطابق اللہ کے احکام میں ردّوبدل کردیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خُود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ نتیجۃً اُمّت پستی کے تحت الثریٰ میں گرگئی جس سے وہ آج تک نہیں اُبھر سکی۔

ائمہؑ کی تعلیمات نے ایسے افکار اور نظریات کی شکل اختیار کرلی جن پر شیعہ آج بھی یقین رکھتے ہیں لیکن عملی زندگی میں ان کی تطبیق کی کوئی صورت نہ رہی شیعوں کو مشرق و مغرب میں ہر طرف دھتکار دیا گیا۔ اُموی اور عبّاسی صدیوں تک اُن کا پیچھا کرتے رہے۔

جب یہ دونوں حکومتیں ختم ہوگئیں تب جاکر شیعوں کو ایسا مُعاشرہ قائم کرنے کا موقع ملا جس میں وہ خمُس ادا کرسکتے تھے۔ پہلے وہ خمُس خُفیہ طور پر ائمہؑ علیہم السلام کو ادا کرتے تھے، اب وہ اپنے مرجعِ تقلید کو امام مہدی علیہ السلام کے نائب کی حیثیت میں ادا کرتے ہیں۔ اور مراجعِ تقلید اس رقم کو شرعی کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ مثلاً وہ اس رقم سے دینی مدارس، علمی مراکز، اشاعت اسلام کے لیے اشاعتی ادارے نیز خیراتی ادارے، پبلک لائبریریاں اور یتیم خانے وغیرہ قائم کرتے ہیں۔ دینی علوم کے طالب علموں کو ماہانہ وظائف وغیرہ بھی دیتے ہیں۔

اِس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ شیعہ عُلماء حکومت کے دست نگر نہیں اس لیے کہ خمُس کی رقم ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں بلکہ وہ خود مستحقین کو ان کے حُقوق پہنچاتے ہیں۔ اس لیے وہ حکمرانوں کا تقرّب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اس کے برخلاف، عُلمائے اہلِ سُنّت حکام وقت کے دست نگر اور ان کے ملازم ہیں۔ حکام اپنی مصلحت کے مطابق جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں اور جس کو

چاہتے ہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح عُلما، کا تعلّق عوام سے کم اور ایوانِ اقتدار سے زیادہ ہوگیا ہے۔

اب آپ خود دیکھیے کہ خمُس کے حکم کی تاویل کا اُمّت کے معاملات پر کیا اثر پڑا۔ اِس صورت میں ان مسلمان نوجوانوں کو کیسے الزام دیا جاسکتا ہے جنھوں نے اسلام کو چھوڑ کر کمیونزم کا راستہ اس لیے اختیار کرلیا کہ انھیں کمیونزم کے نظریہ میں اس نظام کی نسبت جو ہمارے یہاں رائج ہے، دولت کی تقسیم قوم کے تمام افراد میں زیادہ منصفانہ نظر آئی۔

ہمارے یہاں تو ایک ظالم طبقہ ایسا ہے جو ملک کی ساری دولت پر قبضہ جمائے ہوئے ہے جبکہ ملک کی غالب اکثر افلاس میں دن گزار رہی ہے۔

جن دولت مندوں کے دل میں تھوڑا بہت اللہ کا خوف ہے، وہ بھی سال میں ایک مرتبہ زکات نکالنے کو کافی سمجھتے ہیں جو فقط ڈھائی فیصد ہوتی ہے اور جس سے غریبوں کی سالانہ ضرورت کا دسواں حصہ بھی پورا نہیں ہوتا۔

تقلید

شیعہ کہتے ہیں کہ فروعِ دین شریعت کے وہ احکام ہیں جن کا تعلّق ان اعمال سے ہے جو عبادت ہیں جیسے : نماز، روزہ، زکات اور حج وغیرہ - ان کے بارے میں مندرجۂ ذیل تین صورتوں میں سے کسی ایک پر عمل واجب ہے :-

الف - یا تو آدمی خود اِجتہاد کرے اور احکام کے دلائل پر غور کرے (بشرطیکہ اس کا اہل ہو -)

ب - یا احتیاط پر عمل کرے بشرطیکہ احتیاط کی گنجائش ہو -

ج - یا پھر کسی جامعِ الشرائط مُجتہد کی تقلید کرے -

جس کی تقلید کی جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندہ، عاقِل، عادِل پرہیزگار اور دین پر عامِل ہو - اپنی خواہشاتِ نفسانی پر نہ چلتا ہو بلکہ احکاماتِ الٰہی کی پیروی کرتا ہو -

فروعی احکام میں اجتہاد[1] تمام مسلمانوں پر واجب کفائی ہے، اگر کوئی ایک بھی

---

[1] اِجتہاد کی اصطلاح شیعوں کے ہاں بھی موجود ہے لیکن اس کے وہ معنیٰ نہیں جو سُنّیوں نے عملی طور پر اسے دے دیے ہیں - سُنّیوں کے ہاں عملاً اجتہاد میں "ذاتی رائے کے اِظہار" کا عُنصر بھی موجود ہے جبکہ شیعوں میں اجتہاد فقط احکامِ الٰہی کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے اور مُجتہد کسی طور بھی اپنی ذاتی رائے کا اظہار نہیں کرتا - البتہ اِصطِلاح کی تعریف کرتے وقت دونوں مکاتب کی اُصولی کتابوں میں ایک ہی جملہ استعمال ہوتا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلّق ہے سُنّیوں میں فَقیہ یا غیر معصوم صحابی کی رائے کا احکام میں دخل ہے - جبکہ شیعوں کا مکتب صرف خُدا و رسول ص کے احکامات و ارشادات کو معتبر گردانتا ہے - مثلاً امام محمّد باقر ع یا امام جعفر صادق ع یہ نہیں کہتے تھے کہ اَنَا اَقُوْلُ : (میں کہتا ہوں:) یا اَنَا اُحَرِّمُ (میں حرام کرتا ہوں) بلکہ یہی کہتے تھے کہ رسول اللہ ص نے یوں فرمایا ہے : یا خُدا نے یوں فرمایا ہے - یہ مکتبِ اہلِ بیت کا امتیاز ہے -

مکتبِ اہلِ بیت کے اُصولِ تفکر کے نمونے کے طور پر ہم آپ کے لیے ایک بزرگ عالم

مسلمان جس میں اس کام کی علمی لیاقت اور استعداد ہے، اس کام کو کرلے تو باقی مسلمانوں سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔

شیعہ ان علماء کا اجتہاد کافی سمجھتے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی اجتہاد کا رتبہ حاصل کرنے میں صرف کی ہو۔ مسلمانوں کے لیے ایسے مجتہد کی تقلید کرنا اور فروعِ دین میں اس کی طرف رجوع کرنا جائز ہے۔ لیکن اجتہاد کا رتبہ حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں اور نہ اس کا حصول سب کے لیے ممکن ہے۔ اس کے لیے بہت وقت اور بہت وسیع علمی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ سعادت صرف اسے ہی میسّر آتی ہے جو سخت محنت اور کوشش کرتا اور اپنی عمر تحقیق و تعلّم میں کھپاتا ہے۔ ان میں بھی اجتہاد کا رتبہ صرف خاص خاص خوش نصیبوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِى الدِّيْن.

اللہ جس کے ساتھ نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں شیعوں کا یہ قول اہلِ سُنّت کے ایسے ہی قول سے مختلف نہیں۔ صرف اس بارے میں اختلاف ہے کہ تقلید کے لیے مجتہد کا زندہ ہونا ضروری ہے یا نہیں۔

لیکن شیعوں اور سُنّیوں میں واضح اختلاف اس میں ہے کہ تقلید پر عمل کیسے

عثمان بن سعید عمری رح کا قول نقل کرتے ہیں جو حضرت ولیٔ عصر اَرْوَاحُنَالَهُ الْفِدَاء کے نائبِ خاص تھے۔ جب انھوں نے ایک شیعہ کے سوال کے جواب میں ایک عمل کی حرمت کا فیصلہ دیا تو ان الفاظ کا اضافہ کیا:

"میں یہ فیصلہ اپنی طرف سے نہیں دے رہا۔ میرے لیے کسی صورت میں روا نہیں کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دوں" (یعنی میں فقط امام علیہ السلام کا قول نقل کر رہا ہوں)، اُصولِ کافی جلد ۱۔ وَسَائِلُ الشیعہ جلد ۱۸ صفحہ ۱۰۰

(ناشر)

کیا جائے۔ شیعوں کا اعتقاد ہے کہ وہ مجتہد جس میں مندرجہ بالا سب شرائط پائی جاتی ہوں امام علیہ السلام کا نائب ہے اور غیبتِ امام کے زمانے میں وہ حاکم اور سربراہ ہے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے اور لوگوں پر حکومت کرنے کے اسے وہی اختیارات حاصل ہیں جو امام کو ہیں۔ مجتہد کے احکام کا انکار خود امام کا انکار ہے۔

شیعوں کے نزدیک جامع الشرائط مجتہد کی طرف صرف فتوے کے لیے ہی رجوع نہیں کیا جاتا بلکہ اسے اپنے مُقلّدین پر ولایتِ عامہ بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے مُقلّدین اپنے مقدمات کے تصفیہ کے لیے بھی اپنے مجتہد ہی سے رجوع کرتے ہیں اور اپنے اموال کا خمس اور زکات بھی اپنے مرجعِ تقلید ہی کو ادا کرتے ہیں، جو خمس اور زکات میں امامِ زمانہؑ کے نائب کی حیثیت سے شریعت کے مطابق تصرّف کرتا ہے۔

لیکن اہلِ سُنّت والجماعت کے نزدیک مُجتہد کا یہ مرتبہ نہیں۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ امام نائبِ رسول ہوتا ہے۔ فقہی مسائل میں البتہ وہ صاحبِ مذاہبِ اربعہ میں کسی ایک کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان ائمّہ اربعہ کے نام یہ ہیں:

(۱) ابُوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زُوطی (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ)

(۲) مالک بن اَنَس بن مالک بن ابی عامر اصبحی (۹۳ھ تا ۱۷۹ھ)

(۳) محمد بن ادریس بن عبّاس بن عثمان بن شافع (۱۵۰ھ تا ۱۹۸ھ)

(۴) احمد بن محمّد بن حنبل بن ہلال (۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ)

موجودہ دور کے بعض اہلِ سُنّت ان میں سے کسی ایک مُعیّن امام کی تقلید نہیں کرتے، بلکہ اپنی مصلحت کے مطابق بعض مسائل میں کسی ایک امام کی تقلید کرتے ہیں اور کچھ دوسرے مسائل میں کسی دوسرے امام کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ سیّد سابق نے جنھوں نے چاروں اماموں کے فقہ سے ماخوذ ایک کتاب مرتب کی ہے، ایسا ہی کیا ہے۔ کیونکہ اہلِ سُنّت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اصحابِ مذاہب کا اختلاف رحمت ہے۔ اس لیے اگر کسی مالکی کو اپنی مشکل کا حل اپنے امام کے یہاں نہ ملے اور امام ابوحنیفہ کے یہاں مل جائے تو وہ امام ابُوحنیفہ کے قول پر عمل کرلے۔

میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں تاکہ مطلب واضح ہوجائے:

ہمارے یہاں تیونس میں ایک بالغ لڑکی تھی، یہ اس زمانے کی بات ہے

جب یہاں قاضی کورٹس ہوا کرتی تھیں۔ اس لڑکی کو ایک شخص سے محبت ہوگئی۔ یہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر اس کا باپ اللہ جانے کیوں اس سے اس کے نکاح پر راضی نہیں تھا۔ آخر لڑکی باپ کے گھر سے بھاگ گئی اور اس نے اس نوجوان سے باپ کی اجازت کے بغیر نکاح کرلیا۔ باپ نے شوہر کے خلاف دعویٰ دائر کردیا۔

جب لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ عدالت میں پیش ہوئی تو قاضی نے اس سے گھر سے بھاگنے اور ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا:

"جناب عالی! میری عمر ۲۵ سال ہے۔ میں اس شخص سے اللہ رسولؐ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق شادی کرنا چاہتی تھی، لیکن میرا باپ میرا بیاہ ایسے شخص سے کرنا چاہتا تھا جو مجھے بالکل پسند نہیں تھا۔ میں نے امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق شادی کرلی کیونکہ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق مجھے بالغ ہونے کی وجہ سے حق ہے کہ میں جس سے چاہوں شادی کرلوں۔"

اللہ بخشے قاضی صاحب جنھوں نے یہ قصّہ مجھے خود سُنایا تھا، کہنے لگے: جب ہم نے اس مسئلہ کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ لڑکی ٹھیک کہتی تھی۔ میرا خیال ہے شاید کسی جاننے والے عالم نے سکھایا تھا کہ عدالت میں جاکر کیا بیان دے۔

قاضی صاحب کہتے تھے کہ میں نے باپ کا دعویٰ خارج کردیا اور نکاح کو باقی رکھا۔ باپ غصّہ میں بھرا ہوا عدالت سے باہر نکلا۔ وہ ہاتھ مل رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ "کُتیا حنفی ہوگئی"۔ یعنی امام مالک کو چھوڑ کر امام ابوحنیفہ کا مذہب اختیار کرلیا۔ بعد میں وہ شخص کہتا تھا کہ میں اس کُتیا کو عاق کردوں گا۔

یہ مسئلہ اجتہادی اختلاف کا ہے:-

امام مالک کی رائے ہے کہ کنواری باکرہ لڑکی کا نکاح سرپرست کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اگر مطلّقہ یا بیوہ ہو تب بھی ولی کی اجازت ضروری ہے

ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ بالغہ چاہے باکرہ ہو یا مطلقہ و بیوہ اسے خود اپنا شوہر پسند کرنے اور عقد کرنے کا اختیار ہے۔

تو اِس فقہی مسئلے نے باپ بیٹی میں جُدائی ڈال دی۔ یہاں تک کہ باپ نے بیٹی کو عاق کردیا۔

پہلے زمانے میں تیونس میں اکثر باپ مختلف وجوہ سے بیٹیوں کو عاق کر دیا کرتے تھے، جن میں سے ایک وجہ یہ ہوتی تھی کہ لڑکی جس سے شادی کرنا چاہتی تھی اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ عاق کرنے کا انجام بڑا خراب ہوتا ہے کیونکہ جب باپ بیٹی کو میراث سے محروم کر دیتا ہے تو لڑکی اپنے بھائیوں کی دشمن بن جاتی ہے اور بھائی خود بھی بہن کو چھوڑ دیتے ہیں، کیونکہ بہن کے بھاگنے کو بھائی اپنے لیے کلنک کا ٹیکہ سمجھتے ہیں۔

اس طرح معاملہ ویسا نہیں ہے جیسا کہ اہلِ سُنّت سمجھتے ہیں کہ اصحابِ مذاہب فقہا، کا اختلاف ہمیشہ رحمت ہوتا ہے۔ کم از کم یہ اختلاف ہر مسئلے میں رحمت نہیں ہے، کیونکہ ہمارے لیے معاشرتی اور قبائلی اختلافات اور روایات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

ایک ایسے معاشرے میں جس کی نشوونما مالکی افکار پر ہوئی ہو اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عورت کو یہ حق ہو کہ وہ گھر سے بھاگ جائے اور باپ کی اجازت کے بغیر کسی سے نکاح کر لے۔ جو عورت ایسا کرے گی اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ اس نے گویا اسلام کا انکار کیا یا ایک ناقابلِ معافی گناہ کا ارتکاب کیا۔ جبکہ دوسرے مذہب کی رو سے اس نے ایسا کام کیا جو نہ صرف جائز ہے بلکہ اسے اس کا حق بھی ہے۔ اسی لیے مالکی معاشرے کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حنفی معاشرے میں نسبتاً جنسی آزادی اور آوارگی ہے۔ اِن مذہبی اختلافات کے نتیجے میں عورت اپنے بہت سے حقوق سے محروم ہے اور وہ اس صورت حال کا الزام دینِ اسلام کو دیتی ہے۔ اسی لیے ہم ان بعض نوجوان عورتوں کو الزام نہیں دے سکتے جو اپنے مذہب کا اس لیے انکار کرنے لگتی ہیں کیونکہ ان کے بڑے ان کے ساتھ خلاف شریعت ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔

اِس مثال کے بعد ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں:۔

اہلِ سُنّت کے نزدیک جس امام کی تقلید کی جائے اُسے اس تقلید سے وہ درجہ حاصل نہیں ہو جاتا جس کے شیعہ قائل ہیں یعنی نیابتِ رسولؐ کا درجہ۔ اس کی وجہ شوریٰ اور خلیفہ یا امام کے انتخاب کا نظریہ ہے۔ اہلِ سُنّت نے خود اپنے

آپ کو یہ حق دے دیا ہے کہ وہ جس کو چاہیں خلیفہ یا بہتر الفاظ میں امام بنادیں۔ اسی طرح ان کے خیال میں انھیں یہ بھی حق ہے کہ وہ چاہیں تو امام کو معزول کردیں یا اس کے بجائے جسے اپنی دانست میں بہتر سمجھیں اسے مقرر کردیں ، اس طرح درحقیقت وہ امام کے بھی امام ہوگئے ۔ یہ صورت شیعہ عقیدہ کے بالکل برعکس ہے۔

اگر ہم اہل سُنّت کے پہلے امام یعنی ابُوبکر صدیق پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انھوں نے اُمّت سے اپنے پہلے خطاب میں کہا تھا :

اَیُّھَا النَّاسُ لَقَدْ وُلِّیْتُ عَلَیْکُمْ وَلَسْتُ بِخَیْرِکُمْ فَاِنْ اَطَعْتُ فَاَعِیْنُوْنِیْ وَاِنْ عَصَیْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ ....

"لوگو! مجھے تمھارا والی چن لیا گیا ہے اگرچہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں ۔ چنانچہ جب تک میں صحیح راستے پر چلوں میرے ساتھ تعاون کرو اور جب میں بھٹک جاؤں ، تو مجھے صحیح راہ پر چلادو ..."

اِس طرح ابوبکر خُود اعتراف کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے ان کو پسند کیا ہے اور ان کی بیعت کی ہے انھیں یہ بھی حق ہے کہ معصیت اور خطا کی صورت میں وہ ان کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

اِس کے برعکس، جب ہم شیعوں کے پہلے امام یعنی علی بن ابی طالبؑ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ ان کی امامت کے قائل ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ان کو امام مان کر دراصل حُکمِ خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک امام علیؑ کو ایسی ہی ولایتِ مُطلقہ حاصل ہے جیسی اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہے ۔ جس کو خُود اللہ نے منتخب کیا ہو بھلا اس کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کوئی خطا کرے یا کسی معصیت کا مُرتکب ہو؟ اسی طرح اُمّت کے لیے بھی یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ اس کے کسی حُکم کی مخالفت کرے یا اس کا مُقابلہ کرے کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا۔

چونکہ حضرت علیؑ کو مسلمانوں کا امام اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کیا تھا، اس لیے ان کی حکم عدولی نہیں کی جاسکتی تھی نہ یہ ممکن تھا کہ حضرت علیؑ کسی معصیت کا ارتکاب کریں اسی لیے رسول اللہؐ نے فرمایا تھا:

عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ وَلَنْ يَفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ.

"علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے جب تک میرے پاس حوض پر نہ آجائیں"۔[1]

تقلید کے بارے میں فریقین کا استدلال ان کے دو مختلف نظریوں کی بنیاد پر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مطلب ہے سنیوں کا شوریٰ کا نظریہ اور شیعوں کا نص کا نظریہ۔

اس کے بعد تقلید کے متعلق شیعوں اور سنیوں میں صرف ایک اور اختلافی مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے "تقلیدِ میّت کا مسئلہ"۔

اہلِ سنّت جن ائمہ کی تقلید کرتے ہیں انھیں فوت ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ اسی زمانے کے بعد سے اہلِ سنّت کے یہاں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ ان ائمہ کے بعد جو علماء ہوئے ان کی ساری توجہ صرف اگلی کتابوں کی شرحیں لکھنے اور مذاہبِ اربعہ کے مطابق فقہی مسائل کے نظم اور نثر میں مجموعے مرتب کرنے پر مرکوز رہی۔ اب چونکہ بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن کا ائمہ کے زمانے میں وجود بھی نہیں تھا، اس لیے بعض معاصرین آواز اٹھا رہے ہیں کہ زمانے کی مصلحت کا

---

[1] محمد بن عیسیٰ ترمذی جامع ترمذی جلد ۵ صفحہ ۲۹۷ - علاء الدین متقی ہندی کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۳۰ - محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۴ - جار اللہ زمخشری ربیع الابرار ابن حجر عسقلانی صواعق محرقہ صفحہ ۱۲۲ - ابن ابی الحدید معتزلی شرح نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۵۷۲ - حافظ ابوبکر خطیب بغدادی تاریخ بغداد جلد ۱۴ صفحہ ۳۲۱ - حافظ ابن عساکر تاریخ دمشق جلد ۳ صفحہ ۱۱۹ - ابن قتیبہ دینوری الامامۃ والسیاسۃ جلد ۱ صفحہ ۷۳ -

تقاضا یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ پھر سے کھول دیا جائے۔

اس کے برعکس، شیعہ میّت کی تقلید جائز نہیں سمجھتے اور اپنے تمام احکام کے بارے میں ایسے زندہ مجتہد کی طرف رُجوع کرتے ہیں جس میں وہ سب شرائط پائی جاتی ہوں جن کا ہم نے گزشتہ اوراق میں ذکر کیا ہے۔ یہ صورت امام معصومؑ کی غَیبت کے زمانے میں ہے۔ جب تک امام معصوم دوبارہ ظاہر نہیں ہوتے، شیعہ قابلِ اعتماد علماء ہی سے رُجوع کرتے رہیں گے۔

آج بھی ایک سُنّی مالکی مثلاً کہتا ہے کہ امام مالک کے قول کے مطابق یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ حالانکہ امام مالک کو فوت ہُوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ یہی صورت امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے پیروکاروں کے ساتھ ہے کیونکہ یہ سب مذاہب اور ائمہ ایک ہی زمانے میں تھے اور ان کا ایک دُوسرے سے اُستاد شاگرد کا تعلّق تھا۔

اہلِ سُنّت اپنے ائمہ کے معصوم ہونے کے بھی قائل نہیں۔ نہ خود ان ائمہ نے کبھی عصمت کا دعویٰ کیا۔ اہلِ سُنّت کہتے ہیں کہ یہ ائمہ جو اجتہاد کرتے ہیں اس میں خَطا اور صَواب دونوں کا احتمال ہے۔ صَواب کی صورت میں انھیں دو اجر ملتے ہیں اور خطا کی صُورت میں ایک اَجر۔ بہرکیف اَجر ہر اجتہاد پر ملتا ہے۔

شیعوں کے نزدیک تقلید کے دو دَور ہیں:

✡ پہلا دور ائمۂ اثنا عشر کا دور ہے۔ یہ مرحلہ تقریباً ساڑھے تین سو سال پر محیط ہے۔ اس دور میں ہر شیعہ امامِ معصوم کی تقلید کرتا تھا اور امام کوئی بات اپنی رائے یا اپنے اجتہاد سے بیان نہیں کرتے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے تھے اسی علم اور ان روایات کی بنیاد پر کہتے تھے جو انھیں اَباً عَنْ جدٍّ رسول اللہؐ سے پہنچی تھیں۔ مثلاً وہ کسی سوال کے جواب میں اس طرح کہتے تھے:

"روایت بیان کی میرے والد نے، انھوں نے یہ روایت سُنی اپنے ناناؐ سے، اُنھوں نے جبریلؑ سے، انھوں نے اللہ عزّ وجلّ سے۔"[1]

---

[1] ہشام بن سالم اور حمّاد بن عیسیٰ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم نے امام جعفر صادقؑ کو

☼ دوسرا دَور زمانۂ غیبتِ امام کا دور ہے جو ابھی تک چل رہا ہے - اب شیعہ یہ کہتا ہے کہ یہ چیز آیت اللہ خوئی کی رائے کے مطابق یا آیت اللہ خمینی کی رائے کے مطابق حلال یا حرام ہے - یہ دونوں[1] مجتہد زندہ ہیں - ان کی رائے سے مُراد ہے قرآن اور ائمہؑ اہل بیت کی روایات کے مطابق سنت سے احکام کے اِستنباط میں ان کا اجتہاد

ائمہ اہلِ بیت کی روایات کے بعد دوسرے درجے میں صحابۂ عدول یعنی معتبر صحابہ کی روایات ہیں - ائمہؑ اہلِ بیت کو ترجیح اس لیے ہے کہ وہ شریعت کے بارے میں اپنی رائے سے قطعی احتراز کرتے ہیں اور اس کے قائل ہیں کہ :

یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ :

"میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے اور میرے والد کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے اور میرے دادا کی حدیث حُسین کی حدیث ہے اور حسین کی حدیث حَسَن کی حدیث ہے اور حَسَن کی حدیث امیرالمومنین علیہم السلام کی حدیث ہے اور امیرالمومنینؑ کی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے اور رسول اللہ ؐ کی حدیث ارشادِ الٰہی ہے ۔"

(اُصولِ کافی جلد ۱ صفحہ ۳۵)

عنبسہ روایت کرتے ہیں کہ

"ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ نے جواب دیا - اِس پر اس شخص نے کہا کہ اگر ایسا اور ایسا ہوتا تو اس میں دوسرا قول نہ ہوتا - آپ نے فرمایا :

"جب کبھی ہم کسی مسئلے کا جواب دیں تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اور ہم کوئی جواب اپنی رائے سے نہیں دیتے ۔"

(بصائر الدرجات صفحہ ۳۰۰-۳۰۱)

(ناشر)

[1] جن دنوں مصنّف نے یہ کتاب لکھی تھی، آیتُ اللہ خُمینی حیات تھے -

مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا وَ لِلّٰهِ فِيهِ حُكْمٌ

یعنی کوئی ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں اللہ کا حکم نہ ہو۔

اگر کسی مسئلہ کے بارے میں ہمیں یہ حکم دستیاب نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بلکہ یہ ہمارا قصور اور ناواقفیت ہے جس کی وجہ سے ہمیں اس حکم کا علم نہیں ہو سکا۔ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس کی دلیل نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں۔ اللہ سبحانہ کا قول ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ.

اِس کتاب میں ہم نے کوئی چیز نظر انداز نہیں کی۔

(سورۂ انعام۔ آیت ۳۸)

وہ عقائد جن پر اہلِ سُنّت شیعوں کو الزام دیتے ہیں

شیعوں کے کچھ عقائد ایسے ہیں جن پر اہلِ سُنّت محض اس تعصب کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں جو اُمویوں اور عبّاسیوں نے اس لیے پھیلایا تھا کیونکہ وہ امام علیؑ سے بُغض اور کینہ رکھتے تھے یہاں تک کہ امویوں نے علی الاعلان ۸۰ برس تک منبروں سے اِفتخارِ ہر نبی و ہر ولی حضرت علیؑ پر لعنت کی[1]

اس لیے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ لوگ ہر اس شخص کو گالیاں دیتے تھے اور اس پر ہر طرح کے بہتان باندھتے تھے جس کا ذرا بھی علیؑ کی جماعت سے تعلّق ہو۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کسی کو یہ کہا جاتا تھا کہ تُو یہودی ہے تو وہ اس کا اتنا بُرا نہیں مانتا تھا جتنا اگر اس کو یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ تُو شیعہ ہے۔ ان کے حامیوں اور پیروکاروں کا بھی ہر زمانے میں اور ہر مُلک میں یہی طریقہ رہا۔ یہاں تک کہ اہلِ سُنت کے لیے لفظ شیعہ ایک گالی بن گیا، کیونکہ شیعوں کے عقائد مختلف تھے اور سُنیوں کی جماعت سے باہر تھے، اِس لیے سُنّی ان پر جو چاہتے الزام لگا دیتے تھے، جس طرح چاہتے نام دھرتے تھے اور ہر بات میں ان کے طریقے کے

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخِ عاشوراء۔ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی۔ کراچی پاکستان۔

خلاف کرتے تھے[1]

آپ کو شاید علم ہو کہ علمائے اہلسنّت میں سے ایک مشہور عالم[2] کا کہنا تھا کہ "اگرچہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا سُنّتِ رسولؐ ہے، لیکن چونکہ یہ شیعوں کا شعار بن گیا ہے اس لیے اس کا ترک واجب ہے۔"

اور سُنیئے! حُجّۃُ الاسلام ابو حامد غزّالی کہتے ہیں کہ "قبر کی سطح کو ہموار کرنا اسلام میں مشروع ہے مگر رافضیوں نے اسے اپنا شِعار بنالیا ہے، اس لیے ہم نے اسے چھوڑ کر قبروں کو اُونٹ کے کوہان کی شکل دے دی۔"

---

[1] آج بھی بعض انتہاپسند حلقے یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ "شیعہ کافر ہیں، سبائی ہیں اور ان کی جان اور ان کا مال محترم نہیں ہے، ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔" اس طرح انھوں نے نفرت اور افتراق کا پنڈورا بکس کھول دیا ہے۔ لیکن ہمارے عُلمار ہمیشہ مِلّت کی وحدت و یگانگت کے داعی رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کوئی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ کہہ دے وہ مسلمان ہے اور اس کی جان اور اَملاک محترم ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جمالُ الدین افغانی سے لے کر آیتُ اللہ خمینی تک ہمارے عُلمار نے اتّحادِ اسلامی کیلئے بھرپور کوششیں کی ہیں۔ ہمارے ان ہی عُلمار میں سے ایک آیتُ اللہ کاشِفُ الغِطاء ہیں جنھوں نے قابلِ قدر سیاسی وسماجی خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۳۵۰ھ میں جب آیتُ اللہ کاشِفُ الغِطاء موتمر عالمِ اسلامی میں شرکت کے لیے القُدس الشریف پہنچے تو موتمر کے بیشتر مندوبین نے آپ ہی کی اقتدا میں مسجد اقصٰی میں نماز پڑھی تھی۔ (ناشر)

[2] یہ الھدایہ کے مؤلف شیخ الاسلام بُرہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی (۵۹۳ھ) ہیں۔

زمخشری نے اپنی کتاب ربیع الابرار میں لکھا ہے کہ

"مُعاویہ بن ابی سُفیان نے سب سے پہلے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شروع کی جو خلافِ سُنّت ہے۔"

لہٰذا ہم معاویہ کے طرفدار سے اتنا ہی عرض کریں گے کہ ؎

اِتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

اور ابن تیمیہ[1] کہتے ہیں :

بعض فقہاء کا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مستحب شیعوں کا شعار بن جائے تو اس مستحب کو ترک کر دینا بہتر ہے گو ترک کرنا واجب نہیں۔ کیونکہ اس مستحب پر عمل میں بہ ظاہر شیعوں سے مشابہت ہے۔ سُنّیوں اور رافضیوں میں فرق کی مصلحت مستحب پر عمل کی مصلحت سے زیادہ قوی ہے۔[2]

حافظ عراقی سے جب یہ پوچھا گیا کہ تحت الحنک کس طرف کیا جائے ؟ تو انھوں نے کہا کہ

مجھے کوئی ایسی دلیل نہیں ملی جس سے داہنی طرف کی تعیین ہوتی ہو، سوائے اس کے طبرانی کے یہاں ایک ضعیف حدیث ضرور ہے، لیکن اگر یہ ثابت بھی ہو تو شاید آپ داہنی طرف لٹکا کر بائیں طرف لپیٹ لیتے ہوں جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں مگر چونکہ یہ شیعوں کا شعار بن گیا ہے، اس لیے تشبہ سے بچنے کے لیے اس سے احتراز ہی مناسب ہے۔[3]

سُبحان اللہ! یہ اندھا تعصّب ملاحظہ ہو۔ یہ عُلماء کیسے سُنّتِ رسولؐ کی مخالفت کی اجازت صرف اس بنا پر دیتے ہیں کہ اس پر شیعوں نے پابندی سے عمل کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ ان کا شعار بن گئی ہے۔ پھر دیدہ دلیری دیکھیے

---

[1] کہا جاتا ہے کہ برطانوی سامراج نے جب سرزمینِ حجاز میں "وہابی تحریک" کا آغاز کیا تو انھوں نے ۔ مستشرقین کی تجویز کے بموجب جو اسلام کا مُطالعہ کرتے ہیں ۔ اس تحریک کے ذریعہ، ابو العبّاس تقی الدین احمد بن عبدالحلیم المعروف بہ ابن تیمیہ حرّانی کے افکار و نظریات کو فروغ دیا کیونکہ وہ اپنے افکار و نظریات کی بنا پر مطعون تھا لیکن بیسویں صدی کے لوگوں نے اسے "مجدّد" اور "مُصلح" کا خطاب دے دیا۔ (ناشر)

[2] منہاج السنّۃ النبویہ، ابن تیمیہ۔

[3] شرحُ المواہب، زرقانی۔

کر وہ اس بات کا علانیہ اعتراف کرتے ہوئے بھی ذرا نہیں شرماتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ شکرِ خدا کہ ہر صاحبِ بصیرت اور جویائے حقیقت پر حق واضح ہو گیا۔ سُنّت کا نام لینے والو! دیکھ لو سُنّت کا دامن کس نے تھاما ہوا ہے۔

الحمدُللہ کہ ظاہر ہو گیا کہ یہ شیعہ ہی ہیں جو سُنّتِ رسولؐ کا اتباع کرتے ہیں جس کی گواہی تم خود دے رہے ہو۔ اور تم خود ہی اس کے بھی اقراری مجرم ہو کہ تم نے سنتِ رسولؐ کو عمداً اور دیدہ و دانستہ محض اس لیے چھوڑ دیا تاکہ تم اہل بیت اور ان کے شیعانِ با اخلاص کی روش کی مخالفت کر سکو۔ تم نے معاویہ بن ابی سفیان کی سنت اختیار کرلی جس کے شاہدِ عادل امام زمخشری ہیں جو کہتے ہیں کہ سُنّتِ رسولؐ کے برخلاف سب پہلے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی معاویہ بن ابی سُفیان نے پہنی تھی۔

تم نے باجماعت تراویح کی بدعت میں سُنّتِ عُمر کی پیروی کی۔ حالانکہ جیسا کہ صحیح بُخاری میں ہے مسلمانوں کو نافلہ نمازیں گھر میں فُرادیٰ پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا[1]۔ حضرت عُمر نے خود اعتراف کیا تھا کہ یہ نماز بدعت ہے :

بُخاری میں عبدالرحمن بن عبدالقاری سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ماہِ رمضان میں ایک دن رات کے وقت، میں عُمر بن خطّاب رَضِیَ اللہُ عَنہ کے ساتھ مسجد کی طرف گیا تو وہاں دیکھا کہ لوگ متفرق طور پر نماز پڑھ رہے ہیں۔ کہیں کوئی اکیلا ہی نماز پڑھ رہا تھا اور کہیں چند لوگ مل کر۔ عُمر نے کہا کہ میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ میں ایسا انتظام کردوں کہ یہ سب ایک قاری کے پیچھے نماز پڑھیں۔ چنانچہ عُمر نے ایسا ہی کیا اور اُبَیّ بن کَعب کو امام مقرر کر دیا۔ ایک رات پھر میں عُمر کے ساتھ گیا۔ اُس وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر عُمر نے کہا : کتنی اچھّی بدعت ہے یہ[2]۔

عُمر، جب آپ نے یہ بدعت شروع کی تھی تو آپ خود کیوں اس میں شریک نہیں ہوئے؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب آپ ان کے امیر تھے تو آپ بھی ان کے

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۷ صفحہ ۹۹ باب مایجوز من الغضب والشدۃ لامر اللہ عزّ وجلّ۔

[2] صحیح بُخاری جلد ۲ صفحہ ۲۵۲ کتاب صلاۃ التراویح۔

ساتھ نماز پڑھتے۔ یہ کیا کہ آپ ان کا تماشا دیکھنے نکل کھڑے ہوتے؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ اچھی بدعت ہے۔ یہ اچھی کیسے ہوسکتی ہے جب رسول اللہؐ نے اس سے اس وقت منع کر دیا تھا جب لوگوں نے آپ کے دروازے پر جمع ہوکر شور مچایا تھا کہ آپ آکر نافلۂ رمضان پڑھا دیں۔ اس پر رسول اللہؐ غصّے میں بھرے ہوئے نکلے اور آپ نے فرمایا: "مجھے اندیشہ تھا کہ یہ نماز تم پر فرض ہو جائے گی۔ جاؤ، اپنے گھروں میں جاکر نماز پڑھو۔ فرض نمازوں کے علاوہ ہر نماز آدمی کے لیے گھر میں پڑھنا ہی بہتر ہے۔"

تم نے سفر کی حالت میں پوری نماز پڑھنے کی بدعت میں عُثمان بن عفّان کی سُنّت کی پیروی کی ہے۔ تمھارا یہ عمل سُنّتِ رسولؐ کے خلاف ہے۔ کیونکہ رسول اللہؐ تو سفر میں قصر نماز پڑھا کرتے تھے۔[1]

اگر ہم وہ سب مثالیں گنانے لگوں جہاں تم نے سُنّتِ رسولؐ کے خلاف طریقہ اختیار کیا ہے تو اس کے لیے ایک پوری کتاب کی ضرورت ہوگی۔ لیکن تمھارے خلاف تو تمھاری اپنی شہادت ہی کافی ہے جو تمھارے اپنے اقرار پر مبنی ہے۔ تم نے یہ بھی اقرار کیا ہے کہ یہ شیعہ رافضی ہیں جو سُنّتِ رسولؐ کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں!

کیا اس کے بعد بھی ان جاہلوں کی تردید کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہے جو یہ کہتے ہیں کہ شیعہ علی بن ابی طالبؑ کا اتباع کرتے ہیں اور اہلِ سُنّت رسول اکرمؐ کا؟

کیا یہ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علیؑ، رسول اللہؐ کے مخالف تھے اور انھوں نے کوئی نیا دین ایجاد کیا تھا؟ کیسی سخت بات ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

علیؑ تو سرتاپا سُنّتِ رسول تھے۔ وہ سُنّتِ رسولؐ کے شارح تھے اور سُنّت پر سختی سے قائم تھے۔ ان کے متعلق رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ

عَلِیٌّ مِنِّی بِمَنْزِلَتِی مِنْ رَّبِّی۔[2]

---

[1] صحیح بخاری جلد۲ صفحہ ۳۵ وَکَذٰلِکَ تَاَوَّلَتْ عَائِشَۃُ فَصَلَّتْ اَرْبَعًا صفحہ ۳۶۔

[2] ابن حجر عسقلانی، لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۱۶۱ ۔ محب الدین طبری، ذخائر العقبیٰ صفحہ ۶۴۔ نور اللہ حسینی مرعشی، احقاق الحق جلد ۷ صفحہ ۲۱۷۔

"علیؑ کا مجھ سے وہی تعلق ہے جو میرا میرے پروردگار سے ہے۔"

یعنی جس طرح کہ تنہا محمدؐ ہی وہ شخص تھے جو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے تھے ایسے ہی تنہا علیؑ وہ شخص تھے جو رسول اللہؐ کا پیغام پہنچاتے تھے۔

علیؑ کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے اپنے سے سابق خلفاء کی خلافت تسلیم نہیں کی اور شیعوں کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں علیؑ کی پیروی کی اور ابوبکر، عمرؓ اور عثمانؓ کے جھنڈے تلے جمع ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی لیے اہلِ سُنّت انھیں "رافضی" یعنی مُنکر کہنے لگے۔

اگر اہلِ سُنّت شیعہ عقائد اور شیعہ اقوال کا انکار کرتے ہیں، تو اس کے دو سبب ہیں:

پہلا سبب تو وہ دشمنی ہے جس کی آگ اُموی حکمرانوں نے جھوٹے پروپیگنڈے اور منگھڑت روایات کے ذریعے سے بھڑکائی تھی۔

دُوسرا سبب یہ ہے کہ اہلِ سُنّت جو خلفاء کی تائید کرتے ہیں اور ان کی غلطیوں اور ان کے اجتہادات کو صحیح ٹھہراتے ہیں، خصُوصاً اُموی حکمرانوں کی غلطیوں کو جن میں مُعاویہ کا نام سرِفہرست ہے شیعہ عقائد ان کے اِس طرزِ عمل کے منافی ہیں۔

جو شخص واقعات کا تتبع کرے گا، اس پر واضح ہو جائے گا کہ شیعہ، سُنّی اختلافات کی داغ بیل تو سقیفہ کے دن ہی پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد اختلافات کی خلیج برابر وسیع ہوتی چلی گئی۔ بعد میں جو بھی اختلاف پیدا ہوا اس کی اصل سقیفہ کا واقعہ ہی تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ شیعوں کے وہ سب عقائد جن پر اہلِ سُنّت اعتراض کرتے ہیں، ان کا خلافت کے معاملے سے گہرا تعلق ہے اور ان سب کی جڑ خلافت ہے۔ مثلاً: ائمہ کی تعداد، امام کا منصوص ہونا، ائمہ کی عِصمت، ان کا عِلم، بَدَاء، تقیّہ، مہدیٔ منتظر وغیرہ

اگر ہم طرفین کے اقوال پر غیر جذباتی ہو کر غور کریں تو ہمیں طرفین کے عقائد میں بہت زیادہ بُعد نظر نہیں آئے گا اور نہ ایک دوسرے پر طَعن وتشنیع کا کوئی ملے گا کیونکہ گو جب آپ اہلِ سُنّت کی وہ کتابیں پڑھتے ہیں جن میں شیعوں کو گالیاں دی گئی ہیں تو آپ کو ذرا دیر کے لیے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شیعہ اسلامی اُصولوں اور اسلامی اَحکام

کے مخالف ہیں اور انھوں نے کوئی نیا دین گھڑا ہوا ہے۔ حالانکہ جو بھی مُنصف مزاج شخص شیعہ عقائد پر غور کرے گا وہ ان کی اصل قرآن و سُنّت میں پائیگا حتیٰ کہ جو مخالفین ان عقائد پر اعتراض کرتے ہیں خود ان کی کتابوں سے بھی ان ہی عقائد کی تائید ہوتی ہے۔ پھر ان عقائد میں کوئی بات خلافِ عقل و نقل اور مُنافیٔ اخلاق نہیں ہے!

آیئے ان عقائد پر ایک نظر ڈالیں تاکہ میرے دعوے کی صحّت ظاہر ہو جائے اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ مُخالفین کے اعتراضات دھوکے کی ٹٹّی کے سوا کچھ نہیں!

ائمّہؑ کی عصمت

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ نبی کی طرح امام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ تمام ظاہری اور باطنی بُرائیوں سے بچپن سے لے کر موت تک محفوظ رہے۔ اس سے عمداً یا سہواً کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور بھُول چوک اور خطا سے محفوظ ہو۔ کیونکہ ائمّہ شریعت کے نگراں اور محافظ ہیں اور اس لحاظ سے ان کی حیثیت وہی ہے جو نبی کی ہے۔ جس دلیل کی رُو سے ہمارے لیے انبیاء کے معصوم ہونے کا اعتقاد ضروری ہے، اُسی دلیل کی رو سے ہمارے لیے ائمّہ کے معصوم ہونے کا عقیدہ بھی ضروری ہے۔ اس معاملے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں[1]

یہ عصمت کے بارے میں شیعوں کی رائے ہے۔ لیکن کیا اس میں کوئی ایسی بات ہے جو قرآن و سُنّت کے منافی ہو یا عقلاً مُحال ہو یا جس سے اسلام پر حرف آتا ہو اور اس کے شایانِ شان نہ ہو یا جس سے کسی نبی یا امام کی قدر و منزلت میں فرق آتا ہو؟ ہرگز نہیں!

بلکہ اس عقیدے سے تو کتاب و سُنّت کی تائید ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ عقلِ سلیم کے عین مطابق ہے اور اس سے نبی اور امام کی شان میں اضافہ ہوتا ہے۔

---

[1] شیخ محمد رضا مظفرؒ عقائد الامامیہ صفحہ ۶۷ - یہ کتاب جامعہ تعلیمات اسلامی نے مکتب تشیّع کے نام سے شائع کردی ہے۔

احمقانہ اور غلط بات تو یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ نبی غلطی کرتا ہے اور اس کی اصلاح دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

عصمت از روئے قرآن

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔

اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اے اہلِ بیت تم سے رِجس کو دُور رکھے اور تمھیں خوب پاک صاف کردے۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۳۳)

اگر رِجس سے دُور رکھنے کے معنی سب برائیوں اور گناہوں سے حفاظت ہے تو کیا اس کا مطلب عِصمت نہیں؟ ورنہ پھر اس کا مطلب اور کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ۔

جو لوگ متقی ہیں، جب انھیں کوئی شیطانی خیال ستاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں جس سے انھیں یکایک صحیح راستہ سُجھائی دینے لگتا ہے۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۲۰۱)

جب شیطان کسی مُتّقی شخص کو بہکانا اور گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اگر وہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ اسے شیطان کے دامِ فریب سے بچا لیتا ہے اور اسے راہِ حق دکھا دیتا ہے جس پر وہ چل پڑتا ہے۔ جب عام مومن کی یہ صورت ہے تو ان لوگوں کا کیا کہنا جو اللہ کے چنیدہ بندے ہیں جنھیں اللہ نے ہر آلودگی سے پاک رکھا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔

پھر ہم نے وارث بنا دیا کتاب کا ان کو جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چُن لیا۔ (سورۂ فاطر۔ آیت ۳۲)

جسے اللہ چُنے گا وہ بلاشک مَعصُوم عَنِ الْخَطَا ہوگا۔ خاص اسی آیت سے

امام رضاؑ نے ان علماء کے سامنے استدلال کیا تھا جنھیں عباسی خلیفہ مامون نے جمع کیا تھا۔ امام رضاؑ نے یہ ثابت کیا تھا کہ اس آیت میں چنیدہ بندوں سے مراد ائمۂ اہل بیت ہی ہیں جنھیں اللہ نے کتاب کا وارث بنایا ہے۔ جو علماء وہاں موجود تھے انھوں نے امام کی یہ بات تسلیم کرلی تھی[1]۔

یہ قرآنِ کریم سے بعض مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جن سے ائمہ کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔ جیسے مثلاً اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وغیرہ۔ لیکن ہم بہ نظرِ اختصار اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

عِصمت از رُوئے حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

> لوگو! میں تمھارے درمیان وہ چیزیں چھوڑ رہا ہوں کہ جب تک تم ان سے جڑے رہوگے، ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، اور وہ چیز ہے اللہ کی کتاب اور میری عترت یعنی میرے اہلِ بیت[2]

جیساکہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ حدیث ائمۂ اہلِ بیت کے معصوم ہونے کے بارے میں صریح شہادت ہے:

اوّلاً: اس لیے کہ اللہ کی کتاب معصوم ہے، اس میں باطل کا کسی طرف سے کوئی دخل نہیں کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے اور جو اس میں شک کرے، وہ کافر ہے۔

ثانیاً: اس لیے کہ جو کتاب اور عترت کو تھامے رہے، وہ گمراہی سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ کتاب و عترت میں غلطی کی گنجائش نہیں۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہؐ نے فرمایا:

> میرے اہلِ بیت کی مثال کشتیٔ نوحؑ کی سی ہے جو اس پر

---

[1] ابن عبدربہ اندلسی العقد الفرید جلد ۳ صفحہ ۴۲

[2] محمد بن عیسٰی ترمذی جامع الترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۸

سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جو بچھڑ گیا ڈوب گیا۔"[1]

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، اس حدیث میں تصریح ہے کہ ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام معصوم ہیں، اس وجہ سے جو ان کی کشتی میں سوار ہو جائے گا وہ نجات پا جائے گا اور جو پیچھے رہ جائے گا، گمراہی کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔

رسول اللہؐ نے فرمایا:

جو میری طرح کی زندگی چاہتا ہے اور میری طرح مرنا چاہتا ہے اور اس جَنَّتُ الْخُلْد میں جانا چاہتا ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، تو وہ علیؑ سے اور ان کے بعد ان کی اولاد سے دوستی رکھے۔ اس لیے کہ وہ تمھیں ہدایت کے دروازے سے باہر نکلنے نہیں دیں گے اور گمراہی کے دروازے میں گھسنے نہیں دیں گے۔[2]

اِس حدیث میں تصریح ہے کہ ائمۂ اہلِ بیت جو علیؑ اور اولادِ علیؑ ہیں وہ معصوم عَنِ الْخَطا ہیں کیونکہ جو لوگ ان کا اتباع کریں گے وہ انھیں گمراہی کے دروازے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ ظاہر ہے کہ جو خود غلطی کر سکتا ہے وہ دوسروں کو ہدایت کیسے کرے گا۔

رسول اللہؐ نے فرمایا:

اَنَا الْمُنْذِرُ وَعَلِیٌّ الْهَادِیْ وَبِكَ يَا عَلِيُّ يَهْتَدِی الْمُهْتَدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ.

میں ڈرانے والا ہوں اور علیؑ ہدایت دینے والے ہیں۔ اے علیؑ! ہدایت کے طالب میرے بعد تم سے ہدایت حاصل کریں گے۔[3]

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۴۳ - کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۹۵ - صواعق محرقہ صفحہ ۱۸۴

[2] کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۵۵ - مجمع الزوائد جلد ۹ صفحہ ۱۰۸ - تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۹۹ - مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۸ - حلیۃ الاولیاء جلد ۴ صفحہ ۳۴۹ - احقاق الحق جلد ۵ صفحہ ۱۰۸

[3] طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۸ - رازی، تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۲۷۱ - ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم جلد ۲ صفحہ ۵۰۲ شوکانی، تفسیر فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۷۰ - سیوطی، تفسیر درمنثور جلد ۴ صفحہ ۴۵ - حسکانی، شواہد التنزیل جلد ۱ صفحہ ۲۹۳ -

اہلِ نظر پر مخفی نہیں کہ اِس حدیث میں بھی عِصمتِ امام کی تصریح ہے۔ امام علیؑ نے خود بھی اپنے معصوم ہونے اور اپنی اولاد میں سے دُوسرے ائمہ کے معصوم ہونے کی تصریح کی ہے۔ آپ نے کہا:

"تم کہاں جا رہے ہو اور تمھیں کدھر موڑا جا رہا ہے؟ حالانکہ ہدایت کے پرچم اڑ رہے ہیں، نشانیاں صاف اور واضح ہیں، منارۂ نُور ایستادہ ہے تم کہاں بھٹک رہے ہو اور کیوں بہک رہے ہو؟ نبیؐ کی عِترت تمھارے درمیان موجود ہے، جو حق کی باگ ڈور ہیں، دین کے نشان ہیں اور سچّائی کی زبان ہیں۔ جو قرآن کی بہتر سے بہتر منزل سمجھ سکو، وہیں ان کو بھی جگہ دو۔ ان کی طرف اس طرح دوڑو جیسے پیاسے پانی کی طرف دوڑتے ہیں۔

اے لوگو! خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو سُنو کہ (انھوں نے فرمایا):

ہم میں سے جو مرتا ہے وہ مَر تو جاتا ہے مگر مُردہ[1] نہیں ہوتا۔ ہم میں سے جو بظاہر مر کر بوسیدہ ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت کبھی بوسیدہ نہیں ہوتا۔ تم وہ بات نہ کہو جو تمھیں معلوم نہیں۔ کیونکہ اکثر وہی بات صحیح ہوتی ہے جس کا تم انکار کرتے ہو۔ جس کے خلاف تمھارے پاس کوئی دلیل نہ ہو اسے معذور سمجھو۔ اور میں ایسا ہی شخص ہوں۔ کیا میں نے تمھارے درمیان ثقلِ اکبر (قرآن) پر عمل نہیں کیا؟ اب میں تمھارے درمیان ثقلِ اصغر چھوڑ رہا ہوں میں نے تمھارے درمیان ایمان کا جھنڈا گاڑ دیا ہے"[2]

کیا ان تمام آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی اور اقوالِ علیؑ کے بعد بھی عقل

---

[1] فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے — اقبال

[2] نہج البلاغہ جلد اول صفحہ ۱۵۵

ان ائمہ کی عصمت کا انکار کر سکتی ہے جنھیں اللہ نے چُنیدہ و برگزیدہ قرار دیا ہے۔
جواب یہ ہے کہ نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ عقل تو یہ کہتی ہے کہ ان کی عصمت ایک حتمی اور لابُدی اَمر ہے۔ اس لیے کہ انسانوں کی قیادت و ہدایت کا منصب جن کے سپرد کیا گیا ہو ممکن نہیں کہ وہ معمولی انسان ہوں، جو بھول چُوک اور غلطی کا شکار ہوتے ہوں اور جن کی پیٹھ پر گناہوں کی گٹھڑی لدی ہوئی ہو جن پر لوگ نکتہ چینی کرتے ہوں، عیب لگاتے ہوں اور کیڑے نکالتے ہوں، بلکہ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عالِم، سب سے زیادہ نیک، سب سے زیادہ بہادر اور سب سے بڑھ کر متقی اور پرہیزگار ہوں کہ ع

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

یہی وہ صفات ہیں جن سے قائد کی شان بڑھتی ہے، لوگوں کی نگاہ میں اس کی عزّت و عظمت میں اضافہ ہوتا ہے، سب اس کا احترام کرتے ہیں اور پھر دل و جان سے، کسی ہچکچاہٹ اور خوشامد کے بغیر، اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں۔
جب یہ بات ہے تو پھر اس کے ماننے والوں کے خلاف یہ طعن و تشنیع کیوں اور یہ شور و غوغا کیسا؟!
اِس سلسلے میں اہلسُنّت نے شیعوں پر جو تنقید کی ہے اگر وہ آپ سُنیں اور پڑھیں تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا شیعہ جس کو چاہتے ہیں تمغۂ عِصمت پہنا دیتے ہیں، یا جو عِصمت کا قائل ہے وہ کوئی کلمۂ کُفر مُنہ سے نکال رہا ہے یا گویا وہ معصوم کے متعلق کہہ رہا ہے کہ یہ ایسا دیوتا ہے کہ نہ اس کو اُونگھ آتی ہے نہ نیند۔ درحقیقت ایسی کوئی بھی بات نہیں۔
عِصمتِ ائمہ نہ کوئی عجیب و غریب بات ہے نہ مُحال و ناممکن۔ شیعوں کے نزدیک عصمت کے معنیٰ فقط یہ ہیں کہ معصوم اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت و حفاظت میں ہوتا ہے کہ شیطان اس کو ورغلا نہیں سکتا اور نفسِ اَمّارہ اس پر غلبہ پا نہیں سکتا کہ اسے معصیت کی طرف کھینچ لے جائے۔ یہ وہ بات ہے جس سے اللہ کے دوسرے متقی بندے بھی محروم نہیں۔ ابھی یہ آیت گزر چکی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۔

مگر عام اہلِ تقویٰ کی یہ عصمت وقتی اور عارضی ہوتی ہے اور اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہوتا ہے۔ اگر بندہ تقویٰ کی کیفیت سے دُور ہٹ جائے تو اللہ تعالیٰ پھر اسے گناہوں سے محفوظ نہیں رکھتا مگر امام جسے اللہ منتخب کرتا ہے کسی حالت میں بھی تقویٰ اور خوفِ خدا کی راہ سے بال برابر بھی نہیں سرکتا۔ ہمیشہ گناہوں اور خطاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت یُوسفؑ کے قصے میں ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۚ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ.

اس عورت نے ان کا قصد کیا اور وہ بھی اگر اپنے پروردگار کی دلیل نہ دیکھ چکے ہوتے تو قصد کر بیٹھتے۔ پس ہم نے انہیں بچا لیا تاکہ ہم ان سے بُرائی اور بے حیائی کو دُور رکھیں بیشک وہ ہمارے خاص بندوں میں سے تھے۔ (سورہ یوسف - آیت ۲۴)

واضح رہے کہ حضرت یوسفؑ نے ہرگز زنا کا قصد نہیں کیا تھا، کیونکہ مَعاذَاللہ اس قبیح فعل کا قصد انبیاء کی شان نہیں ہے۔ البتہ آپ نے اس عورت کو روکنے، دھکا دینے اور ضرورت ہو تو اس کو مارنے کا قصد ضرور کیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسی غلطی کے ارتکاب سے آپ کو بچا لیا۔ کیونکہ اگر یہ غلطی ہو جاتی تو آپ پر زنا کی کوشش کا الزام لگ جاتا اور ان لوگوں سے آپ کو نقصان پہنچتا۔

قرآن شریف میں آیا ہے:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ.

میں اپنے نفس کی برائت کا اظہار نہیں کرتا۔ کیونکہ نفس تو بُرائی ہی سکھاتا رہتا ہے مگر یہ کہ جس پر پروردگار رحم کرے۔

(سورۂ یوسف - آیت ۵۳)

جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اپنے دوستوں کو چُن لیتا ہے تو پھر

ان کو سکھاتا ہے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ اور ان کو بُرائی اور گندی باتوں سے بچاتا ہے اور جب ان پر رحم کرتا ہے، تو انھیں کسی بُرائی میں ملوث نہیں ہونے دیتا۔ یہ سب اس لیے کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے ہر معنیٰ میں خاص بندے ہوتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی یہ تسلیم کرنا ہی نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص الخاص بندوں کو بُرائیوں سے بچاتا اور گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے تو وہ آزاد ہے، اس پر کوئی زبردستی نہیں۔ ہم اس کی رائے کا بھی احترام کرتے ہیں۔

لیکن ان کا بھی فرض ہے کہ وہ دوسروں کی رائے کا احترام کرے جو عصمتِ ائمہؑ کے قائل ہیں اور جن کے پاس اپنے دلائل ہیں۔ خواہ مخواہ انھیں بدنام کرنے کی کوشش نہ کرے۔ جیساکہ ایک شخص نے کی تھی جو پیرس میں لکچر دینے آیا تھا، یا جیساکہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اکثر عُلمائے اہل سُنّت کرتے ہیں جب وہ اپنی تحریروں میں اس موضوع کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

ائمہؑ کی تعداد

شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ائمہ معصومین کی تعداد بارہ ہے۔ یہ تعداد نہ کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ۔ رسول اللہؐ نے ان ائمہؑ کی تعداد کے ساتھ ان کے نام بھی گنوائے ہیں[1] ان کے نام یہ ہیں:

۱ - امام علی بن ابی طالبؑ
۲ - امام حَسَن بن علیؑ
۳ - امام حُسین بن علیؑ
۴ - امام علی بن الحُسینؑ (زینُ العابدین)
۵ - امام محمّد بن علیؑ (باقِر)
۶ - امام جعفر بن محمّدؑ (صادِق)
۷ - امام موسیٰ بن جعفرؑ (کاظِم)

---

[1] سلیمان قندوزی حنفی ینابیع المودّۃ جزو ۳ صفحہ ۹۹۔

۸ - امام علی بن موسیٰ ؑ (رضا)
۹ - امام محمد بن علی ؑ (تقی)
۱۰ - امام علی بن محمدؑ (نقی)
۱۱ - امام حسَن بن علی ؑ (عسکری)
۱۲ - امام محمدؑ بن حسَن ؑ (مہدیؑ منتظر)

یہ ہیں ائمہؑ اِثنا عشر! جن کی عِصمت کے شیعہ قائل ہیں۔

بعض اِفترا پرداز یہ کہہ کر کچھ مُسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ شیعہ اہلِ بیت کی عصمت کے قائل ہیں اور دیکھو شاہ حُسین بادشاہِ اُردن بھی اہلِ بیت میں سے ہیں اور اسی طرح شاہ حسَن ثانی بادشاہِ مراکش بھی اہلِ بیت میں سے ہیں۔ اب تو کچھ لوگ یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ شیعہ امام خُمینی کو بھی معصوم مانتے ہیں۔

یہ ہے مسخرا پن، اِفترا، اور سفید جھوٹ۔ شیعہ عُلماء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تو درکنار، ایسی بات تو شیعہ عوام بھی نہیں کہتے۔ اِن مسخروں کی جب اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو وہ سوچتے ہیں کہ شاید اسی طرح وہ لوگوں کو، خصوصاً نوجوانوں کو جو اس قسم کے پروپیگنڈے پر آسانی سے یقین کرلیتے ہیں، شیعوں سے متنفّر کرسکیں۔ شیعہ پہلے بھی اور آج بھی فقط ان ہی ائمہ کے معصوم ہونے کے قائل ہیں جن کے نام رسول اللہؐ نے اس وقت بتلادیے تھے جب وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

جیساکہ ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں، خود بعض عُلمائے اہلِ سُنّت نے ایسی روایات نقل کی ہیں جن میں ان ائمہؑ کے نام آئے ہیں۔ بُخاری و مُسلم نے اپنی صحیحین میں ائمہ کی تعداد سے متعلق حدیث نقل کی ہے جس کے مطابق ائمہؑ بارہ ہیں اور وہ سب قریش میں سے ہیں[۱]

ان احادیث کا مطلب اسی وقت ٹھیک بیٹھتا ہے جب ہم بارہ اماموں سے مراد وہ ائمہ اہلِ بیَت لیں جن کے شیعہ قائل ہیں۔ ورنہ تو اہلِ سُنّت بتلائیں کہ

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۲۷ - صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۳ -

اس چیستان کا حل کیا ہے؟
اہلِ سُنّت نے اپنی صِحاح میں ائمۂ اِثنا عشر والی احادیث تو نقل کی ہیں لیکن یہ آج تک معما ہے کہ ان سے مراد کون سے بارہ امام ہیں۔ مگر پھر بھی سُنّیوں کو یہ توفیق کہاں کہ وہ اس بات کو مان لیں جس کے شیعہ قائل ہیں۔

ائمہؑ کا عِلم

اہلِ سُنّت کا ایک اور اعتراض یہ ہے کہ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ ائمۂ اہلِ بیت سلامُ اللہ علیہم کو اللہ تعالیٰ نے ایسا خصُوصی علم عطا کیا ہے جس میں کوئی ان کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ اور یہ کہ امام اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم ہوتا ہے اس لیے یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص امام سے کوئی سوال کرے اور امام سے اس کا جواب بن نہ پڑے۔
تو کیا شیعوں کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے؟
ہم حسبِ معمول اپنی اس بحث کا آغاز بھی قرآن کریم سے کرتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔

پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے ان کو کتاب کا وارث بنایا جن کو ہم نے چُن لیا۔

اِس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سُبحانہٗ نے اپنے کچھ بندوں کو چُن لیا ہے اور انھیں کتاب کا وارث بنا دیا ہے۔ کیا ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ چُنیدہ بندے کون ہیں؟
ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ امام علی رضاؑ نے اِس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ آیت ائمۂ اہلِ بیت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ اس موقع کی بات ہے جب مامون نے چالیس مشہور قاضیوں کو جمع کیا تھا اور ان میں سے ہر قاضی نے ۴۰ سوال امامِ ثامن کے لیے تیار کیے تھے۔ امام نے ان سب سوالوں

کے مُشکِت جواب دیے اور بالآخر سب قاضیوں کو ان کی اَعْلَمیّت کا اعتراف کرنا پڑا[1]

جس وقت ان قاضیوں اور امام کے درمیان یہ مناظرہ ہوا اور قاضیوں نے ان کی اَعْلَمیت کا اقرار کیا، اس وقت امام کی عمر چودہ سال سے بھی کم تھی - پھر اگر شیعہ ان ائمہ کی اَعْلَمیت کے قائل ہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے، جبکہ خود اہلِ سُنّت علماء بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں -

اگر ہم قرآن کی تفسیر قرآن سے کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ متعدد آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ سُبْحَانَہٗ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے ائمہ اہلِ بیت کو وہ علمِ لَدُنّی عطا کیا تھا جو ان ہی سے مختص تھا اور یہ ائمہ واقعی ہادیوں کے پیشوا اور اندھیروں کے چراغ تھے -

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَّمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُو الْاَلْبَابِ -

وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت عطا ہوگئی اسے بڑی نعمت عطا ہوگئی - اور نصیحت تو صاحبانِ عقل وفہم ہی قبول کرتے ہیں - (سورۂ بقرہ - آیت ۲۶۹)

ایک اور جگہ ارشاد ہے :

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ .

پس میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کی جگہ کی اور اگر تم سمجھو تو یہ ایک بڑی قسم ہے - واقعی یہ قابلِ احترام قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں جسے کوئی مَس نہیں کر سکتا بجُز ان کے جو پاک

---

[1] ابن عبدِ ربّہ اندلسی عقد الفرید جلد ۳ صفحہ ۴۲ -

کیے گئے ہیں۔" (سورۂ واقعہ - آیت ۷۵ تا ۷۹)

اس آیت میں اللہ نے ایک بڑی قسم کھا کر کہا ہے کہ قرآنِ کریم میں ایسے باطنی اَسرار ہیں جن کی حقیقت صرف ان کو معلوم ہے جو پاک کیے گئے ہیں۔ یہ پاکیزہ حضرات اہلِ بیت ہیں جن سے اللہ نے ہر طرح کی آلودگی کو دُور رکھا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے متعلق کچھ باطنی علوم ہیں، جن کو اللہ سُبحانہٗ نے صرف ائمہ اہل بیت سے مختص کیا ہے۔ کسی دُوسرے کو اگر ان علوم سے آگہی حاصل کرنا ہو تو فقط ان ائمہ کے واسطے سے ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ.

وہ اللہ ہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری۔ اس کی بعض آیتیں مُحکم ہیں جو اس کتاب کا مدار ہیں اور بعض مُتشابہ ہیں۔ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مُتشابہ ہے تاکہ فتنہ برپا کریں اور غلط مطلب نکالیں، جبکہ اس کا صحیح مطلب کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان لوگوں کے جو عِلم میں دستگاہِ کامل رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت تو عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

(سورۂ آلِ عمران - آیت ۷)

اس آیۂ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے، اللہ سُبحانہٗ نے قرآن میں ایسے اَسرار و رُموز رکھے ہیں جن کی تاویل یا وہ خُود جانتا ہے یا وہ لوگ جو عِلم میں دستگاہِ کامل رکھتے ہیں

جیسا کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے جو گزشتہ اوراق میں نقل کی جا چکی ہیں، علم میں دستگاہ کامل رکھنے والے یعنی رَاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ سے مراد اہلِ بیتِ رسولؐ ہیں۔

اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

"اِن سے آگے نہ بڑھو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی نہ رہو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے اور انھیں پڑھانے کی کوشش نہ کرو کہ یہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔"[1]

امام علیؑ نے خود بھی کہا تھا:

"کہاں ہیں وہ جو یہ جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں کہ رَاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ ہم نہیں وہ ہیں۔ وہ ہماری مخالفت اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اونچا درجہ دیا ہے اور ان کو ادنیٰ درجہ۔ ہمیں اللہ نے منصبِ امامت دیا اور ان کو محروم رکھا۔ ہمیں (زمرۂ خواص میں) داخل کیا اور ان کو باہر نکال دیا۔ ہم ہی ہیں جن سے ہدایت طلب کی جا سکتی ہے اور جن سے بے بصیرتی دور کرنے کے لیے روشنی مانگی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ ائمہؑ قریش میں سے ہوں گے جو اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی ہاشم کی کشت زار سے اُبھریں گے۔ نہ امامت کسی کو زیب دیتی ہے اور نہ کوئی اس کا اہل ہو سکتا ہے۔"[2]

اگر ائمۂ اہلبیت رَاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ نہیں، تو پھر کون ہے؟ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ اُمّت میں سے آج تک ان سے بڑھ کر عالِم ہونے کا دعویٰ کسی نے نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَاسْئَلُوٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.

اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھ لو۔

---

[1] صواعق مُحرقہ صفحہ ۱۴۸ - دُرِّ منثور جلد ۲ صفحہ ۶۰ - کنز العُمّال جلد ۱ صفحہ ۱۶۸ - اُسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۱۳۷ -

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۴۲ -

یہ آیت بھی اہلِ بیت کی شان میں نازل ہوئی تھی۔[1]

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اُمّت کے لیے ضروری ہے کہ وہ حقائق معلوم کرنے کے لیے اہلِ بیت سے رجُوع کرے۔ چنانچہ صحابہ کو جب کوئی بات مشکل معلوم ہوتی تھی تو وہ اس کی وضاحت کے لیے امام علیؑ سے رجوع کرتے تھے۔ اِسی طرح عوام مُدتوں ائمہؑ اہلِ بیت سے حلال و حرام معلوم کرنے کے لیے رجوع کرتے رہے اور ان کے عُلوم و معَارف کے چشموں سے فیض یاب ہوتے رہے۔

ابو حنیفہ کہا کرتے تھے :

"اگر وہ دو سال نہ ہوتے تو نُعمان ہلاک ہوگیا ہوتا۔"[2]

یہ ان دو سالوں کی طرف اشارہ تھا جن کے دوران میں انھوں نے امام جعفر صادقؑ سے تعلیم حاصل کی تھی۔

امام مالک کہتے تھے کہ :

"عِلم و فضل، عبادت اور زُہد و تقویٰ کے لحاظ سے جعفر صادقؑ سے بہتر کوئی شخص نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی کے تصوّر میں آیا۔"[3]

جب ائمہؒ اہلِ سُنّت کے اعتراف کے بموجب یہ صورت ہو تو ان تمام دلائل کے باوجود شیعوں پر طعن و تشنیع کیوں ؟ جب اسلامی تاریخ سے ثابت ہے کہ ائمہؑ اہلِ بیت اپنے زمانے میں علم میں سب سے برتر تھے، تو پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ اللہ سُبحانہٗ نے اپنے ان اولیاء کو جنھیں اس نے چُن لیا تھا مخصوص حکمت اور علمِ لَدُنّی سے نوازا اور انھیں مومنین کا پیشوا اور مسلمانوں کا امام مقرر کردیا۔

اگر مُسلمان ایک دوسرے کے دلائل سُنیں تو وہ ضرور اللہ اور رسولؐ کے فرمان

---

[1] تفسیر طبری جلد ۱۴ صفحہ ۱۳۴ - تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۵۷۰ - تفسیر قرطبی جلد ۱۱ صفحہ ۲۷۲۔

[2] شبلی نُعمانی، سیرتِ نعمان۔

[3] علامہ ابنِ شہر آشوب، مناقبِ آلِ ابی طالب، حالات امام صادقؑ۔

کو تسلیم کرلیں اور ایسی اُمّتِ واحدہ بن جائیں جو ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہو، پھر نہ کوئی اختلاف رہے نہ تفرقہ، نہ مختلف نظریات ومذاہب، نہ مسالک۔

یہ سب ہوگا اور ضرور ہوگا اور جو ہونے والا ہے اس کے مطابق اللہ اپنا فیصلہ ضرور دے گا۔

"تاکہ جسے برباد ہونا ہو وہ کھُلی نشانیاں آنے کے بعد برباد ہو اور جسے زندہ رہنا ہو وہ بھی کھُلی نشانیاں آنے کے بعد زندہ رہے۔" (سورۂ انفال - آیت ۴۸)

بَدَاء

اِس کے معنیٰ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی بات آئے جس کو کرنے کا اس کا ارادہ ہو پھر اس کی رائے بدل جائے اور پہلے جس کام کا ارادہ تھا، وہ اس کے بجائے کچھ اور کرلے۔

اہلِ سُنّت شیعوں کو مطعون کرنے کے لیے بَدَاء کا مطلب اس طرح لیتے ہیں کہ گویا یہ نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات میں جہل یا نقص کا۔ اور پھر کہتے ہیں کہ "شیعہ اللہ تعالیٰ کے جہل کے قائل ہیں"۔

دراصل بَدَاء کا یہ مطلب بالکل غلط ہے۔ شیعہ اس کے کبھی قائل نہیں رہے۔ اور جو شخص اس طرح کا عقیدہ ان سے منسوب کرتا ہے، وہ اِفتراء پردازی کرتا ہے۔ قدیم وجدید شیعہ عُلماء کے اقوال اس کے گواہ ہیں۔

شیخ محمد رضا مظفّر اپنی کتاب عقائدُ الاِمامیہ میں کہتے ہیں:

"اس معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کے لیے بَدَاء محال ہے کیونکہ یہ نقص ہے اور اللہ تعالیٰ کی لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔ شیعہ اس معنی میں بداء کے ہرگز قائل نہیں"۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو شخص یہ کہتا ہے کہ بَدَاء کے معنیٰ اِبْدَاءُ نَدَامَہ کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی کسی رائے کو غلط پاکر اور اس پر نادم ہو کر

اپنی وہ رائے بدل دیتا ہے تو ایسا شخص کافر ہے۔"
امام صادقؑ ہی نے فرمایا ہے کہ
"جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بَدَاء کی وجہ اس کی لاعلمی ہے، تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"
بالفاظِ دیگر شیعہ جس بَدَاء کے قائل ہیں وہ اس قرآنی آیت کے حُدود کے اندر ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ.
اور اللہ جس حُکم کو چاہتا ہے مِٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اس کے پاس ہے۔
(سورۂ رعد - آیت ۳۹)

اس بات کے اہلِ سُنّت بھی اسی طرح قائل ہیں جس طرح شیعہ۔ پھر شیعوں ہی پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے سُنّیوں پر کیوں نہیں۔ وہ بھی تو یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ احکام میں تغیّر کر دیتا ہے، موت کا وقت بدل دیتا ہے اور رِزق گھٹا بڑھا دیتا ہے۔

کیا کوئی پُوچھنے والا اہلِ سُنت سے پوچھ سکتا ہے کہ جب سب کچھ اَزَل سے اُمُّ الکتاب میں لکھا ہوا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے مطابق یہ تغیر و تبدّل کیوں کرتا رہتا ہے؟

ابنِ مَردُوَیہ اور ابن عساکر نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ:
حضرت علیؓ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ کے بارے میں دریافت کیا تو رسول اللہ صؐ نے فرمایا: میں اس کا ایسا مطلب بیان کروں گا کہ خُوش ہو جاؤ گے اور میرے بعد میری اُمت کی آنکھیں بھی اس سے ٹھنڈی ہوں گی۔ اگر صدقہ صحیح طریقے سے دیا جائے، والدین کے ساتھ نیکی کی جائے، کسی پر احسان کیا جائے، تو یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ ان سے بدبختی خوش بختی

میں بدل جاتی ہے، عمر بڑھتی ہے اور بری موت سے حفاظت رہتی ہے۔"

ابن مُنذِر اور ابنِ ابی حاتِم نے اور بیہقی نے شعبُ الایمان میں قیس بن عبّاد رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اَشہُرِ حُرُم میں سے ہر مہینے کی دسویں تاریخ کی رات کو اللہ تعالیٰ کا ایک خاص معاملہ ہوتا ہے۔ رجب کی دسویں تاریخ کو اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا باقی رکھتا ہے۔"

عَبد بن حمید، ابن جدیر اور ابن مُنذر نے عمر بن خطّاب رَضِیَ اللہ عَنہ سے روایت بیان کی ہے کہ

"عُمر بن خطّاب بیتُ اللہ کا طواف کر رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "یا الٰہی! اگر تو نے میری قسمت میں کوئی بُرائی یا گناہ لکھا ہو تو اسے مِٹا دے اور اسے سعادت و مغفرت سے بدل دے۔ کیونکہ تو جو چاہتا ہے مِٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور تیرے ہی پاس اُمّ الکتاب ہے۔" [1]

بُخاری نے اپنی صحیح میں ایک عجیب و غریب قصّہ بیان کیا ہے۔ معراج النبی صلعم کے دوران اپنے پروردگار سے ملاقات کا واقعہ بیان کرتے ہوئے رسولِ اکرم صلعم فرماتے ہیں:

"اس کے بعد مجھ پر پچاس نمازیں فرض کر دی گئیں۔ میں چلتا ہوا موسیٰ ع کے پاس آیا۔ اُنھوں نے پوچھا: کیا گزری؟ میں نے کہا: مجھ پر پچاس نمازیں فرض کر دی گئی ہیں۔ موسیٰ ع نے کہا: مجھے لوگوں کی حالت کا آپ سے زیادہ علم ہے۔ مجھے بنی اسرائیل کو قابو میں لانے میں بڑی محنت دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مناسب یہ ہے

---

[1] سُیوطی، دُرِّ منثور جلد ۴ صفحہ ۶۶۱

کہ آپ اپنے پروردگار کے پاس دوبارہ جائیے اور اس سے کچھ تخفیف کی درخواست کیجیے۔

چنانچہ میں نے واپس جاکر تخفیف کی درخواست کی۔ اللہ تعالیٰ نے چالیس نمازیں کردیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس پہنچا تو انھوں نے پھر وہی بات کہی۔ میں نے واپس جاکر پھر درخواست کی تو تیس نمازیں ہوگئیں۔ پھر یہی کچھ ہوا تو بیس ہوگئیں پھر دس ہوئیں۔ میں موسیٰؑ کے پاس گیا تو انھوں نے پھر وہی بات کہی اب کے پانچ ہوگئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس پہنچا، انھوں نے پوچھا کہ کیا کیا؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں کردیں موسیٰؑ نے پھر وہی بات کہی۔ اس مرتبہ جو میں نے سلام کیا تو آواز آئی: "اب میں نے اپنے فریضہ کے بارے میں پختہ حکم دے دیا ہے۔ میں نے اپنے بندوں کا بوجھ کم کردیا ہے اور میں ہر نیکی کا دس گنا اجر دوں گا۔" [1]

بخاری ہی میں ایک اور روایت ہے۔ اس میں ہے کہ:

"کئی مرتبہ کی مراجعت کے بعد جب پانچ نمازیں فرض رہ گئیں تو حضرت موسیٰؑ نے رسول اکرمؐ سے ایک بار پھر مراجعت کرنے کے لیے کہا۔ اور یہ بھی کہا کہ آپ کی امّت پانچ نمازوں کی بھی طاقت نہیں رکھتی۔ لیکن رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اب مجھے اپنے رب سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔" [2]

جی ہاں پڑھیے اور علمائے اہلِ سنّت کے ان عقائد پر سر دھنیے۔ اس پر بھی وہ ائمہ اہلِ بیت کے پیروکار شیعوں پر اس لیے اعتراض کرتے ہیں کہ وہ بَدَاء کے قائل ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۷۸، کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ۔

[2] صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۲۵۰ بابُ المعراج۔ صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۰۱ باب الاسراء برسول اللہؐ وفرض الصلوات۔

اِس قصے میں اہلِ سُنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمدؐ اور اُمّتِ محمدیہ پر اول پچاس نمازیں فرض کی تھیں پھر محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مُراجعت کرنے پر اسے یہ مناسب معلوم ہوا کہ نمازوں کی تعداد چالیس کردے۔ پھر دوسری دفعہ مُراجعت کرنے پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ نمازوں کی تعداد تیس کردے۔ تیسری دفعہ مُراجعت کرنے پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس تعداد کو گھٹا کر بیس کردے۔ پھر چوتھی دفعہ مُراجعت کرنے پر مناسب معلوم ہوا کہ دس کردے۔ پانچویں دفعہ مُراجعت کرنے پر مناسب معلوم ہوا کہ پانچ کردے۔

اور کون جانتا ہے کہ اگر محمدؐ اپنے رب سے شرما نہ جاتے تو وہ یہ تعداد ایک ہی کردیتا یا بالکل معاف کردیتا۔

اَسْتَغْفِرُاللہ۔ کیسی شرمناک بات ہے!

میرا اعتراض اس پر نہیں کہ اس قصے میں بَدَاء کیوں ہے؟ نہیں، بالکل نہیں۔ یَمْحُوااللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْکِتٰبِ۔

ہم پہلے اہلِ سُنّت کا یہ عقیدہ بیان کرچکے ہیں کہ وَالِدین سے حُسنِ سُلوک صدقات اور دُوسروں کے ساتھ بھلائی اور اِحسان سے بدبختی، نیک بختی میں بدل جاتی ہے، عُمر میں اضافہ ہوتا ہے اور بُرے طریقے سے موت سے حفاظت ہوجاتی ہے — ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ اسلامی اُصولوں اور قرآن کی رُوح کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔

اگر ہمارا سب کا یعنی شیعہ اور سُنّی دونوں کا یہ عقیدہ نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ تغیّر و تبدّل کرتا رہتا ہے، تو ہماری یہ نمازیں اور دُعائیں سب بیکار تھیں، ان کا نہ کوئی فائدہ تھا اور نہ کوئی مقصد۔

ہم سب اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ احکام تبدیل کرتا ہے۔ اِسی لیے ہر نبی کی شریعت جُدا ہے بلکہ خود ہمارے نبی کی شریعت میں بھی ناسخ و منسوخ کا

سلسلہ رہا ہے، ایسی صورت میں بَدَا۔ کا عقیدہ نہ کفر ہے اور دین سے بغاوت۔ اہلِ سُنّت کو کوئی حق نہیں کہ اس عقیدے کی وجہ سے شیعوں کو طعنے دیں۔ اسی طرح شیعوں کو بھی حق نہیں کہ اہلِ سُنّت پر اعتراض کریں۔

لیکن مجھے مذکورہ بالا قصّے پر ضرور اعتراض ہے یعنی محمّد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نماز کے بارے میں اپنے پروردگار سے سودے بازی پر۔ کیونکہ اس میں اللہ جَلَّ شَانُہٗ کی طرف جہل کی نسبت لازم آتی ہے اور تاریخ بشریت کے سب سے بڑے انسان یعنی ہمارے نبی محمّد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شخصیت کی توہین ہوتی ہے۔ اِس روایت میں جناب موسیٰؑ حضرت محمدؐ سے کہتے ہیں کہ :

اَنَا اَعْلَمُ بِالنَّاسِ مِنْكَ .

میں لوگوں کے حالات اور مزاج سے تمھاری نسبت زیادہ واقف ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ موسیٰؑ زیادہ افضل ہیں اور اگر وہ نہ ہوتے تو اُمّتِ محمدیہ کی عبادت کے بوجھ میں تخفیف نہ ہوتی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت موسیٰؑ کو کیسے معلوم ہوا کہ اُمّتِ محمّدیہ پانچ نمازوں کا بھی بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی جبکہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم نہیں تھی، کیونکہ اس نے ناقابل برداشت عبادت کا بوجھ اپنے بندوں پر ڈال دیا تھا اور پچاس نمازیں ان پر فرض کر دی تھیں۔

میرے بھائی ذرا تصوّر کیجیے! پچاس نمازیں ایک دن میں کیسے ادا کی جاسکتی ہیں؟ ایسا ہوا تو پھر نہ کوئی مشغلہ ہوگا، نہ کوئی کام، نہ تعلیم نہ کمائی، نہ کوشش نہ ذمّہ داری۔ سب آدمی فرشتے بن جائیں گے، جن کا کام صرف نمازیں پڑھنا اور عبادت کرنا ہوگا۔ آپ معمولی حساب لگائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک نماز میں دس منٹ بھی لگیں اور یہ ایک باجماعت نماز کے وقت کا معقول اندازہ ہے، تو دس منٹ کو پچاس سے ضرب دے لیجیے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچاس نمازیں ادا کرنے میں تقریباً دس گھنٹے لگیں گے۔ اب یا تو آپ اس اُفتاد پر صبر کریں یا اس دین کا ہی انکار کر دیں جو اپنے ماننے والوں پر یہ ناقابلِ برداشت

بوجھ ڈالتا ہے۔

ہوسکتا ہے یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے خلاف سرکشی کی کوئی قابلِ قبول وجہ ہو۔ لیکن اب تو محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کا بوجھ اتار دیا ہے اور ان کی سب زنجیریں کاٹ دی ہیں۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اتباع نہ کرنے کا ان کے پاس کیا بہانہ ہے۔

اگر اہلِ سُنّت شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ شیعہ بَدَاء کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ جیسے مناسب سمجھتا ہے تغیّر تبدّل کرلیتا ہے تو وہ اپنے اُوپر کیوں اعتراض نہیں کرتے جب وہ خُود یہ کہتے ہیں کہ اللہ سُبْحَانَہٗ نے جب مناسب سمجھا تو ایک ہی حُکم ایک ہی رات یعنی شبِ معراج میں پانچ دفعہ بدل دیا۔

بُرا ہو اندھے تعصّب اور عِناد کا جو حقائق کو چھپاتا اور اُلٹا کرکے پیش کرتا ہے۔ مُتعصّب اپنے مخالف پر حملہ کرنے کے لیے صاف اور واضح اُمور کا انکار کرگزرتا ہے اور بات بے بات مخالف پر اعتراض کرتا ہے، اس کے خلاف افواہیں پھیلاتا ہے اور ذراسی بات کا بتنگڑ بنادیتا ہے جبکہ خُود بہت زیادہ قابلِ اعتراض باتیں کہتا ہے۔

یہاں مجھے وہ بات یاد آگئی جو حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام نے یہود سے کہی تھی۔ آپ نے کہا تھا:

"تم دُوسروں کی آنکھ کا تِنکا دیکھتے ہو اور اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتے۔"

ایک مثال ہے کہ:

"بیماری تو اسے تھی مگر وہ مجھ سے یہ کہہ کر کہ یہ بیماری تمھیں ہے خود کھِسک گئی۔"

شاید کوئی یہ کہے کہ اہلِ سُنّت کے یہاں بَدَاء کا لفظ نہیں آیا، گو اس کے معنیٰ تو حکم بدلنے ہی کے ہیں لیکن پھر بھی بَدَا لِلّٰہِ کے الفاظ اہلِ سُنّت کے یہاں نہیں۔

میں اکثر دلیل کے طور پر کہ بَدَاء اہلِ سُنّت کے یہاں بھی ہے یہ معراج

کا قصّہ پیش کیا کرتا تھا۔ اِس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس میں 'بَدا،' کا لفظ نہیں ہے، لیکن بعد میں جب میں نے انھیں صحیح بُخاری کی ایک روایت دکھائی جس میں صراحت کے ساتھ 'بَدا،' کا لفظ ہے اور اس میں کسی شک کی گنجائش بھی نہیں، تو وہ مان گئے۔

روایت حسبِ ذیل ہے :
بُخاری نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا :

"بنی اسرائیل میں تین آدمی تھے : ایک کے جسم پر برص کے سفید داغ تھے، دوسرا نابینا تھا اور تیسرا گنجا تھا۔ بَدَا اللّٰہِ اَنْ یَّبْتَلِیَھُمْ اللہ کو یہ (مناسب) معلوم ہوا کہ ان کا امتحان لے۔ چنانچہ ایک فرشتے کو بھیجا، جو پہلے مبروص کے پاس آیا اور اس سے پوچھا : تمھیں سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہے؟ اس نے کہا : صاف ستھری جلد اور اچھّا رنگ، کیونکہ لوگ مجھ سے گھِن کرتے ہیں۔ فرشتے نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو اس کی بیماری جاتی رہی اور خوبصورت رنگ نکل آیا۔ پھر فرشتے نے پوچھا : تمھیں کس قسم کا مال پسند ہے؟ اس نے کہا : اُونٹ۔ فرشتے نے اسے ایک دس مہینے کی گیابھن اُونٹنی دے دی۔

اس کے بعد فرشتہ گنجے کے پاس آیا۔ اس سے پوچھا : تمھیں سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہے؟ اس نے کہا : خوبصورت بال اور میری یہ بیماری جاتی رہے، مجھ سے لوگ گھِن کرتے ہیں۔ فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کا گنج جاتا رہا اور عمدہ بال نکل آئے۔ اس کے بعد فرشتے نے اس سے پُوچھا کہ تمھیں کون سا مال سب سے زیادہ پسند ہے؟ اس شخص نے کہا : گائیں۔ فرشتے نے اسے ایک گیابھن گائے دے دی۔

اس کے بعد فرشتہ اندھے کے پاس آیا۔ اس سے پوچھا : تمھیں

کون سی چیز سب سے زیادہ پسند ہے ؟ اس نے کہا : میں تو بس یہی چاہتا ہوں کہ اللہ میری بینائی لوٹا دے۔ فرشتے نے ہاتھ پھیرا تو بینائی واپس آگئی۔ فرشتے نے پوچھا تمھیں کونسا مال پسند ہے ؟ اس شخص نے کہا : بھیڑیں۔ فرشتے نے اسے ایک بچوں والی بھیڑ دے دی۔

ایک مدّت کے بعد جب ان لوگوں کے پاس اونٹ، گائیں اور بھیڑیں خوب ہوگئیں اور ہر ایک کے پاس پورا گلّہ ہوگیا تو وہ فرشتہ اسی شکل میں پھر آیا اور مبروص، گنجے اور نابینا میں سے ہر ایک کے پاس جاکر ان کے پاس جو جانور تھے ان میں سے کچھ جانور مانگے۔ مبروص اور گنجے نے انکار کردیا۔ اس پر اللہ نے ان کو پھر ان کی شکل پر لوٹا دیا۔ نابینا نے جانور دیدیے تو حق تعالیٰ نے اس کے مال میں اور برکت دی اور اس کی بینائی بھی بحال رکھی "۔[1]

اس لیے میں اپنے بھائیوں کو یہ ارشادِ ربّانی یاد دلاتا ہوں :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَ مَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ.

اے ایمان والو! نہ مرد مردوں کا مذاق اُڑائیں، کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا، کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کا نام رکھو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام ہی بُرا ہے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ باب مَا ذُکِرَ عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ۔

اور جو اَب بھی توبہ نہ کریں گے ، وہی ظالم ٹھہریں گے - !

(سورۂ حجرات - آیت ۱۱)

میری دِلی خواہش ہے کہ کاش مسلمانوں کو عقل آجائے ، وہ تعصّب کو چھوڑ دیں اور دشمن کے مقابلے میں بھی جذبات سے کام نہ لیں تاکہ ہر بحث میں فیصلہ جذبات کے بجائے عقل سے ہو -

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بحث وجِدال میں قرآن کریم کا اُسلوب اختیار کریں - اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ؐ پر وحی نازل کی تھی کہ وہ اپنے مخالفین سے کہہ دیں کہ :

وَاِنَّآ اَوْ اِیَّاکُمْ لَعَلٰی ھُدًی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ .

کہہ دیجیے : یا ہم راہ راست پر ہیں یا تم ، اسی طرح یا ہم گمراہی میں ہیں یا تم -

(سورۂ سبا - آیت ۲۴)

یہ کہہ کر رسول اللہ ؐ نے مشرکین کی قدر و منزلت بڑھا دی اور خود ان کی سطح پر آنا منظور کر لیا تاکہ مشرکین کے ساتھ انصاف ہو اور اگر وہ سچے ہوں تو انھیں بھی اپنے دلائل پیش کرنے کا موقع مل سکے -

اب ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم ان اعلیٰ اخلاق پر کہاں تک عمل پیرا ہیں !

تقیّہ

ہم گزشتہ بحث میں کہہ چکے ہیں کہ اہلِ سُنّت کے نزدیک "بَدَاء" بہت ہی قابلِ اعتراض اور مکروہ عقیدہ ہے، اسی طرح تقیّہ کو بھی وہ بُرا سمجھتے ہیں اور اس پر شیعہ بھائیوں کا مذاق اُڑاتے ہیں بلکہ شیعوں کو منافق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعوں کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور ظاہر کچھ اور کرتے ہیں۔

میں نے اکثر اہلِ سُنّت سے گفتگو کر کے انھیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ تقیّہ نِفاق نہیں ہے لیکن انھیں تو کسی بات کا یقین ہی نہیں آتا سوائے اس کے کہ جو انھیں ان کی مذہبی عصبیت نے سکھا دیا ہے یا جو ان کے بڑوں بزرگوں نے ان کے دل میں بٹھا دیا ہے۔

یہ بڑے پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان انصاف پسند اور تحقیق کے طالب لوگوں سے جو شیعوں اور شیعہ عقائد کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، حقائق کو چھپائیں اور یہ کہہ کر انھیں شیعوں سے متنفّر کرنے کی کوشش کریں کہ یہ عبداللہ بن سَبا یہودی کا فرقہ ہے جو رَجعت، بَدَاء، تَقِیّہ، عِصمت اور مُتعہ کا قائل ہے اور اس کے عقائد میں بہت سے خُرافات اور فرضی باتیں شامل ہیں جیسے مثلاً مہدیِ منتظر وغیرہ کا عقیدہ۔ جو شخص ان کی باتوں کو سُنتا ہے وہ کبھی اظہارِ نفرت کرتا ہے اور کبھی اظہارِ حیرت۔ اور یہی سمجھتا ہے کہ ان خیالات کا اسلام سے کوئی تعلّق نہیں، یہ سب شیعوں کی منگھڑت اور فرضی باتیں ہیں۔

مگر جب کوئی شخص تحقیق کرتا ہے اور انصاف سے کام لیتا ہے تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب عقائد کا اسلام سے گہرا تعلق ہے اور یہ قرآن وسُنّت کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی عقائد وتصوّرات ان کے بغیر اپنی صحیح شکل اختیار ہی نہیں کر سکتے۔

اہلِ سُنّت میں عجیب بات یہ ہے کہ جن عقائد کو وہ بُرا سمجھتے ہیں، ان ہی

عقائد سے ان کی کتابیں اور احادیث کے معتبر مجموعے بھرے ہوئے ہیں۔ اب ایسے لوگوں کا کیا علاج جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔ اور جو خود اپنے عقائد کی اس لیے ہنسی اُڑاتے ہیں کیونکہ شیعہ ان پر عامل ہیں۔

ہم بَدَاء کی بحث میں ثابت کر چکے ہیں کہ اہلِ سُنّت خود بَدَاء کے قائل ہیں لیکن اگر دوسرے بَدَاء کے قائل ہوں تو ان پر اعتراض کرنے سے نہیں چُوکتے۔

اب آیئے دیکھیں تقیّہ کے مسئلہ میں اہل سُنّت والجماعت کیا کہتے ہیں؟ اس کی بنا پر تو وہ شیعوں پر مُنافق ہونے تک کا الزام لگاتے ہیں۔

ابن جریر طبری اور ابن ابی حاتم نے عوفی کے واسطے سے ابنِ عبّاس سے روایت بیان کی ہے کہ اِس آیت اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً کے بارے میں ابنِ عبّاس کہتے تھے کہ:

"تقیّہ زبان سے ہوتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی کسی شخص کو ایسی بات کہنے پر مجبور کرے جو اصل میں معصیت ہے تو وہ اگر لوگوں کے ڈر کے مارے وہ بات کہہ دے جب کہ اس کا دِل پوری طرح ایمان پر قائم ہو تو اسے کچھ نقصان نہیں ہوگا یہ بھی یاد رکھو کہ تقیّہ محض زبان سے ہوتا ہے"[1]

یہ روایت حاکم نے نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ بیہقی نے بھی اپنی سُنَن میں عَطاء عَن ابن عباس کے حوالے سے اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً "مگر ہاں ایسی صورت میں کہ تم کو ان سے کچھ اندیشۂ ضرر ہو۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۲۸) کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابنِ عباس کہتے تھے کہ "تُقٰىةً کا تعلق زبان سے کہنے سے ہے بشرطیکہ دل ایمان پر قائم ہو"

عَبد بن حمید نے حَسَن بصری سے روایت بیان کی ہے کہ "حَسَن بصری کہتے تھے کہ تقیّہ روزِ قیامت تک جائز ہے"۔[2]

---

[1] سُیوطی، تفسیر درمنثور

[2] سُنَنِ بیہقی۔ مُستدرکِ حاکم

عبد بن ابی رجاء نے نقل کیا ہے کہ حسن بصری اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے : اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تَقِیَّةً ۔ [1]

عبدالرزاق ، ابنِ سعد ، ابن جریر طبری ، ابنِ ابی حاتم اور ابن مَردُوَیہ نے مندرجہ ذیل روایت بیان کی ہے ، حاکم نے مستدرک میں اسے صحیح کہا ہے ، بیہقی نے دلائل میں اس کو نقل کیا ہے ۔ روایت یہ ہے :

مُشرکین نے عمّار بن یاسر رض کو پکڑ لیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک عمّار رض نے نبی اکرم ص کو گالی نہ دی اور مشرکین کے معبودوں کی تعریف نہ کی ۔

آخر جب عمّار رض کو مشرکین نے چھوڑ دیا تو وہ رسول اللہ ص کے پاس آئے ۔ رسول اللہ ص نے پوچھا : کہو کیا گزری ؟ عمّار رض نے کہا : بہت بُری گزری ، انھوں نے مجھے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک میں نے آپ کی شان میں گستاخی نہ کی اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی ۔ رسول اکرم ص نے پوچھا : تمھارا دل کیا کہتا ہے ؟ عمّار رض نے کہا : میرا دل تو ایمان پر پختہ اور قائم ہے ۔ رسول اللہ ص نے فرمایا : اگر وہ لوگ تم پر پھر زبردستی کریں تو پھر ایسے ہی کہہ دینا ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِہٖۤ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَ قَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ ۔

یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد خُدا کے ساتھ کُفر کرے مگر وہ نہیں جو کُفر پر زبردستی مجبور کردیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو ۔ (سورۂ نحل ۔ آیت ۱۰۶)

ابن سعد نے محمد بن سیرین سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ص نے دیکھا کہ عمّار رض رو رہے ہیں ۔ آپ نے ان کے آنسو پونچھے اور کہا : (مجھے معلوم ہے کہ) کُفّار

---

[1] سیوطی ، درمنثور [2] ابن سعد ، طبقات الکبریٰ ۔

نے تمھیں پانی میں ڈبو دیا تھا تب تم نے ایسا کہا۔ اگر وہ پھر تمھارے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں، تو پھر یہی کہہ دینا۔[1]

ابن جریر، ابن مُنذر، ابنِ ابی حاتم نے اور بیہقی نے اپنی سُنَن میں عَنْ عَلِیٍّ عَنِ ابْنِ عَبَّاس کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ

ابنِ عبّاس اس آیت کی تفسیر میں کہتے تھے: مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ جس نے ایمان کے بعد کُفر کیا، اس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور اس کے لیے سخت عذاب ہے مگر جسے مجبور کیا گیا اور اس نے دشمن سے بچنے کے لیے زبان سے کچھ کہہ دیا مگر اس کے دل میں ایمان ہے اور اس کا دل اس کی زبان کے ساتھ نہیں، تو کوئی بات نہیں کیونکہ اللہ اپنے بندوں سے صرف اس بات کا مُواخذہ کرتا ہے جس پر ان کا دل جم جائے۔[2]

ابنِ ابی شَیبہ، ابن جریر طَبری، ابن مُنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت مکّے کے کچھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ یہ لوگ ایمان لے آئے تو انھیں بعض صحابہ نے مدینے سے لکھا کہ ہجرت کر کے یہاں آجاؤ۔ جب تک تم ہجرت کر کے یہاں نہیں آؤ گے، ہم تمھیں اپنا ساتھی نہیں سمجھیں گے۔ اس پر وہ مدینہ کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں انھیں قریش نے پکڑ لیا اور ان پر سختی کی۔ مجبوراً انھیں کچھ کلماتِ کُفر کہنے پڑے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ۔[3]

بُخاری نے اپنی صحیح میں بابُ المُداراۃِ مَعَ النّاس میں ایک روایت نقل کی ہے، جس کے مطابق ابُوالدرداء کہتے تھے:

کچھ لوگ ہیں جن سے ہم بڑی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں،

---

[1] ابن سَعد، طبقاتُ الکبریٰ

[2] حافظ احمد بن حُسین بیہقی، سُنن الکبریٰ

[3] سُیوطی، تفسیر دُرِّ منثور جلد ۲ صفحہ ۱۷۸

لیکن ہمارے دل ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔[1]

حلبی نے اپنی سیرت میں یہ روایت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "جب رسول اللہؐ نے شہرِ خیبر فتح کیا تو حجّاج بن علاط نے آپ سے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! مکّے میں میرا کچھ سامان ہے اور وہاں میرے گھر والے بھی ہیں، میں انھیں لانا چاہتا ہوں، کیا مجھے اجازت ہے اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دوں جو آپ کی شان میں گستاخی ہو؟ رسول اللہؐ نے اجازت دے دی اور کہا: جو چاہے کہو"۔[2]

امام غزّالی کی کتاب اِحیاءُ العلوم میں ہے کہ:

"مسلمان کی جان بچانا واجب ہے۔ اگر کوئی ظالم کسی مسلمان کو قتل کرنا چاہتا ہو اور وہ شخص چھپ جائے تو ایسے موقع پر جھوٹ بول دینا واجب ہے"۔[3]

جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب اَلاَشباہُ وَالنظائر میں ایک روایت بیان کی ہے۔ اس میں

"فاقہ کشی کی حالت میں مردار کھانا، شراب میں لقمہ ڈبونا اور کُفر کا کلمہ زبان سے نکالنا جائز ہے۔ اگر کسی جگہ حرام ہی حرام ہو اور حلال شاذ و نادر ہی ملتا ہو تو حسبِ ضرورت حرام کا استعمال جائز ہے"۔

ابوبکر رازی نے اپنی کتاب اَحکامُ القُرآن میں اس آیت اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

مطلب یہ ہے کہ اگر تمھیں جان جانے یا کسی عضو کے تلف

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۷ صفحہ ۱۰۲

[2] علی بن برہان الدین شافعی، اِنسانُ العیون المعروف بہ سیرتِ حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۶۱

[3] حجۃُ الاسلام ابوحامد غزّالی، اِحیاء علوم الدین۔

ہو جانے کا اندیشہ ہو تو تم کُفّار سے بہ ظاہر دوستی کا اظہار کر کے اپنی جان بچا سکتے ہو۔ آیت کے الفاظ سے یہی معنی نکلتے ہیں اور اکثر اہلِ علم اِسی کے قائل ہیں۔ قتادہ نے بھی لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ مُومن کے لیے جائز نہیں کہ کسی کافر کو دین کے معاملے میں اپنا دوست یا سرپرست بنائے سوائے اس کے کہ ضَرر کا اندیشہ ہو۔ قتادہ نے مزید کہا ہے کہ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقیّہ کی صورت میں زبانی کُفر کا اظہار جائز ہے۔"[1]

صحیح بُخاری میں عُروہ بن زُبیر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے انھیں بتلایا کہ

ایک دفعہ ایک شخص نے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا: لغو آدمی ہے، خیر آنے دو۔ جب وہ شخص آیا تو آپ نے بڑی نرمی سے اس سے بات چیت کی۔ میں نے پُوچھا: یا رسول اللہؐ! ابھی تو آپ نے کیا فرمایا تھا پھر آپ نے اس سے گفتگو اتنی خوش اخلاقی سے کی؟ آپ نے جواب دیا: عائشہ! اللہ کے نزدیک وہ بدترین آدمی ہے جس سے لوگ اس کی بدزبانی کی وجہ سے بچیں یا اس کی بدزبانی کی وجہ سے اسے چھوڑ دیں۔[2]

اِس قدر تبصرہ یہ دکھانے کے لیے کافی ہے کہ اہلِ سُنّت تقیّہ کے جواز کے پوری طرح قائل ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ تقیّہ قیامت تک جائز رہے گا اور۔ جیسا کہ غزّالی نے کہا ہے، ان کے نزدیک بعض صورتوں میں جھوٹ بولنا واجب

---

[1] ابوبکر رازی، احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۰

[2] صحیح بخاری جلد ۷ باب لَمْ یَکُنِ النَّبِیُّؐ فَاحِشًا وَّلَا مُتَفَحِّشًا۔

ہے اور بقولِ رازی جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ بعض صورتوں میں اظہارِ کفر بھی جائز ہے اور ۔ جیسا کہ بخاری اعتراف کرتے ہیں بہ ظاہر مسکرانا اور دل میں لعنت کرنا بھی جائز ہے اور ۔ جیسا کہ صاحبِ سیرۃ حلبیہ نے لکھا ہے، اپنے مال کے ضائع ہو جانے کے خوف سے رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی کرنا بلکہ کچھ بھی کہہ دینا روا ہے ۔ اور ۔ جیسا کہ سیوطی نے اعتراف کیا ہے لوگوں کے خوف سے ایسی باتیں کہنا بھی جائز ہے جو گناہ ہیں ۔

اب اہلِ سنّت کے لیے اس کا قطعاً جواز نہیں کہ وہ شیعوں پر ایک ایسے عقیدے کی وجہ سے اعتراض کریں جس کے وہ خود بھی قائل ہیں اور جس کی روایات ان کی مستند حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جو تقیّہ کو نہ صرف جائز بلکہ واجب بتلاتی ہیں جن باتوں کے اہلِ سنّت قائل ہیں، شیعہ ان سے زیادہ کچھ نہیں کہتے ۔ یہ بات البتہ ہے کہ وہ تقیّہ پر عمل کرنے میں دوسروں سے زیادہ مشہور ہو گئے ہیں ۔ اور وجہ اس کی وہ ظلم و تشدّد ہے جس سے شیعوں کو اُموی اور عبّاسی دَور میں سابقہ پڑا ۔ اس دور میں کسی شخص کے قتل کر دیے جانے کے لیے کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ "یہ بھی شیعانِ اہلِ بیت میں سے ہے"۔

ایسی صورت میں شیعوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا کہ وہ ائمّہ اہلِ بیت علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں تقیّہ پر عمل کریں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

اَلتَّقِيَّةُ دِيْنِيْ وَ دِيْنُ اٰبَائِيْ .

تقیہ میرا اور میرے آباء و اجداد کا دین ہے۔

اور یہ بھی فرمایا کہ

مَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهٗ لَا دِيْنَ لَهٗ .

جو تقیّہ نہیں کرتا، اس کا دین ہی نہیں۔

تقیّہ خود ائمۂ اہلِ بیت کا شِعار تھا، اور اس کا مقصد اپنے آپ کو اور اپنے پیروکاروں اور دوستوں کو ضرر سے محفوظ رکھنا، ان کی جانیں بچانا اور ان مسلمانوں کی بہتری کا سامان کرنا تھا جو اپنے معتقدات کی وجہ سے تشدّد کا شکار ہو رہے تھے،

جیسے مثلاً عمّار بن یاسرؓ۔ بعض کو تو عمّار بن یاسرؓ سے بھی زیادہ تکلیف اُٹھانی پڑی۔

اہلِ سُنّت اِن مصائب سے محفوظ تھے کیونکہ ان کا ظالم حکمرانوں کے ساتھ مکمل اتحاد تھا۔ اس لیے انھیں نہ قتل کا سامنا کرنا پڑا، نہ لُوٹ کھسوٹ کا، نہ ظلم وستم کا۔ اس لیے یہ قدرتی امر ہے کہ وہ نہ صرف تقیّہ کا انکار کرتے ہیں بلکہ تقیّہ کرنے والوں پر طعن وتشنیع بھی کرتے ہیں۔ دراصل بنی اُمیّہ اور بنی عبّاس کے حکمرانوں نے تقیّہ کی بنا پر شیعوں کو بدنام کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ان ہی کی پیروی اہلِ سُنّت والجماعت نے کی ہے۔

جب اللہ سُبحانہ، نے قرآن میں تقیّہ کا حکم نازل فرمایا ہے اور جب خود رسول اللہؐ نے اس پر عمل کیا ہے، جیسا کہ بُخاری کی روایت میں آپ پڑھ چکے ہیں اس کے علاوہ رسول اللہؐ نے عمّار بن یاسرؓ کو اجازت دی کہ اگر کُفّار پھر ان پر تشدّد کریں اور اذیّت دیں تو جو کلماتِ کُفر کُفّار کہلوانا چاہیں وہ کہہ دیں۔ نیز یہ کہ قرآن و سُنّت پر عمل کرتے ہوئے علماء نے بھی تقیّہ کی اجازت دی ہے تو پھر آپ ہی انصاف سے بتائیں کہ کیا اس کے بعد بھی شیعوں پر طعن کرنا اور ان پر اعتراض کرنا درست ہے؟

صحابۂ کرام نے ظالم حکمرانوں کے عہد میں تقیّہ پر عمل کیا ہے۔ اس وقت جبکہ ہر شخص کو جو علی بن ابی طالبؑ پر لعنت کرنے سے انکار کرتا تھا قتل کر دیا جاتا تھا حجر بن عدی کندی اور ان کے ساتھیوں کا قصّہ تو مشہور ہے۔ اگر میں صحابہ کے تقیہ کی مثالیں جمع کروں تو ایک الگ کتاب کی ضرورت ہوگی۔ لیکن میں نے اہلِ سُنّت کے حوالوں سے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ بحمدِاللہ کافی ہیں۔

لیکن اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ ضرور بیان کروں گا جو خود میرے ساتھ پیش آیا۔ ایک دفعہ ہوائی جہاز میں میری ملاقات اہلِ سُنّت کے ایک عالم سے ہوگئی ہم دونوں برطانیہ میں منعقد ہونے والی ایک اسلامی کانفرنس میں مدعو تھے۔ دو گھنٹے تک ہم شیعہ سُنّی مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ صاحب اسلامی اتحاد کے داعی اور حامی تھے۔ مجھے بھی ان میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی لیکن اس وقت مجھے بُرا معلوم ہوا جب انھوں نے یہ کہا کہ شیعوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بعض ایسے عقائد چھوڑ دیں جو

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالتے اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کا سبب بنتے ہیں۔ میں نے پوچھا: مثلاً ؟

انھوں نے بے دھڑک جواب دیا: مثلاً "متعہ اور تقیہ"۔

میں نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ متعہ تو جائز ہے اور قانونی نکاح کی ایک صورت ہے اور تقیہ اللہ کی طرف سے ایک رعایت اور اجازت ہے۔ لیکن وہ حضرت اپنی بات پر اڑے رہے اور میری ایک نہ مانے، نہ ہی میرے دلائل انھیں قائل کر سکے۔

کہنے لگے: جو کچھ آپ نے کہا ہے، ممکن ہے کہ وہ صحیح ہو، لیکن مصلحت یہی ہے کہ مسلمانوں کی وحدت کی خاطر ان چیزوں کو ترک کر دیا جائے۔

مجھے ان کی منطق عجیب معلوم ہوئی، کیونکہ وہ مسلمانوں کی وحدت کی خاطر اللہ کے احکام کو ترک کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ پھر بھی میں نے ان کا دل رکھنے کو کہا: اگر مسلمانوں کا اتحاد اسی پر موقوف ہوتا تو میں پہلا شخص ہوتا جو یہ بات مان جاتا۔

ہم لندن ایرپورٹ پر اترے تو میں ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ جب ہم ایرپورٹ پولیس کے پاس پہنچے تو ہم سے برطانیہ آنے کی وجہ پوچھی گئی۔

ان صاحب نے کہا: میں علاج کے لیے آیا ہوں۔

میں نے کہا کہ میں اپنے کچھ دوستوں سے ملنے آیا ہوں۔

اس طرح ہم دونوں کسی دقت کے بغیر وہاں سے گزر کر اس ہال میں پہنچ گئے جہاں سامان وصول کرنا تھا۔ اس وقت میں نے چپکے سے ان کے کان میں کہا کہ:

آپ نے دیکھا کہ کیسے تقیہ (نظریۂ ضرورت) ہر زمانے میں کارآمد ہے؟

کہنے لگے: کیسے ؟

میں نے کہا: ہم دونوں نے پولیس سے جھوٹ بولا۔ میں نے کہا میں دوستوں سے ملاقات کے لیے آیا ہوں، اور آپ نے کہا کہ میں علاج کے لیے آیا ہوں۔ حالانکہ ہم دونوں کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔

وہ صاحب کچھ دیر مسکراتے رہے۔ سمجھ گئے تھے کہ میں نے ان کا جھوٹ سن لیا۔

پھر کہنے لگے: کیا اسلامی کانفرنسوں میں ہمارا رُوحانی علاج نہیں ہے؟
میں نے ہنس کر کہا: تو کیا ان کانفرنسوں میں ہماری اپنے دوستوں سے ملاقات نہیں ہوتی؟

اب میں پھر اپنے موضوع پر واپس آتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اہلِ سُنّت کا یہ کہنا غلط ہے کہ تقیّہ نِفاق کی کوئی شکل ہے بلکہ بات اس کی اُلٹ ہے، کیونکہ نِفاق کے معنیٰ ہیں: ظاہر میں ایمان اور باطن میں کفر — اور تقیّہ کے معنیٰ ہیں ظاہر میں کفر اور باطن میں ایمان۔ ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

نِفاق کے متعلق اللہ سُبحانہٗ نے فرمایا ہے:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ.

جب وہ مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے۔

(سورۂ بقرہ - آیت ۱۴)

اِس کا مطلب ہوا: ایمانِ ظاہر + کُفرِ باطن = نِفاق

تقیّہ کے بارے میں اللہ سُبحانہٗ نے کہا ہے:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَكْتُمُ اِیْمَانَهٗ

فرعون کی قوم میں سے ایک مُومن شخص نے جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، کہا .....“

اِس کا مطلب ہوا: کُفرِ ظاہر + ایمانِ باطن = تقیّہ

یہ مومنِ آلِ فرعون اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا جس کا علم سِوائے اللہ کے کسی کو نہیں تھا، وہ فِرعون اور دوسرے سب لوگوں کے سامنے یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ فِرعون کے دین پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر قرآنِ کریم میں تعریف کے انداز میں کیا ہے۔

اب قارئین باتمکین آیئے دیکھیں! خود شیعہ تقیہّ کے بارے میں کیا کہتے ہیں تاکہ ان کے بارے میں جو غلط سلط باتیں مشہور ہیں، جو جھوٹ بولا جاتا اور طوفان اُٹھایا جاتا ہے، ہم اس سے دھوکا نہ کھانے پائیں۔

شیخ محمد رضا مظفرؒ اپنی کتاب عقائدُ الاِمامیہ میں لکھتے ہیں:

تقیہّ بعض موقعوں پر واجب ہے اور بعض موقعوں پر واجب نہیں۔ اس کا دارومدار اس پر ہے کہ ضرر کا کتنا خوف ہے۔ تقیہّ کے احکام فقہی کتابوں کے مختلف ابواب میں علماء نے لکھے ہیں۔ ہر حالت میں تقیہّ واجب نہیں۔ صرف بعض صورتوں میں تقیہ کرنا جائز ہے۔

بعض صورتوں میں تو تقیہ نہ کرنا واجب ہے، مثلاً اس صورت میں جب کہ حق کا اِظہار، دین کی مدد، اسلام کی خدمت اور جہاد ہو۔ ایسے موقع پر جان و مال کی قُربانی سے دریغ نہیں کیا جاتا۔

بعض صُورتوں میں تقیہ حرام ہے یعنی ان صورتوں میں جب تقیہّ کا نتیجہ خونِ ناحق، باطل کا رواج یا دین میں بگاڑ ہو یا تقیہّ کے باعث مسلمانوں کا سخت نقصان ہونے، مسلمانوں میں گمراہی پھیلنے یا ظلم وجَور کے فروغ پانے کا اندیشہ ہو۔

بہر حال شیعوں کے نزدیک تقیہّ کا جو مطلب ہے وہ ایسا نہیں کہ اس کی بنا پر شیعوں کو تخریبی مقاصد کی کوئی خُفیہ پارٹی سمجھ لیا جائے، جیساکہ شیعوں کے بعض وہ غیر محتاط دشمن چاہتے ہیں جو صحیح بات کو سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ (ہم غیر محتاط شیعوں سے بھی کہیں گے کہ)

اقوالِ غیر جو پئے اسلام ہیں مُضر
اپنی زباں سے ان کی حکایت نہ کیجیے

اِسی طرح تقیہّ کے یہ بھی معنیٰ نہیں کہ اس کی وجہ سے دین اور اس کے احکام ایسا راز بن جائیں جسے شیعہ مذہب کو نہ

ماننے والوں کے سامنے ظاہر نہ کیا جا سکے ۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ شیعہ علماء کی تصانیف خصوصاً ان کی فِقہ، احکام عقائد اور علمِ کلام سے متعلق کتابیں مشرق و مغرب میں ہر جگہ اتنی تعداد میں پھیلی ہوئی ہیں کہ اس سے زیادہ تعداد کی کسی مذہب کے ماننے والوں سے توقع نہیں کی جا سکتی ۔"

اب آپ خود دیکھ لیجیے کہ دشمنوں کے خیال کے برخلاف یہاں نہ نفاق ہے نہ مکر و فریب ، نہ دھوکا ہے نہ جھوٹ !

مُتعہ : مُعیّنہ مدّت کا نکاح

جس طرح تمام مسلمان فقہوں میں نکاح کے لیے یہ شرط ہے کہ لڑکی اور لڑکے کی طرف سے ایجاب و قبول کیا جائے اور مہر معین کیا جائے ، اسی طرح سے مُتعہ میں بھی مہر کو معین کیا جانا ضروری ہے ۔ نیز طرفین کی طرف سے ایجاب و قبول بھی شرط ہے ، مثلاً :

لڑکی لڑکے سے کہے : زَوَّجتُكَ نَفسِي بِمَهرٍ قَدرُہٗ كَذَا وَ لِمُدَّةٍ كَذَا .[1]

اِس پر لڑکا کہے : قَبِلتُ یا کہے : رَضِيتُ .

شریعتِ اسلام میں عام طور سے جتنی شرطیں نکاح کے لیے مقرر کی گئی ہیں کم و بیش وہ تمام شرطیں مُتعہ کے لیے بھی مقرر کی گئی ہیں ۔ مثلاً جس طرح محرم سے (یا ایک ہی وقت میں دو بہنوں سے) نکاح نہیں ہو سکتا اسی طرح مُتعہ بھی نہیں ہو سکتا (اور جس طرح بعض فقہاء کے نزدیک اہلِ کتاب سے نکاح جائز ہے اسی طرح مُتعہ بھی جائز ہے) اور جس طرح نکاح کے بعد طلاق ہو جانے پر منکوحہ کے لیے عِدّت ضروری ہے جس کے بعد ہی وہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے اسی طرح مَمتُوعَہ بھی مُتعہ کے بعد

---

[1] كَذَا وَ كَذَا کی بجائے مہر کی رقم اور مُتعہ کی مُدّت بولے ۔

عِدّت میں بیٹھتی ہے اور عِدّت پوری کرنے کے بعد ہی دوسرا مُتعہ یا نکاح کرسکتی ہے۔ مَمتُوعَہ کی عِدّت دو طُہر (یا پینتالیس[۴۵] دن) ہے لیکن شوہر کے مرجانے کی صورت میں یہ مُدّت چار ماہ دس دن ہے۔

مُتعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ نفقہ ہے نہ میراث، اس لیے مُتعہ کرنے والے مرد اور عورت ایک دوسرے سے میراث نہیں پاتے۔

مُتعہ سے پیدا ہونے والے بچے نکاح سے پیدا ہونے والے بچّوں کی طرح حلال ہوتے ہیں اور انھیں عام بچّوں کی طرح میراث اور نفقہ (روٹی، کپڑا، مکان، دوا دارو وغیرہ) کے تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں اور ان کا نسب اپنے باپ سے چلتا ہے۔

یہ ہیں مُتعہ کی شرائط اور حُدود۔ اس کا حرام کاری سے دُور کا بھی تعلّق نہیں، جیسا کہ بعض غلط الزام لگانے والے اور بیجا شور مچانے والے سمجھتے ہیں۔

اپنے شیعہ بھائیوں کی طرح اہلِ سُنّت والجماعت کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ نساء کی آیت ۲۴ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مُتعہ کی تشریع کی گئی ہے آیت یہ ہے:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا.

پس جن عورتوں سے تم نے مُتعہ کیا ہے تو انھیں جو مہر مقرر کیا ہے دے دو اور مہر کے مقرر ہونے کے بعد اگر آپس میں (کم و بیش پر) راضی ہوجاؤ تو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں بیشک خدا ہر چیز سے واقف اور مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

اسی طرح اس پر بھی شیعہ اور سُنّی دونوں کا اتفاق ہے کہ رسول اللہؐ نے مُتعہ کی اجازت دی تھی اور صحابہ نے عہدِ نبوی میں مُتعہ کیا تھا۔

اختلاف صرف اس پر ہے کہ کیا مُتعہ کا حکم منسوخ ہوگیا یا اب بھی باقی ہے۔ اہلِ سُنّت اس کے منسوخ ہوجانے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلے مُتعہ حلال تھا پھر حرام کردیا گیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نسخ حدیث سے ہوا ہے قرآن سے نہیں۔

اس کے برخلاف شیعہ کہتے ہیں کہ متعہ منسوخ ہی نہیں ہوا۔ یہ قیامت تک جائز رہے گا۔

فریقین کے اقوال پر ایک نظر ڈالنے سے حقیقت واضح ہو جائے گی اور قارئینِ باتمکین کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ تعصّب اور جذبات سے بالاتر ہو کر حق کا اتباع کر سکیں۔

شیعہ جو یہ کہتے ہیں کہ متعہ منسوخ نہیں ہوا اور یہ قیامت تک جائز رہے گا اس کے متعلق ان کی اپنی دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ ص نے کبھی متعہ سے منع کیا ہو۔

اس کے علاوہ ہمارے ائمہؑ جو عترتِ طاہرہ سے ہیں اس کے حلال اور جائز ہونے کے قائل ہیں۔ اگر متعہ منسوخ ہو گیا ہوتا تو ائمۂ اہلِ بیت کو اور خصوصاً امام علیؑ کو ضرور اس کا علم ہوتا کیونکہ گھر کا حال گھر والوں سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔!

ہمارے نزدیک جو بات ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ عمر بن خطّاب نے اپنے عہدِ خلافت میں اسے حرام قرار دیا تھا، لیکن یہ ان کا اپنا اجتہاد تھا۔ اس بات کو علمائے اہلِ سُنّت بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو عمر بن خطاب کی رائے اور اجتہاد کی بنا پر نہیں چھوڑ سکتے۔

یہ ہے متعہ کے بارے میں شیعوں کی رائے کا خلاصہ، جو بظاہر بالکل درست اور صحیح ہے۔ کیونکہ سب مسلمان اللہ اور اس کے رسول ص کے احکام کی پیروی کرنے کے مکلّف ہیں، کسی اور کی رائے کی نہیں، خواہ اس کا رتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو خصوصاً اگر اس کا اجتہاد قرآن و حدیث کے نصوص کے خلاف ہو۔

اس کے برعکس، اہلِ سُنّت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ متعہ پہلے حلال تھا، اس کے متعلق قرآن میں آیت بھی آئی تھی، رسول اللہ ص نے اس کی اجازت بھی دی تھی، صحابہ نے اس پر عمل بھی کیا تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ کس نے منسوخ کیا، اس میں اختلاف ہے:

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی وفات

سے قبل منسوخ کردیا تھا۔[1]

کچھ کا کہنا ہے کہ عُمر بن خطّاب نے مُتعہ کو حرام کیا اور ان کا حرام کرنا ہمارے لیے حُجّت ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے کہ

"میری سُنّت اور میرے بعد آنے والے خلفائے راشدین کی سنت پر چلو اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔"

اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مُتعہ اس لیے حرام ہے کہ عُمر بن خطّاب نے اسے حرام کیا تھا اور سُنّتِ عمر کی پابندی اور پاسداری ضروری ہے، تو ایسے لوگوں سے تو کوئی گفتگو اور بحث بیکار ہے، کیونکہ ان کا یہ قول محض تعصّب اور تکلفِ بے جا ہے، ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی مسلمان اللہ اور رسولؐ کا قول چھوڑ کر اور ان کی مخالفت کرکے کسی ایسے مجتہد کی رائے پر چلنے لگے جس کی رائے بنا بر بشریت صحیح کم ہوتی ہے اور غلط زیادہ۔ یہ صورت بھی اس وقت ہے جب اجتہاد کسی ایسے مسئلے میں ہو جس کے بارے میں قرآن وسُنّت میں کوئی تصریح نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی تصریح موجود ہو تو پھر حکمِ خداوندی یہ ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کردیں تو پھر اس بات میں کسی مؤمن مرد اور کسی مؤمن عورت کو کوئی اختیار نہیں۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ بالکل گمراہ ہوگیا۔ (سورۂ احزاب - آیت ۳۶)

جسے اس قاعدہ پر مجھ سے اتفاق نہ ہو، اس کے لیے اسلامی قوانین کے

---

[1] یہ بات وثوق سے معلوم نہیں کہ رسول اللہؐ نے کب منسوخ کیا تھا: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ روزِ خیبر اور کچھ کہتے ہیں کہ روزِ فتح مکہ اور کچھ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں اور کچھ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں اور کچھ کہتے ہیں عُمرۃ القضا میں رسول اللہؐ نے اسے منسوخ کیا تھا۔ (ناشر)

بارے میں اپنی معلومات پر نظر ثانی کرنی اور قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنا ضروری ہے کیونکہ قرآن خود مذکورہ بالا آیت میں بتلاتا ہے کہ جو قرآن وسُنّت کو حُجت نہیں مانتا وہ کافر اور گمراہ ہے۔ اور ایک اسی آیت پر کیا موقوف ہے قرآن میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں۔

اسی طرح اس بارے میں احادیث بھی بہت ہیں، ہم صرف ایک حدیث نبوی پر اکتفا کریں گے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا:

"جس چیز کو محمدؐ نے حلال کیا وہ قیامت تک کے لیے حلال ہے اور جس چیز کو محمدؐ نے حرام کیا وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے۔"

اِس لیے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی ایسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں فیصلہ کرے جس کے متعلق اللہ یا اس کے رسول کا حکم موجود ہو ؎

تکمیلِ دین کے بعد نہ ترمیم سوچیے
بندہ نواز! آپ رسالت نہ کیجیے

اِس سب کے باوجود بھی جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ مان لیں کہ خلفائے راشدین کے افعال واقوال اور ان کے اجتہادات پر عمل ہمارے لیے ضروری ہے، ہم ان سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ:

"کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حُجّت کرتے ہو؟ وہ تو ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔ اور ہم تو اسی کے لیے خالص ہیں۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۳۹)

لہذا ہماری بحث کا تعلق صرف اس گروہ سے ہے جو یہ کہتا ہے کہ رسول اللہؐ نے خود متعہ کو حرام قرار دیا تھا اور یہ کہ قرآن کا حکم حدیث سے منسوخ ہوگیا[1]

---

[1] واضح رہے کہ حدیث سے قرآن کا حکم منسوخ نہیں ہوتا کیونکہ قانون سازی انبیاء کا کام نہیں ہے، ان کا کام تو بس یہ ہے کہ اللہ کے بنائے ہوئے قانون اس کے بندوں تک پہنچا دیں وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (ناشر)

مگر ان لوگوں کے اقوال میں بھی تضاد ہے اور ان کی دلیل کی کوئی مضبوط بُنیاد نہیں۔ اگرچہ مُمانعت کی روایت صحیح مسلم میں آئی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خود رسول اللہ ؐ نے مُتعہ کی ممانعت فرما دی تھی تو اس کا علم ان صحابہ کو کیوں نہیں ہوا جنھوں نے عہدِ ابُوبکر میں اور عہدِ عُمر کے اَوائل میں مُتعہ کیا، جیسا کہ اس کی روایت خود صحیح مسلم میں ہے [1]:

عطاء کہتے ہیں کہ جابر بن عبداللہ انصاری عُمرہ کے لیے آئے تو ہم ان کی قیام گاہ پر گئے۔ لوگ ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھتے رہے۔ پھر مُتعہ کا ذکر چھڑ گیا۔ جابر نے کہا: ہاں ہم نے رسول اللہ ؐ کے زمانے میں بھی مُتعہ کیا ہے [2] اور ابوبکر اور عُمر کے عہد میں بھی۔

اگر رسول اللہ ؐ مُتعہ کی مُمانعت کر چکے ہوتے تو پھر ابوبکر اور عُمر کے زمانے میں صحابہ کے لیے مُتعہ کرنا جائز نہ ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ؐ نے نہ مُتعہ کی ممانعت کی تھی اور نہ اسے حرام قرار دیا تھا۔ مُمانعَت تو عُمر بن خطّاب نے کی۔ جیسا کہ صحیح بُخاری میں آیا ہے:

ابُو رجاء نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ ابن حصین رَضِیَ اللہُ عَنہُ کہتے ہیں کہ مُتعہ کی آیت کتابُ اللہ میں نازل ہوئی تھی چنانچہ ہم نے اس وقت مُتعہ کیا جب ہم رسول اللہ ؐ کے ساتھ تھے۔ قرآن میں کبھی مُتعہ کی حرمت نازل نہیں ہوئی، اور نہ رسول اللہ ؐ نے اپنی وفات تک مُتعہ سے منع کیا۔ اس کے بعد ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کہا۔

محمّد کہتے ہیں کہ لوگ یہ کہتے تھے کہ ایک شخص سے مراد عُمر

---

[1] صحیح مسلم جلد ۴ صفحہ ۱۵۸۔

[2] مثلاً زبیر بن العوام نے حضرت ابوبکر کی بیٹی اسماء سے مُتعہ کیا تھا۔ اس متعہ کے نتیجے میں عبداللہ بن زبیر اور عُروہ بن زبیر پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ امامِ اہلسنت راغب اصفہانی نے محاضرات الادباء میں لکھا ہے۔ (ناشر)

ہیں۔[1]

اب دیکھیے! رسول اللہ ص نے اپنی وفات تک مُتعہ سے منع نہیں کیا۔جیساکہ یہ صحابی تصریح کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ نہایت صاف الفاظ میں اور بغیر کسی ابہام کے مُتعہ کی حُرمت کو عمرؓ سے منسوب کرتے ہیں۔اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عمرُ نے جو کچھ کہا اپنی رائے سے کہا۔

اور دیکھیے:

جابر بن عبداللہ انصاری صاف کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ص کے زمانے میں اور ابوبکر کے عہدِ خلافت میں ایک مٹھی کھجور یا ایک مٹھی آٹے کے عِوَض مُتعہ کیا کرتے تھے۔ آخر عُمرُ نے عَمرو بن حُرَیث کے قصّے میں اس کی مُمانعت کردی۔[2]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چند دوسرے صحابہ بھی حضرت عُمرؓ کی رائے سے متفق تھے لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔بعض صحابہ تو اس وقت بھی عُمرؓ کے ساتھ تھے جب انھوں نے رسول اللہ ص پر ہذیان گوئی کی تُہمت لگائی تھی اور کہا تھا کہ ہمارے لیے کتابِ خدا کافی ہے۔

اور سُنیے!

ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں جابر کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا: ابنِ عبّاس اور ابنِ زُبیر کے درمیان مُتعتَین کے بارے میں اختلاف ہوگیا ہے۔اس پر جابر نے کہا: ہم نے رسول اللہ ص کے زمانے میں دونوں مُتعے کیے ہیں، بعد میں عُمرُ نے ہمیں منع کردیا تو پھر ہم نے کوئی مُتعہ نہیں کیا۔[3]

اس لیے ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ بعض صحابہ نے جو مُتعہ کی

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۵ صفحہ ۱۵۸

[2] و [3] صحیح مُسلم جلد ۴ صفحہ ۱۳۱

ممانعت رسول اللہ ص سے منسوب کی ہے اس کا مقصد محض عمر کی رائے کی تصویب اور تائید تھا۔ ورنہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ رسول اللہ ص کسی ایسی چیز کو حرام قرار دیں جسے قرآن نے حلال ٹھہرایا ہو۔ تمام اسلامی احکام میں ہمیں ایک بھی ایسا حکم معلوم نہیں کہ اللہ جلّ شانہ، نے کسی چیز کو حلال کیا ہو اور رسول اللہ ص نے اسے حرام کردیا ہو۔ اس کا کوئی قائل بھی نہیں۔ البتہ معاند اور متعصّب کی بات اور ہے۔

اگر ہم برائے بحث یہ مان بھی لیں کہ رسول اللہ ص نے مُتعہ کی ممانعت فرمادی تھی، تو امام علی ع کو کیا ہوگیا تھا کہ انھوں نے نبی اکرم ص کے خاص مقرّب ہونے کے باوجود اور اسلامی احکام کی سب سے زیادہ واقفیت رکھنے کے باوصف فرمادیا کہ

"مُتعہ تو اللہ کی رحمت اور بندوں پر اس کا خاص احسان ہے
اگر عمر اس کی ممانعت نہ کردیتے تو کوئی بدبخت ہی زنا کرتا۔"[1]

اس کے علاوہ خود عمر بن خطّاب نے بھی یہ نہیں کہا کہ رسول اللہ ص نے مُتعہ کی ممانعت کردی تھی بلکہ صاف صاف یہ کہا تھا کہ

مُتْعَتَانِ کَانَتَا عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ص وَاَنَا اَنْهٰی عَنْهُمَا وَاُعَاقِبُ عَلَيْهِمَا : مُتْعَةُ الْحَجِّ وَ مُتْعَةُ النِّسَاءِ۔

دو مُتعے رسول اللہ ص کے زمانے میں تھے، اب میں ان کی مُمانعت کرتا ہوں اور جو یہ مُتعے کرے گا اسے سزا دوں گا۔ ان میں ایک مُتعۂ حج ہے اور دوسرا عورتوں کے ساتھ مُتعہ ہے۔[2]

حضرت عمر کا یہ قول مشہور ہے۔

مسند امام احمد بن حنبل اس بات کی بہترین گواہ ہے کہ اہلِ سُنت والجماعت میں مُتعہ کے بارے میں سخت اختلاف ہے: کچھ لوگ رسول اللہ ص کا اتباع کرتے ہوئے اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں اور کچھ لوگ عمر بن خطاب کی پیروی میں اسے

---

[1] تفسیر ثعلبی - تفسیر طبری -
[2] فخر الدین رازی، تفسیر کبیر فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ کی تفسیر کے ذیل میں -

حرام کہتے ہیں۔ امام احمد نے روایت کی ہے :

ابنِ عبّاس بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ انھوں نے کہہ دیا کہ رسول اللہؐ نے مُتعہ کرنے کو کہا ہے، تو عُروہ بن زُبیر نے کہا : مُتعہ سے تو ابوبکر اور عُمر نے منع کر دیا تھا۔ ابن عبّاس بولے : یہ عُروہ کا بچّہ کیا کہتا ہے ؟ کسی نے کہا : یہ کہتے ہیں کہ ابوبکر اور عُمر نے مُتعہ سے منع کر دیا تھا۔ ابن عبّاس نے کہا : مجھے تو ایسا نظر آرہا ہے کہ یہ لوگ جلد ہی ہلاک ہوجائیں گے۔ میں کہتا ہوں :

رسول اللہؐ نے کہا۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ابوبکر اور عُمر نے منع کر دیا۔ [1]

جامع ترمذی میں ہے کہ

عبداللہ بن عُمر سے حج کے مُتعہ کے بارے میں کسی نے سوال کیا تو انھوں نے کہا : جائز ہے۔ پوچھنے والے کہا : آپ کے والد نے تو اس سے منع کیا تھا۔ ابنِ عُمر نے کہا : تمھارا کیا خیال ہے، اگر میرے والد تمتّع سے منع کریں اور رسول اللہؐ نے خود تمتّع کیا ہو تو میں اپنے والد کی پیروی کروں یا رسول اللہؐ کے حکم کی ؟ اس نے کہا : ظاہر ہے، رسول اللہؐ کے حکم کی۔ [2]

اہلِ سُنّت والجماعت نے عورتوں کے مُتعہ کے بارے میں تو عُمر کی بات مان لی لیکن مُتعۂ حج کے بارے میں ان کی بات نہ مانی۔ حالانکہ عُمر نے ان دونوں سے ایک ہی موقع پر منع کیا تھا، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اس پورے قصّے میں اہم بات یہ ہے کہ ائمّہ اہلِ بیت اور ان کے شیعوں نے عُمر کی بات کو غلط بتایا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ دونوں مُتعے قیامت تک حلال اور جائز رہیں گے۔ کچھ علمائے اہلِ سُنّت نے بھی اس بارے میں ائمّۂ اہلِ بیت

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۳۳۷

[2] جامع ترمذی جلد اول صفحہ ۱۵۷

کا اتباع کیا ہے۔ میں ان میں سے تیونس کے مشہور عالم اور زیتونہ یونیورسٹی کے سربراہ شیخ طاہر بن عاشور رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کروں گا۔ انھوں نے اپنی مشہور تفسیر التحریر والتنویر میں آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ کی تفسیر کے ذیل میں مُتعہ کو حلال کہا ہے[1]

علماء کو اسی طرح اپنے عقیدے میں آزاد ہونا چاہیے اور جذبات اور عصبیت سے مُتاثر نہیں ہونا چاہیے اور نہ کسی کی مخالفت کی پروا کرنی چاہیے۔

اِس معاملے میں فیصلہ کُن اور ناقابلِ تردید دلائل شیعوں کی تائید میں موجود ہیں جن کے سامنے انصاف پسند اور ضدی طبیعت دونوں کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے

اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْهِ.

حق ہی غالب رہتا ہے، کوئی اسے مغلوب نہیں کر سکتا!

مسلمانوں کو تو امام علیؑ کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ

"مُتعہ رحمت ہے اور یہ اللہ کا احسان ہے جو اس نے اپنے بندوں پر کیا ہے۔"

اور واقعی اس سے بڑی رحمت کیا ہو سکتی ہے کہ مُتعہ شہوت کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بُجھاتا ہے جو کبھی کبھی انسان کو مرد ہو یا عورت اِس طرح بے بس کر دیتی ہے کہ وہ درندہ بن جاتا ہے۔ کتنے ہی عورتوں کو مرد اپنی شہوت کی آگ بجھانے کے بعد قتل کر دیتے ہیں!!

مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ سُبحانہٗ نے زانی اور زانیہ کے لیے اگر شادی شدہ ہوں تو سنگسار کیے جانے کی سزا مقرر کی ہے، اس لیے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی رحمت سے محروم رکھے جبکہ اسی نے ان کو اور ان کی فطری خواہشات کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ان کی بہتری کس چیز میں ہے۔

جب خدائے غَفُورُ الرحیم نے اپنے بندوں کو اپنے فضل و کرم سے مُتعہ کی اجازت

---

[1] التحریر والتنویر جلد ۳ صفحہ ۵۔

دے دی ہے تو اب زنا وہی کرے گا جو بالکل ہی بدبخت ہوگا۔ یہی صورت چوری کی ہے۔ چور کی سزا قطعِ ید ہے لیکن اگر مفلسوں اور محتاجوں کے لیے بیتُ المال موجود ہے تو کوئی بدبخت ہی چوری کرے گا۔

الٰہی! میں معافی کا طلبگار ہوں اور توبہ کرتا ہوں کیونکہ میں نوجوانی میں دینِ اسلام سے سخت خفا تھا اور اپنے دل میں کہتا تھا کہ "اسلام کے احکام بہت سخت اور ظالمانہ ہیں جو مرد عورت دونوں کے لیے جنسی عمل پر سزائے موت تجویز کرتے ہیں، حالانکہ ہوسکتا ہے کہ یہ جنسی عمل طرفین کی ایک دوسرے سے محبت کا نتیجہ ہو۔ پھر سزائے موت بھی کیسی؟ بدترین موت! سنگسار کرنے کی سزا! اور وہ بھی مجمع عام میں کہ کُل عالم دیکھے۔"

اِس طرح کا احساس اکثر مسلمان نوجوانوں میں پایا جاتا ہے، خصوصاً آجکل کے زمانے میں، جبکہ مخلوط سوسائٹی، بے پردگی اور بے ہودہ طور طریقوں کی وجہ سے ان نوجوانوں کی لڑکیوں سے مُڈبھیڑ ہوتی ہے، اسکول کالج میں، سڑک پر اور ہر جگہ۔

یہ کوئی معقول بات نہیں ہوگی اگر ہم ایسے مُسلمان کا موازنہ جس نے قدیم طرز کے اسلامی مُعاشرے میں تربیت پائی ہو اس مسلمان سے کریں جو نسبتاً ترقی یافتہ ملک میں رہتا ہو جہاں ہر معاملے میں مغرب کی تقلید کی جاتی ہو۔

اکثر نوجوانوں کی طرح میری بھی جوانی مغربی تہذیب اور دین کے درمیان یا یُوں کہہ لیجیے کہ جنسی جبلت اور خواہش اور خوفِ خُدا و آخرت کے درمیان مستقل اور دائمی کشمکش میں گزری ہے۔ ہمارے ملکوں میں خوفِ خدا ہی رہ گیا ہے، زِنا کی دُنیوی سزا تو غائب ہوچکی ہے اس لیے مسلمان صرف اپنے ضمیر کو جواب دِہ ہے۔ اب یا تو وہ گھٹن میں وقت گزارے جس سے ایسے نفسیاتی امراض کا اندیشہ ہوتا ہے جو خطرناک ہوسکتے ہیں یا پھر اپنے آپ کو اور اپنے پروردگار کو دھوکا دیکر وقتاً فوقتاً بدکاری کے گڑھے میں گرتا رہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی شریعت کے اَسرار جب ہی میری سمجھ میں آئے جب مجھے تشیّع سے واقفیت ہوئی۔

میں نے شیعہ عقائد کو ایک رحمت جانا اور ان عقائد میں سماجی، اقتصادی، اور سیاسی مشکلات کا حل پایا۔ ان ہی عقائد کے ذریعے سے مجھے معلوم ہوا کہ اللہ کے دین میں آسانی ہی آسانی ہے، مشکل کا نام نہیں۔ اللہ نے ہمارے لیے دین میں تنگی نہیں رکھی۔ اِمامت رحمت ہے۔ عِصمتِ ائمہؑ کا عقیدہ رحمت ہے۔ بَدَاء رحمت ہے۔ قضا و قَدَر سے متعلق شیعہ جو کچھ کہتے ہیں رحمت ہے۔ تقیّہ رحمت ہے۔ نکاحِ مُتعہ رحمت ہے۔ مختصر بات یہ کہ یہ سب کچھ وہ حق ہے جس کی تعلیم خاتمُ النبییّن حضرت محمدؐ بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی جو رَحمۃٌ لِّلعَالَمین بنا کر بھیجے گئے تھے۔

مسئلۂ تحریفِ قرآن

یہ کہنا کہ "قرآن میں تحریف ہوئی ہے" بذاتِ خود ایسی شرمناک بات ہے، جسے کوئی مسلمان جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتا ہو خواہ شیعہ ہو یا سُنّی، برداشت نہیں کرسکتا۔

قرآن کی حفاظت کا ذمّہ دار خود ربّ العزت ہے جس نے کہا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ.

"ہم نے ہی یہ قرآن اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

اس لیے کسی شخص کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ قرآن میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی کرسکے۔ یہ ہمارے نبیِؐ مُحتشَم کا غیرفانی معجزہ ہے۔ قرآن میں باطل کا کسی طرف سے دخل نہیں ہوسکتا، نہ آگے سے نہ پیچھے سے، کیونکہ یہ خدائے حَکیم و حَمید کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

اس کے علاوہ، مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عملی طور پر قرآن میں تحریف کا ہونا ممکن ہی نہیں تھا، کیونکہ بہت سے صحابہ کو قرآن زبانی یاد تھا۔ مسلمان شروع ہی سے قرآن کو خود حفظ کرنے اور اپنے بچّوں کو حفظ کرانے میں ایک دوسرے سے

بڑھ چڑھ کر کوشش کرتے رہے ہیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس لیے کسی فرد گروہ یا حکومت کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ قرآن میں تحریف کرے یا قرآن کو بدل دے۔

اگر ہم مشرق، مغرب، شمال، جنوب ہر طرف اسلامی ممالک میں گھوم پھر کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ساری دنیا میں بغیر ایک حرف کی کمی بیشی کے وہی ایک قرآن ہے۔ اگرچہ مسلمان خود مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن قرآن وہ واحد محرک ہے جو انھیں اکٹھا رکھے ہوئے ہے۔ خود قرآن میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ جہاں تک اس کی تفسیر یا تاویل کا تعلق ہے، ہر فرقے کی اپنی تفسیر ہے جس پر وہ نازاں اور مطمئن ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ شیعہ تحریف کے قائل ہیں، یہ محض شیعوں پر بہتان ہے۔ شیعہ عقائد میں اس قسم کی کسی بات کا وجود نہیں۔

اگر ہم قرآنِ کریم کے بارے میں شیعہ عقیدے کے متعلق پڑھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ شیعوں کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن پاک ہر طرح کی تحریف سے پاک ہے۔ عَقائدِ الاِمامِیہ کے مؤلّف شیخ مظفرؒ کہتے ہیں:

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے جو نبی اکرمؐ پر نازل ہوئی اور ان کی زبان سے ادا ہوئی۔ اس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔ قرآن آپؐ کا لافانی معجزہ ہے۔ انسان اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے، وہ نہ فصاحت و بلاغت میں اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ وہ ایسے حقائق و معارف بیان کر سکتا ہے جیسے قرآن میں موجود ہیں۔ اس میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہو سکتی۔

یہ قرآن جو ہمارے پاس موجود ہے اور جس کی ہم تلاوت کرتے ہیں، بعینہٖ وہی قرآن ہے جو رسولِ اکرمؐ پر نازل ہوا۔ جو شخص اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے وہ گمراہ ہے یا اس کو غلط فہمی ہوتی ہے بہرحال وہ صحیح راستے پر نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک اللہ کا کلام ہے، باطل اس میں دخل انداز نہیں ہو سکتا، نہ آگے سے نہ پیچھے سے۔"

اس کے علاوہ یہ معلوم ہے کہ شیعہ کہاں کہاں آباد ہیں، ان کے فقہی احکام بھی معلوم ہیں۔ اگر شیعوں کا کوئی اور قرآن ہوتا تو لوگوں کو ضرور اس کا پتہ چل گیا ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی مرتبہ ایک شیعہ ملک میں گیا تو میرے دماغ میں اس قسم کی کچھ افواہیں تھیں۔ جہاں کہیں مجھے کوئی موٹی سی کتاب نظر آتی، میں اس کو اس خیال سے اٹھالیتا کہ یہ شاید شیعوں کا نام نہاد قرآن ہو۔ لیکن جلد ہی میرا یہ خیالِ خام بھاپ بن کر ہوا میں اُڑ گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ محض جھوٹا الزام ہے جو شیعوں پر اس لیے لگایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو ان سے نفرت ہو جائے۔ لیکن بہرحال ایک قابلِ اعتراض کتاب ضرور موجود ہے اور اس کی وجہ سے شیعوں پر ہمیشہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے : فَصْلُ الْخِطَابِ فِیْ اِثْبَاتِ تَحْرِیْفِ کِتَابِ رَبِّ الْاَرْبَابِ ۔ اِس کے مؤلف کا نام محمد تقی نوری طبرسی (متوفی ۱۳۲۰ھ) ہے۔ یہ شخص شیعہ تھا۔ معترضین یہ چاہتے ہیں کہ اِس کتاب کی ذمّہ داری شیعوں پر ڈال دی جائے۔ لیکن یہ بات بعید از انصاف ہے۔

کتنی ہی ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جو صرف اپنے مُصنّف یا مؤلف کے سوا کسی کی رائے کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ ان کتابوں میں ہر قسم کی کچی پکی باتیں اور غلط صحیح مضامین ہوتے ہیں۔ اور یہ کوئی شیعوں کی خصوصیت نہیں، سب فرقوں میں اس قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ الزام تو اہلِ سُنت پر زیادہ چسپاں ہوتا ہے[1]۔ اب کیا یہ درست ہوگا کہ ہم قرآن اور زمانۂ جاہلیت کے اشعار سے متعلق مصر کے سابق وزیرِ تعلیم عَمِیْدُ الْاَدَبِ الْعَرَبِی ڈاکٹر طٰہٰ حُسین کی تحریروں کی ذمّہ داری اہلِ سُنّت پر ڈال دیں؟

یا قرآن میں کمی بیشی سے متعلّق ان روایات کی ذمّہ داری جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں اہلِ سُنّت پر ڈال دیں؟

اِس سلسلے میں جامع ازہر کے شریعت کالج کے پرنسپل پروفیسر مَدَنی نے بڑی

---

[1] فَصْلُ الْخِطَاب کی تو شیعوں کے یہاں کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ سُنّیوں کے یہاں قرآن میں کمی بیشی کی روایات ان کی معتبر ترین کتابوں بُخاری، مُسلم وغیرہ میں موجود ہیں۔

اچھی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"یہ کہنا کہ شیعہ امامیہ اس کے قائل ہیں کہ موجود قرآن میں مَعَاذَاللہ کچھ کمی ہے، تو یہ نہایت لغو بات ہے۔ ان کی کتابوں میں کچھ ایسی روایات ضرور ہیں لیکن ایسی روایات تو ہماری کتابوں میں بھی ہیں۔ مگر فریقین کے اہلِ تحقیق نے ان روایات کو ناقابلِ اعتبار اور وضعی کہا ہے۔ جس طرح اہلِ سُنّت میں کوئی قرآن مجید میں کمی بیشی کا قائل نہیں اسی طرح اثناعشری شیعوں اور زیدی شیعوں میں بھی کوئی اس کا قائل نہیں۔"

جو کوئی اس طرح کی روایات دیکھنا چاہے وہ سُیوطی کی الاِتقان فی عُلوم القرآن میں دیکھ سکتا ہے۔

۱۴۹۸ھ؁ میں ایک مصری نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام اَلْفُرقان ہے اس کتاب میں اس نے اس قسم کی بہت سی موضوع اور ناقابلِ اعتبار روایات سُنّیوں کی کتابوں سے نقل کی ہیں۔ جامعہ ازہر نے اس کتاب کی روایات کے بطلان اور فساد کو علمی دلائل سے ثابت کرنے کے بعد حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب کو ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ حکومتِ مصر نے یہ مُطالبہ منظور کر کے کتاب کو ضبط کر لیا۔ کتاب کے مُصنّف نے معاوضے کے لیے دعوٰی دائر کیا لیکن کونسل آف اسٹیٹ کی عدالتی کمیٹی نے یہ دعوٰی مسترد کر دیا۔

کیا ایسی کتابوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ سُنّت قرآن کے تقدس کے مُنکر ہیں یا چونکہ فلاں شخص نے ایسی روایت بیان کی ہے یا ایسی کتاب لکھی ہے اس لیے اہلِ سُنّت قرآن میں نقص کے قائل ہیں؟

یہی صورت شیعہ امامیہ کے ساتھ ہے۔ جس طرح ہماری بعض کتابوں میں کچھ روایات ہیں، اسی طرح ان کی بعض کتابوں میں بھی کچھ روایات ہیں۔ اس بارے میں علامہ شیخ ابُوالفضل بن حَسَن طبرسی جو چھٹی صدی ہجری کے بہت بڑے شیعہ عالم تھے اپنی کتاب مجمعُ البیان فِی تفسیرِ القرآن میں لکھتے ہیں :

اِس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ قرآن میں کوئی زیادتی نہیں

ہوئی۔ جہاں تک کمی کا تعلّق ہے، تو ہمارے ایک گروہ کا اور اہلِ سُنّت میں سے حشویّہ کا یہ کہنا ہے کہ قرآن میں کمی ہوئی ہے لیکن ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب اس کے خلاف ہے۔ اسی کی تائید سیّد مرتضیٰ علم الہدیٰ رح (۴۳۶ھ) نے کی ہے اور اس مسئلہ پر بڑی تفصیل کے ساتھ مسائل الطرابلسیات کے جواب میں کئی جگہ روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"یہ قرآن بالکل صحیح نقل ہوتا چلا آیا ہے، اس کا ہمیں ایسا ہی یقین ہے جیساکہ مختلف ملکوں کے وجود کا یقین، بڑے بڑے واقعات کا یقین، مشہور کتابوں کا یقین اور عربوں کے اشعار کا یقین۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن کی نقل میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ متعدد وجوہ سے یہ ضروری تھا کہ قرآن کو نقل کرتے ہوئے اس کی حفاظت اور نگرانی پر خاص توجہ دی جائے، کیونکہ قرآن رسول اللہؐ کا معجزہ ہے اور علومِ شرعیہ اور احکامِ دینیہ کا مأخذ ہے۔ مسلمان علماء نے قرآن شریف کی حفاظت اور حمایت میں انتہائی کوشش صرف کی ہے۔ انھیں ہر اختلافی معاملے کا مکمل علم ہے: جیسے اِعراب کا اختلاف، مختلف قرائتیں، قرآن شریف کے حروف اور آیات کی تعداد۔ ان تمام اُمور پر اس قدر دل و جان سے توجّہ اور احتیاط کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن کے کسی حصّے کو بدل دیا جائے یا حذف کر دیا جائے"۔[1]

ہم ذیل میں کچھ روایات پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام! آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ قرآن میں کمی بیشی کی تُہمت اہلِ سُنّت پر زیادہ چسپاں ہوتی ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اہلِ سُنّت کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی کمزوری کو دوسروں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنے تمام عقائد پر نظرِ ثانی

---

[1] رسالہ الاسلام شمارہ ۴ جلد ۱۱ میں پروفیسر محمد مدنی پرنسپل شریعت کالج جامعۂ ازہر کا مقالہ۔

کرنی پڑی، کیونکہ میں جب بھی کسی بات پر شیعوں پر نکتہ چینی یا اعتراض کرتا تھا شیعہ یہ ثابت کر دیتے تھے کہ یہ کمزوری ان میں نہیں بلکہ اہلِ سُنّت میں ہے اور مجھے جلد معلوم ہو جاتا کہ شیعہ سچ کہتے ہیں۔ وقت گزرنے اور بحث و مُباحثہ کے نتیجے میں بحمدللہ مجھے اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ شاید آپ کو بھی یہ معلوم کرنے کا شوق ہو کہ اہلِ سُنّت کی اپنی کتابوں سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ سُنّت قرآن میں تحریف اور کمی زیادتی کے قائل ہیں۔ تو لیجیے سُنیے :

طبرانی اور بیہقی کی روایت ہے کہ قرآن میں دو سورتیں ہیں :

ایک یہ ہے :

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُثْنِيْ عَلَيْكَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ.

دوسری سورت یہ ہے :

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ نَرْجُوْ رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكَافِرِيْنَ مُلْحِقٌ.

ان دونوں سورتوں کو ابوالقاسم حُسین بن محمد المعروف بہ راغب اصفہانی (۵۰۲ھ) نے محاضرات الادباء میں قنوت کی سورتیں کہا ہے۔ سیّدنا عُمر بن خطّاب ان ہی سورتوں کو دُعائے قنوت کے طور پر پڑھتے تھے۔ یہ دونوں سورتیں ابنِ عباس کے مُصحف اور زید بن ثابت کے مُصحف میں موجود تھیں [1]

امام احمد بن حنبل شیبانی (۲۴۱ھ) نے اپنی مُسند میں اُبیّ بن کعب سے روایت بیان کی ہے کہ

اُبیّ بن کعب نے پوچھا کہ سورۂ احزاب تم کتنی پڑھتے ہو؟

---

[1] سیوطی الإتقان فی علوم القرآن ۔ الدرّ المنثور فی التفسیر بالمأثور

کسی نے کہا: ستّر سے کچھ اُوپر آیتیں ہیں۔ اُبَیؓ بن کعب نے
کہا کہ میں نے یہ سُورت رسول اللہؐ کے ساتھ پڑھی ہے، یہ
سُورۂ بقرہ کے برابر یا اس سے بھی کچھ بڑی ہے، اسی میں
آیۂ رَجم ہے۔[1]

اب آپ دیکھیے کہ یہ دونوں سُورتیں جو سیوطی کی اِتقان اور دُرِّ منثور میں موجود ہیں اور جن کے متعلق طبرانی اور بیہقی نے روایت بیان کی ہے اور جن کو قنُوت کی سورتیں کہا ہے ان کا کِتابُ اللہ میں کہیں کوئی وجود نہیں۔

اِس سے یہ معلوم ہوا کہ جو قرآن ہمارے پاس ہے وہ ان دو سورتوں کی حد تک جو مُصحف ابنِ عبّاس اور مُصحفِ زید بن ثابِت میں موجود تھیں، ناقص ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس مُصحف کے علاوہ جو ہمارے پاس ہے اور بھی کئی مُصحف تھے۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ اہلِ سُنّت طعنہ دیا کرتے ہیں کہ شیعہ مصحفِ فاطمہؑ کے قائل ہیں۔ اب دیکھ لیجیے!

اہلِ سُنّت یہ دونوں سورتیں ہر روز صبح کو دعائے قنوت میں پڑھتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر یہ دونوں سورتیں زبانی یاد تھیں اور میں فجر کے وقت دعائے قنوت میں پڑھا کرتا تھا۔

دوسری روایت جو امام احمد نے اپنی مُسند میں بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ اَحزاب تین چوتھائی کم ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ میں ۲۸۶ آیات ہیں جبکہ موجودہ سورۂ اَحزاب میں صرف ۷۳ آیات ہیں۔ اگر ہم حزب کے اعتبار سے شمار کریں تو سورۂ بقرہ پانچ سے زیادہ احزاب پر مشتمل ہے جبکہ سورۂ احزاب صرف ایک حزب شمار ہوتی ہے۔ (ایک حزب تقریباً نصف پارے کا ہوتا ہے۔)

حیرت کا مقام ہے کہ اُبَیؓ بن کعب یہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہؐ کے ساتھ سورۂ اَحزاب پڑھا کرتا تھا، یہ سُورت، سورۂ بقرہ کے مُساوی یا اس سے کچھ بڑی

---

[1] احمد بن حنبل مسند جلد ۵ صفحہ ۱۳۲

تھی - یہ اُبَیّ بن کعب زمانۂ نبوی کے مشہور ترین قاریوں میں سے ہیں - حافظِ قرآن تھے، خلیفۂ ثانی نے نمازِ تراویح کی امامت کے لیے انھی کا انتخاب کیا تھا[1] ان کے اس قول سے شک بھی پیدا ہوتا ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے حیرت بھی ہوتی ہے -

امام احمد بن حنبل نے اپنی مُسند میں اُبَیّ بن کعب سے ایک اور روایت بیان کی ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں قرآن پڑھ کر سناؤں - چنانچہ آپ نے لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ سے پڑھنا شروع کیا - اس میں آپ نے یہ بھی پڑھا :

وَلَوْ اَنَّ ابْنَ اٰدَمَ سَاَلَ وَادِيًا مِّنْ مَّالٍ فَاُعْطِيَهٗ لَسَاَلَ ثَانِيًا فَلَوْ سَاَلَ ثَانِيًا فَاُعْطِيَهٗ لَسَاَلَ ثَالِثًا وَلَا يَمْلَاُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ وَاِنَّ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ عِنْدَ اللّٰهِ[2]

حافظ ابن عساکر نے اُبَیّ بن کعب کے حالات کے ضمن میں روایت بیان کی ہے کہ

ابُو الدَّرداء چند اہلِ دمشق کے ساتھ مدینہ گئے، وہاں عُمر بن خطّاب کے سامنے یہ آیت پڑھی :

اِنْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَلَوْ حَمِيْتُمْ كَمَا حَمُوْا لَفَسَدَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ .

عُمر بن خطّاب نے پوچھا : تمھیں یہ قراءت کس نے سکھائی ہے - ان لوگوں نے کہا : اُبَیّ بن کعب نے - عُمر نے ان کو بُلایا -

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۵۲

[2] امام احمد بن حنبل مسند جلد ۵ صفحہ ۱۳۱

جب وہ آگئے تو ان لوگوں سے کہا: اب پڑھو، انھوں نے پھر اسی طرح پڑھا:

وَلَوْ حَمَيْتُمْ كَمَا حَمَوْا لَفَسَدَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ.

اُبَیؓ بن کعب نے کہا کہ ہاں یہ میں نے ان کو پڑھایا ہے عمرؓ بن خطّاب نے زید بن ثابت سے کہا: زید تم پڑھو! زید نے وہی معمول کی قراءت کے مطابق تلاوت کی۔ عمرؓ نے کہا مجھے بھی بس یہی قراءت معلوم ہے۔ اس پر اُبَیؓ بن کعب نے کہا کہ عمرؓ آپ جانتے ہیں کہ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں رہتا تھا اور یہ غائب ہوتے تھے۔ میں رسول اللہؐ کے قریب تھا یہ دُور تھے۔ آپ چاہیں تو واللہ میں اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو جاؤں، پھر نہ کسی سے بات کروں گا نہ مرتے دم تک کسی کو پڑھاؤں گا۔ عمرؓ نے کہا: اللہ مجھے مُعاف کرے! اُبَیؓ تم جانتے ہو کہ اللہ نے تمھیں عِلم عطا کیا ہے، تو جو کچھ تمھیں معلوم ہے، لوگوں کو سکھاؤ۔

کہتے ہیں ایک دفعہ ایک لڑکا حضرت عمرؓ کے سامنے سے گزرا، وہ قرآن میں دیکھ کر پڑھ رہا تھا:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ.

حضرت عمرؓ نے کہا: لڑکے اس کو کاٹ دو۔ لڑکے نے جواب دیا یہ اُبَیؓ بن کعب کا مصحف ہے۔ جب وہ لڑکا اُبَیؓ بن کعب کے پاس پہنچا تو ان سے جا کر اس آیت کے بارے میں پوچھا۔ اُبَیؓ نے کہا: مجھے تو قرآن میں مزا آتا تھا تم بازاروں میں تالیاں بجاتے پھرتے ہو۔[1]

---

[1] ابن عساکر تاریخ مدینۃ دمشق جلد ۲ صفحہ ۲۲۸ -

ایسی ہی روایت ابنِ اثیر نے جامعُ الاصول میں ، ابوداؤد نے اپنی سُنن میں اور حاکم نے اپنی مُستدرک میں بیان کی ہے۔

قارئینِ کرام ! اب کی دفعہ یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ ان روایات پر کیا تبصرہ کرتے ہیں ۔ ایسی روایات سے اہلِ سُنّت کی کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن انھیں اس کا احساس نہیں ۔ وہ شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں جن کی کتابوں میں اس کا عُشرِ عَشیر بھی نہیں۔

ممکن ہے کہ اہلِ سُنّت میں سے بعض ضدّی طبیعت کے لوگ حسبِ عادت ان روایات کا انکار کردیں اور امام احمد بن حنبل پر اعتراض کریں کہ انھوں نے ایسی ضعیف سَنَد کی روایات کو اپنی کتاب میں شامل کیا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ بھی کہیں کہ مسند امام احمد اہلِ سُنّت کے نزدیک صِحاح میں شامل نہیں ہے۔

میں اہلِ سُنّت کی عادت خُوب جانتا ہوں ۔ جب بھی میں ان کتابوں سے کوئی ایسی حدیث پیش کرتا تھا جو شیعوں کے لیے بُرہانِ قاطِع ہوتی تو یہ سُنّی بھاگ نکلتے تھے اور ان کتابوں پر اعتراض کرنے لگتے تھے جن کو وہ خود صحاحِ سِتّہ کہتے ہیں یعنی صحیح بُخاری، صحیح مُسلم ، جامع تِرمذی ، سُنَنِ ابی داؤد ، سُنن نسائی اور سُننِ ابنِ ماجہ ۔ بعض لوگ ان کتابوں کے ساتھ سُننِ دارمی ، موطّا مالک اور مُسندِ امام احمد کو بھی صِحاح میں شامل سمجھتے ہیں۔

میں چند ایسی ہی روایات ان ضدّی لوگوں کو گھر تک پہنچانے کے لیے صحیح بُخاری اور صحیح مُسلم سے پیش کرتا ہوں شاید ان کی حقیقت تک رسائی ہوسکے اور شاید وہ حقیقت کو بغیر کسی تعصّب کے قبول کرلیں۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں[1] باب مناقب عمّار وحُذیفہ رضی اللہ عنہما میں عَلقَمہ سے روایت کی ہے ، وہ کہتے ہیں :

"جب میں دمشق پہنچا تو میں نے وہاں پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھی اور پھر دُعا کی کہ " اے اللہ ! مجھے کوئی نیک اور اچھا ہمنشین عطا

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۴ صفحہ ۲۱۵

کر دے"۔ اس کے بعد میں کچھ لوگوں کے پاس جا کر بیٹھا تو وہاں ایک بڑے میاں تشریف لے آئے۔ وہ آ کر میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ معلوم ہوا کہ ابو الدرداء ہیں میں نے ان سے کہا کہ میں نے دُعا کی تھی کہ کوئی نیک اور اچھا ہمنشین مل جائے، اللہ میاں نے آپ کو بھیج دیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں اہل کوفہ سے ہوں۔ انھوں نے کہا: کیا تمھارے یہاں ابنِ اُمِّ عَبد نہیں ہیں جن کے پاس رسول اللہ ص کے نعلَین، آپ کا بچھونا اور آپ کا لوٹا تھا؟ اور تمھارے یہاں وہ بھی تو ہیں جن کے متعلق خود رسول اللہ ص نے فرمایا کہ اللہ نے انھیں شیطان سے بچا لیا ہے۔ اور کیا تمھارے یہاں وہ بزرگ نہیں جو رسول اللہ ص کے رازدار تھے جن کو وہ راز معلوم تھے جو اور کسی کو معلوم نہیں تھے پھر کہنے لگے: عبداللہ اس آیت کو کیسے پڑھتے ہیں: وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی؟

میں نے پڑھ کر سُنایا: وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی وَالذَّکَرِ وَالۡاُنۡثٰی.

نیز یہ کہا: "مجھے رسول اللہ ص نے مُنہ در مُنہ ایسے ہی پڑھایا تھا۔"

ایک اور روایت میں یہ اضافہ ہے:

"یہ لوگ میرے پیچھے لگے رہے۔ یہ مجھ سے وہ چیز چھڑانا چاہتے تھے جو میں نے رسول اللہ ص سے سُنی تھی"۔ [1]

ایک روایت میں ہے کہ

وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی وَالذَّکَرِ وَالۡاُنۡثٰی یہ رسول اللہ ص نے مجھے خود بالمشافہہ بٹھا کر

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۴ صفحہ ۲۱۶ - ع عبداللہ بن مسعود - (ناشر)

پڑھایا ہے۔ [1]

ان تمام روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو قرآن اب ہمارے پاس ہے اس میں وَمَا خَلَقَ کا لفظ اضافہ ہے۔

امام بُخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباس سے روایت بیان کی ہے کہ

عُمر بن خطّاب کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث کیا اور ان پر کتاب نازل فرمائی، اس میں آیتِ رَجْم بھی تھی، ہم نے اس آیت کو پڑھا، سمجھا، یاد کیا چنانچہ رسول اللہ ص نے بھی رجم کی سزا دی۔ آپ کے بعد ہم نے بھی سنگسار کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر اسی طرح وقت گزرتا رہا تو کوئی کہیں یہ نہ کہہ دے: ہمیں تو رَجْم کی آیت کتابُ اللہ میں ملتی ہی نہیں۔ اور اس طرح اللہ کے ایک حکم کو جو اللہ نے نازل کیا ہے، ترک کر کے لوگ گمراہ نہ ہو جائیں۔ رَجْم کی سزا برحق ہے۔ اگر کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو اسے یہ سزا دی جائے گی بشرطیکہ ثبوت موجود ہو یا حمل رہ جائے یا مجرم اقرار کر لے۔

اس کے علاوہ ہم کتابُ اللہ میں ایک اور آیت بھی پڑھا کرتے تھے جو اس طرح تھی:

لَا تَرْغَبُوا عَنْ اٰبَائِكُمْ فَاِنَّهٗ كُفْرٌ بِكُمْ اَنْ تَرْغَبُوا عَنْ اٰبَائِكُمْ

یا اس طرح تھی کہ:

اِنَّ كُفْرًا بِكُمْ اَنْ تَرْغَبُوا عَنْ اٰبَائِكُمْ۔ [2]

امام مُسلم نے اپنی صحیح میں (باب لَوْ اَنَّ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَيْنِ لَابْتَغٰى

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ باب مناقب عبداللہ بن مسعود۔

[2] صحیح بُخاری جلد ۸ باب رجم الحبلیٰ مِنَ الزِّنا اِذا اَحْصَنَت۔

ثالثاً میں) ایک روایت بیان کی ہے کہ

ابو موسیٰ اشعری نے بصرہ کے قاریوں کو بُلایا تو تین سو آدمی آئے جنھوں نے قرآن پڑھا ہوا تھا۔ ابو موسیٰ نے کہا: آپ لوگ بصرہ کے بہترین آدمی ہیں، آپ نے قرآن پڑھا ہے۔ آپ اس آیت سے قرآن پڑھ کر سُنائیں:

وَلَا يَطُولَنَّ عَلَيْكُمُ الْاَمَدُ فَتَقْسُوْ قُلُوبُكُمْ كَمَا قَسَتْ قُلُوبُ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ۔

ابو موسیٰ اشعری نے یہ بھی کہا کہ ہم ایک سُورت پڑھا کرتے تھے جسے ہم طوالت اور اس کے سخت لب و لہجہ کے لحاظ سے سورۂ برأۃ کے ساتھ تشبیہ دیا کرتے تھے۔ اب میں وہ بھول گیا ہوں، لیکن اس میں سے اتنا اب بھی یاد ہے:

لَوْكَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَّالٍ لَابْتَغٰى وَادِيًا ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ۔

اور ہم ایک اور سُورت پڑھا کرتے تھے جسے ہم کہتے تھے کہ یہ مُسبّحات[1] میں سے کسی ایک سُورت کے برابر ہے، وہ بھی میں بھول گیا ہوں، اس میں سے اتنا البتہ یاد ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ فَتُكْتَبُ شَهَادَةً فِيْ اَعْنَاقِكُمْ فَتُسْئَلُوْنَ عَنْهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

یہ دو فرضی سُورتیں جو ابو موسیٰ بھُول گئے تھے ان میں ایک بقول ان کے سورۂ برأت کے برابر تھی۔ یعنی ۱۲۹ آیات کی اور دوسری مُسبّحات میں سے کسی ایک کے برابر تھی۔ دوسرے لفظوں میں تقریباً ۲۰ آیات کے برابر۔ ان دونوں

---

[1] وہ سورتیں جو سُبحانَ، سَبَّحَ، يُسَبِّحُ یا سَبِّحْ سے شروع ہوتی ہیں جیسے سُورۂ اسراء سورۂ حدید، سورۂ حشر، سورۂ صف، سورۂ جمعہ، سورۂ تغابُن اور سورۂ اعلیٰ۔ (ناشر)

سورتوں کا وجود صرف ابوموسیٰ کے ذہن میں تھا۔ قارئینِ کرام! اب آپ کو اختیار ہے، یہ سب پڑھ کر اور سُن کر آپ حیرت سے ہنسیں یا روئیں۔

جب اہلِ سُنّت کی کتابیں اور احادیث کے معتبر مجموعے اس طرح کی روایات سے پُر ہیں جن میں کبھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن ناقص ہے اور کبھی کہا جاتا ہے کہ اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے، پھر یہ شیعوں پر اعتراض کیسا جن کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسے سب دعوے غلط اور باطل ہیں؟

اگر فصل الخطاب فی اثباتِ تحریفِ کتابِ ربِّ الارباب کے مُصنّف نے جو ۱۳۲۰ھ میں فوت ہوا، اب سے تقریباً سو سال پہلے اپنی کتاب لکھی تھی، تو اس سے پہلے الفرقان کا مُصنّف مصر میں چار سو برس ہوئے اپنی کتاب لکھ چکا تھا جیسا کہ شیخ محمد مدنی پرنسپل شریعہ کالج جامعہ ازہر کا بیان ہے[1]

ہوسکتا ہے کہ شیعہ مُصنّف نے سُنّی مُصنّف کی کتاب الفرقان پڑھی ہو، جس نے اپنی کتاب میں وہ تمام روایات جمع کر دی تھیں جو اہلِ سُنّت کی صِحاح میں آئی ہیں۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس کتاب کو جامعہ ازہر کی درخواست پر مصری حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ یہ تو معلوم ہے کہ اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ عَلٰی مَا مُنِعَ مِنْهُ کے بمصداق جس چیز سے منع کیا جائے اس کا دُگنا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب گو مصر میں ممنوع تھی لیکن دوسرے اسلامی ممالک میں ممنوع نہیں تھی، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ فصل الخطاب جو چار سو برس بعد لکھی گئی الفرقان ہی کا چربہ ہو یا بغل بچّہ ہو۔

اِس تمام بحث میں اہم بات یہ ہے کہ سُنّی اور شیعہ عُلماء اور مُحقّقین نے اس طرح کی روایات کو باطِل اور شاذ کہا ہے اور اطمینان بخش دلائل سے ثابت کیا ہے کہ جو قرآن ہمارے پاس ہے، وہ بِعینہٖ وہی قرآن ہے جو حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اس میں نہ کوئی کمی بیشی ہے اور نہ کوئی تغیّر و تبدّل۔

پھر ان روایات کی بنیاد پر جو خُود ان کے نزدیک ساقط الاعتبار ہیں، یہ

---

[1] رسالہ الاسلام شمارہ ۴ جلد ۱۱ صفحہ ۳۸۲ - ۳۸۳

اہلِ سُنّت کیسے شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں اور خود کو بری الذمہ ٹھہراتے ہیں جبکہ ان کی صِحاح ان روایات کی صحّت کو ثابت کرتی ہیں۔

مسلمانو! یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا۔ سچ کہا ہے سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام نے:

"یہ لوگ دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھتے ہیں مگر انھیں
اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔"

میں اس طرح کی روایات کا ذکر بڑے افسوس کے ساتھ کر رہا ہوں کیونکہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان کے بارے میں سُکوت اختیار کریں اور انھیں خاموشی سے ردّی کی ٹوکری کے حوالے کر دیں۔

کاش بعض مُصنّفین جو سُنّتِ رسولؐ کی پیروی کے مُدّعی ہیں شیعوں پر رکیک حملے نہ کرتے۔ کچھ معروف ادارے شیعوں کی تکفیر کرنے میں ان مصنّفین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انھیں سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔

ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد سے تو اس طرح کی کارروائیاں اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہیں۔

میں ان سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا
وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا.

جمع بین الصلاتین

جن باتوں پر شیعوں پر اعتراض کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ شیعہ ظہر اور عصر کی نمازیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھتے ہیں۔ اہلِ سُنّت جب اس سلسلے میں شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں تو عموماً اس طرح کی تصویر کھینچتے ہیں گویا وہ خود نماز کو صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا.

مومنین پر نماز وقتِ مقررہ پر فرض کی گئی ہے۔

اہلِ سُنّت اکثر شیعوں کو طعنہ دیا کرتے ہیں کہ شیعہ نماز کی پروا نہیں کرتے اور اس طرح خدا اور رسولؐ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم شیعوں کے حق میں یا ان کے خلاف کوئی فیصلہ کریں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس موضوع کا ہر پہلو سے جائزہ لیں، طرفین کے اقوال اور دلائل سُنیں اور مُعاملہ کو اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ جلد بازی میں کسی کے خلاف کوئی یکطرفہ فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔

اہلِ سُنّت کا اس پر تو اتفاق ہے کہ ۹ ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھی جائیں، اس کو جمع تقدیم کہتے ہیں اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھی جائیں، اسے جمع تاخیر کہا جاتا ہے۔ یہاں تک تو شیعہ سُنّی کیا تمام ہی فرقوں کا اتفاق ہے۔

شیعہ سُنّی اختلاف اس میں ہے کہ کیا ظُہر اور عصر کی نمازیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں پورے سال سفر کے عُذر کے بغیر بھی جمع کرنی جائز ہیں؟

حنفی حضرات صریح نصُوص کے باوجود نمازیں جمع کرنے کی اجازت کے قائل نہیں حتیٰ کہ سفر کی حالت میں بھی نمازیں اکٹھی پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس طرح حنفیوں کا طرزِ عمل اس اجماعِ اُمّت کے خلاف ہے جس پر شیعوں اور سُنّیوں

دونوں کا اتفاق ہے۔

لیکن مالکی، شافعی اور حنبلی سفر کی حالت میں تو دو فرض نمازوں کے اکٹھا پڑھ لینے کے جواز کے قائل ہیں۔ لیکن ان میں اس پر اختلاف ہے کہ کیا خوف، بیماری بارش وغیرہ کے عذر کی وجہ سے بھی دو نمازوں کا اکٹھا پڑھ لینا جائز ہے۔

شیعہ امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جمع بَیْنَ الصَّلاتَیْن مُطلقاً جائز ہے اور اس کے لیے سفر، بیماری یا خوف وغیرہ کی کوئی شرط نہیں۔ وہ اس سلسلے میں ائمۂ اہلِ بیت کی ان روایات پر عمل کرتے ہیں جو شیعہ کتابوں میں موجود ہیں۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم شیعہ موقف کو شک کی نگاہ سے دیکھیں کیونکہ جب بھی اہلِ سُنّت ان کے طریقے کے خلاف کوئی دلیل پیش کرتے ہیں وہ اسے یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ انھیں تو ائمۂ اہلِ بیت نے خود تعلیم دی ہے اور ان کی تمام مشکلات کو حل کیا ہے۔ وہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ وہ ان ائمۂ معصومین کی پیروی کرتے ہیں جو قرآن و سُنّت کا پورا علم رکھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے پہلی مرتبہ جو ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھیں وہ شہید محمد باقر صدرؒ کی امامت میں پڑھی تھیں۔ ورنہ اس سے قبل میں نجف میں بھی ظہر اور عصر کی نمازیں الگ الگ ہی پڑھا کرتا تھا۔ آخر وہ مُبارک دن بھی آگیا جب میں آیتُ اللہ صدرؒ کے ساتھ ان کے گھر سے اس مسجد میں گیا جہاں وہ اپنے مُقلّدین کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے مُقلّدین نے میرے لیے احتراماً عین ان کے پیچھے جگہ چھوڑ دی۔ جب ظہر کی نماز ختم ہوگئی اور عصر کی جماعت کھڑی ہوئی تو میرے جی نے کہا اب یہاں سے نکل چلو۔ لیکن میں دو وجہ سے ٹھہرا رہا۔ ایک تو سیّد صدر کی ہیبت تھی۔ جس خشوع سے وہ نماز پڑھا رہے تھے، میرا دل چاہتا تھا کہ وہ نماز پڑھاتے ہی رہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جس جگہ میں تھا وہ جگہ اور سب نمازیوں کی نسبت ان سے زیادہ قریب تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی زبردست طاقت نے مجھے ان کے ساتھ باندھ دیا ہو۔

نماز سے فارغ ہوتے تو لوگ ان سے سوالات پُوچھنے کے لیے اُمنڈ پڑے میں ان کے پیچھے بیٹھا ہوا لوگوں کے سوال اور ان کے جواب سُنتا رہا۔ بعض سوال جواب

بہت آہستہ ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آئے۔ لیکن مجھے شرم آ رہی تھی۔ میں ان پر اور زیادہ بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے کھانا کھلانے کے لیے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ اس دعوت کا خاص مہمان اور میر محفل میں ہی ہوں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے جمع بَیْنَ الصّلاتَیْن کے بارے میں دریافت کیا۔

آیتُ اللہ سیّد محمّد باقر صدر نے جواب دیا:

ہمارے یہاں ائمہؑ معصومین علیہم السلام سے بہت سی روایات ہیں کہ رسول اللہؐ نے یہ نماز پڑھی یعنی ظہر اور عصر کی نمازوں کو جمع کیا اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کیا۔ اور یہ نمازیں خوف یا سفر کی وجہ سے نہیں بلکہ اُمّت سے حَرَج دور کرنے کے لیے اکٹھی پڑھیں۔

میں: میں حرج کا مطلب نہیں سمجھا۔ قرآن شریف میں بھی ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ.

سیّد صدر: اللہ سُبْحَانَہٗ کو ہر شے کا علم ہے۔ اسے معلوم تھا کہ بعد کے زمانے میں وہ چیزیں ہوں گی جنھیں ہمارے یہاں پبلک ڈیوٹیز کہا جاتا ہے پھر اس طرح کی سرکاری ملازمتیں: جیسے گارڈ، پولیس، لویز، فوج پبلک اداروں میں کام کرنے والے ملازمین، حتّٰی کہ طلبہ اور اساتذہ بھی۔ اگر دین ان سب کو پانچ متفرق اوقات میں نمازیں پڑھنے کا پابند کرے، تو یقیناً ان کے لیے تنگی اور پریشانی ہو گی، اس لیے رسول اللہؐ کے پاس وحی آئی کہ وہ دو فرض نمازیں ایک وقت میں پڑھا دیں تاکہ نماز کے اوقات پانچ کے بجائے تین ہو جائیں۔ یہ صورت مسلمانوں کے لیے زیادہ سہل تھی اور اس میں کوئی حرج یعنی تنگی بھی نہیں ہے۔

میں: لیکن سُنّتِ نبوی قرآن کو تو منسوخ نہیں کر سکتی۔

سیّد صدر: میں نے کب کہا کہ سُنّت نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ لیکن اگر کسی چیز کو سمجھنے میں دقت ہو تو سُنّت قرآن کی تفسیر و توضیح تو کر سکتی ہے۔

میں: اللہ سُبْحَانَہٗ کہتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

کِتَابًا مَّوْقُوْتًا - اور مشہور حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ ص کے پاس آئے اور آپ نے دن رات میں پانچ وقت نماز پڑھی - اسی پر ان نمازوں کے نام ظُہر، عصر، مغرب، عِشاء، اور فجر رکھے گئے -

سیّد صدر : اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا کی تفسیر رسول اللہ ص نے دو طرح سے کی ہے - الگ الگ نمازوں سے بھی اور جمع بَیْنَ الصَّلَاتَیْن سے بھی - اِس لیے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ پانچ نمازیں پانچ مختلف اوقات میں بھی پڑھی جا سکتی ہیں اور تین اوقات میں بھی جمع کی جا سکتی ہیں - دونوں صورتوں میں وہ صحیح وقت پر ادا ہوں گی -

میں : قبلہ ! میں سمجھا نہیں - اللہ تعالیٰ نے پھر کِتَابًا مَّوْقُوْتًا کیوں کہا ہے ؟

سیّد صدر : (مُسکراتے ہوئے) آپ کا کیا خیال ہے، مُسلمان حج میں وقت پر نماز نہیں پڑھتے ؟ کیا وہ اس وقت اَحکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں. جب وہ عَرَفات میں ظُہر اور عصر کی نماز کے لیے اور مُزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز کے لیے رسول اللہ ص کی پیروی میں جمع ہوتے ہیں -

میں نے ذرا سوچ کر کہا : شاید ایسا عُذر کی وجہ سے ہو - حجّاج تھک جاتے ہیں اس لیے اللہ نے اس موقع پر ان کے لیے کچھ سہولت کر دی -

سیّد صدر : یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اس اُمّت کے متاخّرین سے تنگی دُور کر دی اور دین کو آسان بنا دیا -

میں : آپ نے ابھی کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے پاس وحی بھیجی کہ دو وقت کی فرض نمازیں ایک وقت میں پڑھائیں تاکہ نمازوں کے وقت پانچ کے بجائے تین ہو جائیں، تو یہ اللہ نے کِس آیت میں کہا ہے ؟

سیّد صدر نے فوراً جواب دیا : کون سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ؐ کو حکم دیا ہے کہ وہ دو نمازیں عرفات میں اور دو مُزدلفہ میں. جمع کریں اور پانچ وقتوں کا کس آیت میں ذکر ہے ؟

میں اِس دفعہ خاموش ہو گیا، کوئی اعتراض نہیں کیا - میں مطمئن ہو چکا تھا -

سیّد صدر نے مزید کہا : اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو جو وحی بھیجتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ قرآن میں ہی ہو اور وَحیِ مَتلُوّ ہی ہو :

قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمَاتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمَاتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔

آپ کہہ دیجیے کہ اگر سب سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے روشنائی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہیں ہوں گی اگرچہ ہم ایسا ہی اور سمندر اس کی مدد کے لیے لے آئیں۔ (سورۂ کہف - آیت ۱۰۹)

جسے ہم سُنّتِ نبوی کہتے ہیں، وہ بھی وَحیِ الٰہی ہی ہے، اسی لیے اللہ سُبحانَہٗ نے کہا ہے :

وَمَآ اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

جس کا رسولؐ تمھیں حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو۔

بالفاظِ دیگر۔ جب رسول اللہؐ صحابہ کو کسی کام کا حکم دیتے تھے یا کسی کام سے منع کرتے تھے تو صحابہ کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ آپ پر کوئی اعتراض کرتے یا آپ سے یہ مُطالبہ کرتے کہ کلامُ اللہ کی کوئی آیت پیش کریں۔ وہ آپ کے حکم کی تعمیل یہ سمجھ کر کرتے تھے کہ آپ جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ وحیِ الٰہی ہوتا ہے۔

سیّد باقر صدر نے ایسی ایسی باتیں بتلائیں کہ میں حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے میں ان حقائق سے ناواقف تھا۔

میں نے جمع بَیْنَ الصَّلاتَیْن کے موضوع سے متعلق ان سے مزید پوچھا : قبلہ! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی مُسلمان دو نمازیں ضرورت کی صورت میں جمع کرلے؟

"دو نمازوں کا جمع کرنا ہر حالت میں جائز ہے، ضرورت ہو یا نہ ہو۔"

میں نے کہا: اس کے لیے آپ کے پاس دلیل کیا ہے؟

انھوں نے کہا: اِس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں دو فرض نمازوں کو جمع کیا ہے اور اس وقت آپ سفر میں نہ تھے۔ نہ کوئی خوف تھا نہ بارش ہو رہی تھی اور نہ کوئی ضرورت تھی، صرف ہم لوگوں سے تنگی رفع کرنے کے لیے آپ نے دو نمازوں کو اکٹھا پڑھا۔ اور یہ بات ہمارے یہاں ائمۂ اطہار کے واسطے سے بھی ثابت ہے اور آپ کے یہاں بھی ثابت ہے۔

مجھے بہت تعجّب ہوا، ہائیں! ہمارے یہاں کیسے ثابت ہے۔ میں نے آج تک نہیں سُنا! اور نہ میں نے اہلِ سُنت والجماعت کو ایسا کرتے دیکھا۔ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ اگر اذان سے ایک منٹ پہلے بھی نماز پڑھ لی جاتے تو نماز باطل ہے، چہ جائیکہ گھنٹوں پہلے عصر کی نماز ظہر کے ساتھ یا عشاء کی نماز مغرب کے ساتھ پڑھ لی جائے۔ یہ بات بالکل غلط معلوم ہوتی ہے۔

آیتُ اللہ صدر رحمۃ اللہ علیہ میری حیرت کو بھانپ گئے۔ انھوں نے ایک طالب علم کو آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ اُٹھ کر پلک جھپکتے میں دو کتابیں لے آیا۔ معلوم ہوا کہ ایک صحیح بُخاری ہے، دُوسری صحیح مُسلم۔ آقائے صدر نے اس طالب علم سے کہا کہ وہ مجھے جمع بَیْنَ الفریضتَیْن سے متعلق احادیث دکھائے۔ میں نے خود صحیح بُخاری میں پڑھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کی نمازوں کو اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کیا۔ صحیح مُسلم میں تو بغیر خوف، بغیر بارش اور بغیر سفر کے دو نمازوں کو جمع کرنے کے بارے میں پُورا ایک باب ہے۔

میں اپنے تعجّب اور حیرت کو تو چُھپا نہ سکا۔ مگر پھر بھی مجھے کچھ شک ہوا کہ شاید بُخاری اور مُسلم جو ان کے پاس ہیں اُن میں کچھ جعل سازی کی گئی ہے میں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ تیونس جا کر میں ان کتابوں کو پھر دیکھوں گا۔

آیتُ اللہ سیّد محمد باقر صدر رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے پوچھا: اب کہیے کیا خیال ہے؟

میں نے کہا: آپ حق پر ہیں اور جو کہتے ہیں سچ کہتے ہیں۔ لیکن میں آپ سے ایک بات اور پُوچھنا چاہتا ہوں۔

"فرمائیے"، انھوں نے کہا۔
میں نے کہا: کیا چاروں نمازوں کا جمع کرنا بھی جائز ہے؟ ہمارے یہاں بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں، جب رات کو کام پر سے گھر واپس آتے ہیں، تو ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں قضا پڑھ لیتے ہیں۔
انھوں نے کہا: یہ تو جائز نہیں، البتہ مجبوری کی بات دوسری ہے کیونکہ مجبوری میں بہت سی باتیں جائز ہو جاتی ہیں، ورنہ تو نماز کا وقت مقرر ہے
اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا۔
میں نے کہا: آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ رسول اللہؐ نے نمازیں الگ الگ بھی پڑھی ہیں اور ملا کر بھی پڑھی ہیں اور اسی سے ہمیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ نمازوں کے اوقات کون سے ہیں۔
اس پر انھوں نے کہا: ظہر اور عصر کی نمازوں کا وقت مشترک ہے اور یہ وقت زوالِ آفتاب سے شروع ہو کر غروبِ آفتاب تک رہتا ہے۔ مغرب اور عشاء کا وقت بھی مشترک ہے جو غروبِ آفتاب سے نصفِ شب تک رہتا ہے۔ فجر کی نماز کا وقت الگ ہے جو طلوعِ فجر سے دن نکلنے تک ہے[1] جو اس کے خلاف کرے گا، وہ اس آیت کریمہ کی خلاف ورزی کرے گا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم مثلاً صبح کی نماز طلوعِ فجر سے پہلے پڑھ لیں یا دن نکلنے کے بعد پڑھیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ظہر اور عصر کی نماز زوال سے پہلے یا غروبِ آفتاب کے بعد پڑھیں یا مغرب اور عشاء کی نمازیں غروب سے پہلے یا آدھی رات کے بعد پڑھیں۔
میں نے آقائے صدر کا شکریہ ادا کیا، گو مجھے ان کی باتوں سے پورا اطمینان ہو گیا تھا، لیکن میں نے نمازوں کو جمع کرنا اس وقت شروع کیا جب میں تیونس واپس آکر تحقیق اور مطالعہ میں پوری طرح مشغول ہو گیا اور میری آنکھیں

---

[1] اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ ۔ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ ۔ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۸) ۔ (ناشر)

کھل گئیں۔

جمع بَینَ الصّلاتَین کے بارے میں شہید صَدر سے جو میری گفتگو رہی، یہ اس کی داستان ہے اور یہ داستان میں نے دو وجہ سے بیان کی ہے :

ایک تو یہ کہ میرے اہلسُنّت بھائیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو عُلماء واقعی انبیاء کے وارث ہیں ان کا اخلاق کیسا ہوتا ہے۔

دُوسرے یہ بھی احساس ہو جائے کہ ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ ہماری حدیث کی معتبر کتابوں میں کیا لکھا ہوا ہے۔ ہم ایسی باتوں پر دُوسروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں جن کی صحّت کے ہم خود قائل ہیں اور جن کو ہم صحیح سُنّتِ نبوی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ان باتوں کا مذاق اُڑاتے ہیں جن پر خود رسول اللہ ص نے عمل کیا تھا اور اس کے باوجود دعویٰ ہمارا یہ ہے کہ ہم اہلِ سُنّت ہیں !

میں پھر اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں شیعوں کے اقوال کو شک کی نظر سے دیکھنا ہوگا کیونکہ وہ اپنے ہر عقیدے اور عمل کی سَنَد ائمۂ اہلِ بیت ع سے لاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ نسبت صحیح نہ ہو، لیکن ہم اپنی صِحَاح میں تو شک نہیں کر سکتے، ان کی صحّت تو ہمیں تسلیم ہے اور اگر ہم ان میں بھی شک کرنے لگے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ پھر ہمارے پاس دین میں سے کچھ باقی بچے گا بھی کہ نہیں !

اِس لیے تحقیق کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ انصاف سے کام لے اور تحقیق سے اس کا مقصد رضائے الٰہی کا حصُول ہو۔ اس طرح اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرور صراطِ مُستقیم کی طرف رہنمائی کرے گا، اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور اسے جَنّتُ النعیم میں داخل کرے گا۔

اور یہ ہیں وہ روایات جو جمع بَینَ الصّلاتَین کے بارے میں علمائے اہلِ سُنّت نے بیان کی ہیں، ان کو پڑھ کر آپ کو یقین ہو جائے گا کہ جمع بَینَ الصّلاتَین کوئی شیعہ بِدعت نہیں ہے :۔

* امام احمد بن حنبل نے اپنی مُسند میں ابنِ عبّاس سے روایت بیان کی ہے کہ

رسول اللہ صلعم نے جب وہ مدینے میں مُقیم تھے مُسافر نہیں تھے سات اور آٹھ رکعتیں پڑھیں۔[1]

* امام مالک نے مؤطا میں ابنِ عبّاس سے روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ صلعم نے بغیر خوف اور سفر کے ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھیں اور مغرب اور عشاء کی اکٹھی۔[2]

* صحیح مسلم میں باب الجمع بَیْنَ الصَّلاتَیْن فِی الحَضَر میں ابنِ عبّاس سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلعم نے بغیر خوف اور سفر کے ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھیں اور مغرب اور عشاء کی اکٹھی۔

* صحیح مُسلم میں ابنِ عبّاس ہی سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلعم نے مدینہ میں بغیر خوف اور بغیر بارش کے ظُہر عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھیں۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے ابنِ عبّاس سے پُوچھا کہ رسول اللہ صلعم نے ایسا کیوں کیا؟ ابنِ عبّاس نے کہا: اپنی اُمت کو تنگی سے بچانے کے لیے۔

* اِسی باب میں صحیح مُسلم کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع بَیْنَ الصَّلاتَیْن کی سُنّت صحابہ میں مشہور تھی اور اس پر صحابہ عمل بھی کرتے تھے۔

* صحیح مُسلم کے اِسی باب کی روایت ہے کہ

ایک روز ابنِ عبّاس نے عصر کے بعد خُطبہ دیا۔ ابھی ان کا خُطبہ جاری تھا کہ سُورج ڈُوب گیا، ستارے نکل آئے، لوگ بے چین ہو کر اَلصَّلاۃ، اَلصَّلاۃ پُکارنے لگے۔ بنی تمیم میں سے

---

[1] امام احمد بن حنبل مُسند جلد ۱ صفحہ ۲۲۱

[2] امام مالک مُؤطّا، شرح الحوالک جلد ۱ صفحہ ۱۶۰۔

ایک گستاخ شخص الصّلاۃ، الصّلاۃ کہتا ہوا ابنِ عبّاس تک پہنچ گیا۔ ابنِ عبّاس نے کہا: تیری ماں مرے تو مجھے سُنّت سکھاتا ہے! میں نے رسول اللہ ص کو ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھتے دیکھا ہے۔"

* ایک اور روایت میں ہے کہ

"ابنِ عبّاس نے اس شخص سے کہا کہ تیری ماں مرے تو ہمیں نماز سکھاتا ہے۔ ہم رسول اللہ ص کے زمانے میں جمع بین الصّلاتین کیا کرتے تھے۔"[1]

* باب وقت المغرب میں صحیح بُخاری کی روایت ہے، جابر بن زید کہتے ہیں کہ ابنِ عبّاس کہتے تھے کہ

"رسول اللہ ص نے سات رکعتیں اکٹھی اور آٹھ رکعتیں اکٹھی پڑھیں۔"[2]

* اِسی طرح بُخاری نے باب وقت العصر میں روایت بیان کی ہے کہ ابواُمامہ کہتے تھے کہ:

"ہم نے عُمر بن عبد العزیز کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، پھر ہم وہاں سے نکل کر انس بن مالک کے پاس پہنچے۔ دیکھا تو عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں نے پُوچھا: چچا میاں! یہ آپ نے کون سی نماز پڑھ لی؟ کہنے لگے عصر کی، اور یہ رسول اللہ ص کی نماز ہے جو ہم رسول اللہ ص کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔"[3]

اہلِ سُنّت کی صِحاح کی احادیث کے اس مختصر جائزے کے بعد ہم پُوچھنا چاہیں گے کہ ان روایات کے ہوتے ہوتے اہلِ سُنّت آخر شیعوں کو بُرا بھلا کیوں

---

[1] صحیح مُسلم جلد ۲ صفحہ ۱۵۱ - ۱۵۲ باب الجمع بین الصّلاتین۔

[2] صحیح بُخاری جلد ۱ صفحہ ۱۴۰ باب وقت المغرب۔

[3] صحیح بُخاری جلد ۱ صفحہ ۱۳۸ باب وقت العصر۔

کہتے اور ان پر کیوں اعتراض کرتے ہیں۔

ہم پھر حسبِ عادت وہی بات کہیں گے کہ اہلِ سُنّت کرتے کچھ ہیں اور کہتے کچھ ہیں اور ان باتوں پر اعتراض کرتے ہیں جن کی صحت کے خود قائل ہیں۔

ہمارے شہر قفصہ میں ایک دن امام صاحب نمازیوں کے درمیان کھڑے ہوکر ہمیں بدنام کرنے کے لیے، ہم پر لعن طعن کرتے ہوئے کہنے لگے: "تم نے دیکھا ان لوگوں نے کیا نیا دین نکالا ہے۔ ظہر کی نماز کے فوراً بعد عصر کی نماز پڑھنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ دینِ محمدی نہیں ہے کوئی نیا دین ہے۔ یہ قرآن کے خلاف کرتے ہیں قرآن تو کہتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا۔

غرض امام صاحب نے کوئی ایسی گالی نہ چھوڑی جو انھوں نے اُن لوگوں کو نہ دی ہو جو نئے نئے شیعہ ہوئے تھے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان جس نے شیعہ مذہب قبول کرلیا تھا، ایک دن میرے پاس آیا اور بڑے رنج و افسوس کے ساتھ امام صاحب کی باتیں میرے سامنے دُہرائیں۔ میں نے اسے صحیح بُخاری اور صحیح مُسلم دیں اور اس سے کہا کہ امام صاحب کو جاکر بتاؤ کہ جمع بَیۡنَ الصّلاتَیۡن درست ہے اور سُنّتِ نبوی ہے، میں نے اس نوجوان سے کہا کہ میں امام صاحب کے پاس جاؤں گا نہیں، کیونکہ میں ان سے جھگڑنا نہیں چاہتا، ایک دن میں نے ان سے خوش اُسلوبی کے ساتھ سنجیدہ بحث کرنی چاہی تھی مگر وہ گالیوں پر اُتر آئے اور غَلط سَلط الزامات لگانے لگے۔

اِس گفتگو میں اہم بات یہ تھی کہ میرے اس دوست نے ابھی تک ان امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنی ترک نہیں کی تھی۔ جب نماز کے بعد امام صاحب حسبِ معمول درس کے لیے بیٹھے، میرے دوست نے بڑھ کر ان سے جمع بَیۡنَ الفَرِیضَتَیۡن کے متعلق سوال کیا۔

امام صاحب نے کہا: یہ شیعوں کی نکالی ہوئی بِدعت ہے!

میرے دوست نے کہا: لیکن یہ تو صحیح بُخاری اور صحیح مُسلم سے ثابت ہے۔

امام صاحب جھٹ سے بولے: بالکل غَلَط۔

میرے دوست نے صحیح بُخاری اور صحیح مُسلم نکال کر انھیں دیں۔ انھوں نے باب الجمع بَیۡنَ الصّلاتَیۡن پڑھا۔ میرا دوست کہتا ہے کہ جب انھیں ان نمازیوں کے سامنے

جو ان کا درس سُنا کرتے تھے حقیقت معلوم ہوئی تو وہ چکرائے اور انھوں نے کتابیں بند کر کے مجھے واپس کر دیں اور کہنے لگے کہ "یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی جب تم رسول اللہ ﷺ کے درجے پر پہنچ جاؤ گے اس وقت اس طرح نماز پڑھنا"۔ میرا دوست سمجھ گیا کہ یہ جاہل متعصّب شخص ہے اور اس دن سے میرے دوست نے ان کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی۔

قارئین کرام! دیکھیے تعصّب کیسے آنکھوں کو اندھا کر دیتا ہے اور دلوں پر غلاف چڑھا دیتا ہے، پھر حق سُجھائی نہیں دیتا۔ ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے کہ

عَنْزَةٌ وَلَوْ طَارَتْ.

تھی تو بکری ہی، اُڑ گئی تو کیا ہوا[1]

میں نے اپنے دوست سے کہا کہ تم امام صاحب کے پاس ایک دفعہ پھر جا کر انھیں بتلاؤ کہ ابنِ عبّاس اس طرح نماز پڑھا کرتے تھے اور اِسی طرح انَس بن مالِک اور دُوسرے صحابہ بھی پڑھتے تھے، تو پھر اس میں رسول اللہ ﷺ کی کیا خُصوصیت ہوئی؟

لیکن میرے دوست نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اس کی ضرورت نہیں، امام صاحب کبھی نہیں مانیں گے خواہ رسول اللہ ﷺ خود ہی کیوں نہ آ جائیں۔

رسول اللہ ﷺ کا آنا تو خیر ناممکن بات ہے مگر اِس سے اس تلخ حقیقت کا اظہار ہوتا ہے جس کو اللہ عَزَّ وَجَلَّ نے سُورہ رُوم میں اس طرح بیان کیا ہے۔

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ‎ وَمَا أَنتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ.

---

[1] کہتے ہیں، دو آدمی شکار کے لیے نکلے۔ دور سے کوئی سیاہ چیز دکھائی دی۔ ایک نے کہا کہ یہ کوّا ہے دوسرے نے کہا: نہیں بکری ہے۔ دونوں اپنی ضد پر اڑے رہے۔ قریب پہنچے تو کوّا پھڑپھڑا کر اُڑ گیا۔ پہلے شخص نے کہا: دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ کوّا ہے، اب مان گئے؟ لیکن اس کا دوست پھر بھی نہ مانا۔ کہنے لگا:

"بھائی! تھی تو بکری ہی، مگر اُڑنے والی بکری تھی"!

آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سُنا سکتے ہیں جبکہ وہ پیٹھ پھیرے چلے جا رہے ہوں - اور آپ اندھوں کو گمراہی سے نہیں نکال سکتے - آپ صرف ان کو سُنا سکتے ہیں جو ہماری نشانیوں پر ایمان لائے ہوں اور انھیں مانتے ہوں -

(سورۂ روم - آیت ۵۳)

الحمدُللہ کہ بہت سے نوجوان جمع بَیْنَ الصلاتَیْن کی حقیقت سے واقف ہونے کے بعد دوبارہ نماز پڑھنے لگے، نہیں تو وہ نماز ہی چھوڑ بیٹھے تھے کیونکہ وہ وقت پر تو نماز پڑھ نہیں سکتے تھے، رات کو چار وقت کی اکٹھی نماز پڑھتے بھی تھے تو دل کو اطمینان نہیں ہوتا تھا- اب ان کی سمجھ میں آیا کہ جمع بَیْنَ الصّلاتَیْن میں کیا حکمت ہے- جمع بَیْنَ الصّلاتَیْن کی صورت میں سب ملازمت پیشہ، طلبہ اور عوام نماز وقت پر ادا کر سکتے ہیں اور ان کا دِل مُطمئن رہتا ہے- رسول اللہؐ کے ارشاد کا مطلب کہ کَیْ لَا اُحْرِجَ اُمَّتِیْ (میں اپنی اُمت کو ضیق میں نہ ڈالوں) ان کی سمجھ میں آگیا تھا-

خاک پر سجدہ

شیعوں کا اس پر اتفاق ہے کہ زمین پر سجدہ افضل ہے- وہ ائمہ اہلِ بیتؑ سے ان کے جدّ رسول اللہؐ کا قول نقل کرتے ہیں کہ

اَفْضَلُ السُّجُوْدِ عَلَی الْاَرْضِ

سجدہ زمین پر افضل ہے-

ایک اور روایت میں ہے کہ

لَا یَجُوْزُ السُّجُوْدُ اِلَّا عَلَی الْاَرْضِ اَوْ مَا اَنْبَتَتِ الْاَرْضُ غَیْرَ مَاکُوْلٍ وَّلَا مَلْبُوْسٍ.

سجدہ جائز نہیں ہے مگر زمین پر یا اس چیز پر جو زمین سے اُگی ہو مگر نہ کھائی جاتی ہو اور نہ پہنی جاتی ہو-

صاحب وسائل الشیعہ محدّث حر عاملی نے اپنی اسناد سے روایت کی ہے کہ ہشام بن حکم کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا :

اَلسُّجُوْدُ عَلَی الْاَرْضِ اَفْضَلُ لِاَنَّہٗ اَبْلَغُ فِی التَّوَاضُعِ وَالْخُضُوْعِ لِلّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ۔

زمین پر سجدہ افضل ہے کیونکہ اس سے انتہائی تواضع اور خُشوع وخضوع کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک اور روایت میں اسحاق بن فضل کہتے ہیں کہ

میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پُوچھا کہ کیا چٹائیوں پر اور سرکنڈوں سے بنے ہوئے بوریوں پر سجدہ جائز ہے ؟ آپ نے کہا : کوئی حرج نہیں۔ مگر میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ زمین پر سجدہ کیا جائے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ؐ کو یہ بات پسند تھی کہ آپ کی پیشانی زمین پر ہو۔ اور میں تمھارے لیے وہی بات پسند کرتا ہوں جو رسول اللہ ؐ کو پسند تھی۔

مگر عُلمائے اہلِ سُنّت قالین یا دری وغیرہ پر بھی سجدہ میں کوئی مُضائقہ نہیں سمجھتے۔ اگرچہ ان کے نزدیک بھی افضل یہ ہے کہ چٹائی پر سجدہ کیا جائے۔ بُخاری اور مُسلم کی بعض روایات بتلاتی ہیں کہ رسول اللہ ؐ کے پاس کھجور کے پتوں اور مٹی سے بنی ہوئی نہایت چھوٹی سی جانماز تھی جس پر آپ سجدہ کیا کرتے تھے۔

صحیح مُسلم کتابُ الحَیض میں عَن قاسم بن مُحمّد عَن عائشہ کے حوالے سے روایت ہے،

عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ؐ نے مجھ سے کہا کہ ذرا یہ خمرہ مجھے مسجد سے اٹھا دینا۔ میں نے کہا : مجھے تو ماہواری آرہی ہے آپ نے فرمایا : تمھاری ماہواری تمھارے ہاتھ میں تھوڑا ہی ہے۔[1] مُسلم کہتے ہیں کہ خمرہ کا مطلب ہے چھوٹی سی جانماز

---

[1] صحیح مُسلم جلد اول باب جواز غَسلِ الحائضِ رَاْسَ زَوجِہا۔ سُنَنِ ابی داؤد جلد ۱ باب الحائض تناوُلُ مِنَ المَسجِدِ۔

اتنی چھوٹی کہ بس اس پر سجدہ کیا جا سکے۔)
بُخاری نے اپنی صحیح میں ابوسعید خُدری رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے روایت بیان کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ص زمین پر سجدہ کرنا پسند فرماتے تھے۔

ابوسعید خُدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ص رمضان کے درمیانی عشرے میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ ایک سال آپ نے اعتکاف کیا۔ جب اکیسویں کی شب ہوئی اور یہ وہ رات تھی جس کی صبح کو آپ اعتکاف سے نکلنے والے تھے، اس رات آپ نے کہا:

"جس نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہو وہ رمضان کے آخری دس دنوں کا بھی اعتکاف کرے۔ میں نے وہ رات (لیلۃُ القدر) دیکھی تھی پھر مجھے بھلا دی گئی۔ میں نے دیکھا تھا کہ میں اس رات کی صبح کو گیلی مٹی پر سجدہ کر رہا ہوں۔ اس لیے تم اسے آخری دس راتوں میں اور طاق راتوں میں تلاش کرو۔"

اس کے بعد اس رات بارش ہوئی۔ مسجد کھجور کی ٹہنیوں اور پتّوں کی تو تھی ہی ٹپکنے لگی۔ میری آنکھوں نے ۲۱ کی صبح کو رسول اللہ ص کی پیشانی پر گیلی مٹی کا نشان دیکھا۔[1]

صحابہ بھی خود رسول اللہ ص کی موجودگی میں زمین پر ہی سجدہ کرنا پسند کرتے تھے۔ امام نَسائی نے اپنی سُنن میں روایت بیان کی ہے کہ

جابِر بن عبداللہ کہتے تھے کہ ہم رسول اللہ ص کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ میں ایک مُٹھی کنکریاں ٹھنڈی کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میں اُٹھا لیتا تھا پھر دُوسرے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ جب سجدہ کرتا تو انھیں وہاں رکھ دیتا جہاں پیشانی رکھنی ہوتی۔[2]

اس کے علاوہ رسول اللہ ص نے فرمایا ہے:

---

[1] صحیح بُخاری جلد ۲ باب الاعتِکاف فِی العَشرِ الاَوَاخِرِ۔
[2] سُنن امام نَسائی جلد ۲ باب تَبرِید الحصی لِلسُّجُودِ عَلَیہِ۔

جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا ۔

میرے لیے تمام زمین سجدہ کرنے اور پاک کرنے کا ذریعہ بنا دی گئی ہے۔[1]

ایک اور حدیثِ نبوی ہے۔ آپ نے فرمایا:

جُعِلَتْ لَنَا الْاَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا وَّجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوْرًا ۔

میرے لیے تمام زمین سجدہ گاہ اور اس کی خاک پاکی کا ذریعہ بنا دی گئی ہے۔[2]

پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان شیعوں کے خلاف اس لیے ضد رکھتے ہیں کہ شیعہ قالینوں کے بجائے مٹی پر سجدہ کرتے ہیں؟

یہاں تک کیسے نوبت پہنچی کہ شیعوں کی تکفیر کی گئی، انھیں بُرا بھلا کہا گیا اور ان پر بہتان باندھا گیا کہ وہ بُت پرست ہیں۔

اگر شیعوں کی جیب یا سوٹ کیس میں سے خاکِ کربلا کی ٹکیہ[3] نکل آئے تو اتنی سی بات پر شیعوں کو سعودی عرب میں کیوں زدوکوب کیا جاتا ہے؟

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ کتاب التیمّم۔

[2] صحیح مسلم جلد ۲ کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ۔

[3] آیت اللہ العظمیٰ آقائے خوئی البیان فی تفسیر القرآن میں فرماتے ہیں:

"شیعہ عقیدے کی رُو سے امام حسینؑ کی قبر کی خاک بھی اللہ کی اسی وسیع و عریض زمین کا ایک حصّہ ہے جسے اس نے اپنے پیغمبرؐ کے لیے طاہر، مُطہّر اور جائے سُجود قرار دیا ہے۔ تاہم کیسی طاہر اور مقدس ہے وہ خاک جو جگر گوشۂ رسولؐ کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور جس میں جوانانِ بہشت کے سردار آرام فرما رہے ہیں! اس خاک کے پہلو میں وہ عظیم ہستی محوِ خواب ہے جس نے اپنے جد رسول اللہؐ کے مقصد کو زندہ کرنے، انسانوں کو آزادی دلانے اور ظلم و ستم کو مٹانے کے لیے اپنے فرزندوں، عزیزوں اور وفادار ساتھیوں کو راہِ خدا میں قربان کر دیا۔ یہ خاک! خاکِ کربلا انسانوں کو راہِ خدا میں جاں بازی اور فداکاری کا سبق سکھاتی ہے، انھیں شرافت و فضیلت کا درس دیتی ہے اور ایک عدیم النظیر جگر دوز

کیا یہی وہ اسلام ہے جو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کا احترام کریں اور کسی کلمہ گو مُوَحِّد مسلمان کی جو نماز پڑھتا ہو، زکوٰۃ دیتا ہو، رمضان کے روزے رکھتا ہو اور بیتُ اللہ کا حج کرتا ہو، توہین نہ کریں۔ کیا کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس یہ تصوّر کرسکتا ہے کہ اگر بعض لوگوں کا یہ الزام درست ہوتا کہ شیعہ پتھروں کی پُوجا کرتے ہیں تو کوئی شیعہ اتنی تکلیف اٹھاکر اور اتنا مالی بوجھ برداشت کرکے حج بیت اللہ اور زیارتِ قبرِ رسولؐ کے لیے آتا؟

کیا اہلِ سُنّت آیتُ اللہ سیّد محمد باقر صدر شہید کے اِس قول سے مطمئن نہیں ہوسکتے، جو میں نے اپنی پہلی کتاب ثُمَّ اهْتَدَيْتُ (تجلّی) میں نقل کیا ہے کہ جب میں نے ان سے خاکِ کربلا پر سجدے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ:

"ہم مٹّی پر اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ مٹّی پر سجدہ کرنے میں اور مٹّی کو سجدہ کرنے میں بہت فرق ہے۔"

اگر شیعہ احتیاط کرتے ہیں کہ ان کا سجدہ پاک جگہ پر ہو اور عِندَاللہ مقبول ہو تو وہ رسول اللہؐ اور ائمۂ اطہار کے حُکم کی تعمیل کرتے ہیں، خصُوصاً ہمارے زمانے میں جب سب مساجد میں موٹے موٹے رُوئیں دار قالینوں کے فرش بچھ گئے ہیں، ان

تاریخی واقعے کی یاد ذہنِ انسانی میں تازہ کرتی ہے۔ انھی وجُوہ کی بنا پر اس خاک کی ایک خاص اہمیت اور عظمت ہے اور اس پر سجدہ کرنا شرعاً صحیح ہے۔ اس سب کے علاوہ خاکِ کربلا کی فضیلت میں متعدد روایات رسول اکرمؐ سے منقول ہیں جو شیعہ اور سُنّی دونوں ذرائع سے آئی ہیں۔"

اُستاذ شہید مرتضیٰ مطہّری اپنی کتاب شہید میں فرماتے ہیں:

"جب رسول اللہؐ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کو مشہور تسبیحات (۳۴ بار اَللّٰهُ اَكْبَر ۳۳ بار اَلْحَمْدُ لِلّٰه اور ۳۳ بار سُبْحَانَ اللّٰه) پڑھنے کو کہا تو وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر پر گئیں اور تسبیح تیار کرنے کے لیے وہاں سے کچھ مٹّی حاصل کی۔ ان کے اس فعل کی کیا اہمیت ہے؟ اس کی اہمیت یہ ہے کہ شہید کی قبر متبرک ہے اور اس کے اِرد گِرد کی مٹّی بھی متبرک ہے۔ انسان کو تسبیحات پڑھنے کے لیے ایک تسبیح کی ضرورت ہوتی ہے اور اس مقصد کے لیے پتھّر، لکڑی اور مٹّی کی بنی ہوئی تسبیح استعمال کی جاسکتی ہے لیکن ہم شہید کی قبر کے پاس کی مٹّی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس سے ہمارا مقصد شہید کی تعظیم بجا لانا ہوتا ہے۔" (ناشر)

قالینوں میں سے بعض کی بناوٹ میں ایسا مواد استعمال کیا جاتا ہے جس سے عام مسلمان ناواقف ہیں۔ یہ قالین مسلمان ملکوں کے بنے ہوئے بھی نہیں ہوتے، اس لیے ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کی بناوٹ میں ایسا مواد استعمال کیا گیا ہو جو جائز نہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم اس شیعہ کو جو نماز کی صحت کا اہتمام کرتا ہو، دھتکار دیں اور محض بے بنیاد شبہ کی وجہ سے اس پر کفر و شرک کا الزام لگائیں؟

شیعہ جو دینی امور میں خیال رکھتا ہے خصوصاً نماز کا جو دین کا ستون ہے اور اس کا اتنا اہتمام کرتا ہے کہ نماز کے وقت اپنی پیٹی اتار دیتا ہے، گھڑی بھی اتار دیتا ہے کیونکہ اس کا تسمہ چمڑے کا ہے جس کی اصل معلوم نہیں۔ بعض اوقات پتلون اتار کر ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہن لیتا ہے اور یہ سب احتیاط اور اہتمام اس لیے کرتا ہے کہ اسے نماز میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ اپنے رب کے سامنے اس حال میں جائے کہ اس کے رب کو اس کی کوئی بات ناپسند ہو۔

کیا ایسا شیعہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جائے، اس سے نفرت کی جائے؟ وہ تو اس قابل ہے کہ اس کا احترام کیا جائے، اس کی تعظیم کی جائے کیونکہ وہ شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے جو تقویٰ کی بنیاد ہے۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو اور صحیح بات کہو!

اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو جس مشغلے میں تم پڑے تھے اس میں تم پر سخت عذاب نازل ہوتا۔ اس وقت جب تم اس کو اپنی زبانوں سے دہرا رہے تھے اور اپنے منہ سے وہ کچھ کہہ رہے تھے جس کا تمھیں علم نہیں تھا اور تم اس کو معمولی بات سمجھتے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی۔ (سورۂ نور۔ آیت ۱۵)

رَجْعَت

رَجْعَت ان مسائل میں سے ہے جن کے صرف شیعہ قائل ہیں۔
میں نے حدیث کی کتابوں میں ڈھونڈا مگر مجھے اس کا کہیں ذکر نہیں ملا۔
بعض صوفی عقائد میں البتہ ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق مغیبات سے ہے۔ جو
ان باتوں کو نہ مانے وہ کافر نہیں ہوتا کیونکہ ایمان نہ ان امور کے ماننے پر موقوف
ہے نہ ان پر اعتقاد سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں یُوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ماننے یا نہ ماننے سے
نہ کوئی نفع ہوتا ہے نہ نقصان۔ یہ صرف روایات ہیں جن کو شیعہ ائمۂ اطہار
سے روایت کرتے ہیں کہ

> اللہ سُبحانہٗ، بعض مؤمنین اور بعض مجرمین مُفسدین کو
> زندہ کرے گا تاکہ مومنین آخرت سے پہلے دنیا ہی میں اپنے
> دشمنوں سے انتقام لے لیں۔

اگر یہ روایتیں صحیح ہیں — اور شیعوں کے نزدیک تو یہ صحیح اور متواتر ہیں
— جب بھی یہ اہلِ سُنّت کو پابند نہیں بناتیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان پر اعتقاد
رکھنا اس لیے واجب ہے کہ اہلِ بیت نے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
سے روایت کیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ ہم نے بحث میں انصاف اور بے تعصّبی کا
عہد کیا ہوا ہے۔

اِس لیے ہم اہلِ سُنّت کو انھی روایات کا پابند سمجھتے ہیں جو اُن کی اپنی
حدیث کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔ چونکہ رَجْعَت کی احادیث ان کی اپنی کتابوں
میں نہیں آئی ہیں اِس لیے وہ ان کو قبول نہ کرنے میں آزاد ہیں اور یہ بھی جب
ہے، جب کوئی شیعہ ان روایات کو ان پر مسلّط کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن شیعہ کسی کو رَجْعَت کا قائل ہونے پر مجبور نہیں کرتے اور نہ وہ یہ کہتے
ہیں کہ جو رَجْعَت کا قائل نہیں وہ کافر ہے۔ اِس لیے کوئی وجہ نہیں کہ شیعہ، جو

رجعت کے قائل ہیں اُن کو اِس قدر بُرا بھلا کہا جاتا اور ان کے خلاف اس قدر شور وغوغا برپا کیا جاتا ہے!

شیعہ مسئلۂ رجعت کا ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ثابت ہیں اور جن کی تائید بعض آیات سے بھی ہوتی ہے، جیسے:

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ.

اور جس دن ہم ہر اُمّت میں سے ایک ایک گروہ ان لوگوں کا جمع کریں گے جو ہماری آیتوں کو جھٹلایا کرتے تھے اور ان کی صف بندی کی جائے گی۔ (سورۂ نمل - آیت ۸۳)

تفسیرِ قمیؒ میں ہے کہ

امام جعفر صادقؑ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ لوگ اِس آیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں کہ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا ؟ حمّاد کہتے ہیں کہ میں نے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ اس کا تعلّق روزِ قیامت سے ہے۔ امامؑ نے کہا: یہ بات نہیں، یہ آیت رجعت کے بارے میں ہے، قیامت میں کیا اللہ تعالیٰ ہر اُمّت میں سے صرف ایک ایک گروہ کو اکٹھا کرے گا اور باقی کو چھوڑ دے گا؟ قیامت بارے میں دُوسری آیت ہے:

وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا.

اور ہم ان سب کو جمع کریں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ (سورۂ کہف - آیت ۴۷)

شیخ محمد رضا مظفرؒ کی کتاب عقائد الامامیہ میں ہے:

اہلِ بیت علیہم السلام سے جو روایات آئی ہیں ان کی بنا پر شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مُردوں میں سے کچھ کو اسی دنیا میں زندہ کرے گا، ان کی شکلیں وہی ہوں گی جو ان کی زندگی میں تھیں۔ پھر ان میں سے ایک گروہ کو عزت دے گا اور ایک گروہ

کو ذلیل کرے گا۔ اس وقت حق پرست، باطل پرستوں سے، اور مظلوم، ظالموں سے بدلہ لیں گے۔ بدلہ لینے کا یہ واقعہ قائم آلِ محمدؑ کے ظہور کے بعد ہوگا۔

رَجعت صرف ان مومنین کی ہوگی جن کے ایمان کا درجہ بہت بلند تھا اور مفسدین میں سے صرف ان کی جو حد درجہ فسادی تھے اس کے بعد یہ لوگ پھر مرجائیں گے اور روزِ قیامت دوبارہ محشور ہوں گے اور ان کو ان کے استحقاق کے مطابق ثواب و عذاب دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان دوبارہ زندگی پانے والوں اور لوٹ کر آنے والوں کی ایک تمنّا کا بھی ذکر کیا ہے۔ جب دوسری دفعہ بھی ان کی اصلاح نہیں ہوگی اور خدا کے غضب کے سوا انھیں کچھ نہیں ملے گا، تو یہ تیسری دفعہ دنیا میں آنے کی تمنّا کریں گے:

قَالُوا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ.

اور وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! تُو نے ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دی سو اب ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، تو کیا کوئی صورت ہے نکلنے کی؟ (سورۂ مومن۔ آیت ۱۱)

میں کہتا ہوں کہ اگر اہلِ سنّت والجماعت رَجعت پر یقین نہیں رکھتے، تو انھیں اس کا پورا حق ہے، لیکن انھیں یہ حق نہیں ہے کہ جو اس کے قائل ہیں اور جن کے نزدیک یہ نصوص سے ثابت ہے ان کو بُرا بھلا کہیں، اِس لیے کہ کسی شخص کا کسی بات کو نہ جاننا اس کی دلیل نہیں کہ جو شخص جانتا ہے وہ غلطی پر ہے اسی طرح کسی کے کسی چیز کو نہ ماننے یا نہ جاننے کا یہ مطلب نہیں کہ اس چیز کا وجود ہی نہیں۔ مسلمانوں کے کتنے ہی ناقابلِ تردید دلائل ہیں جنھیں اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ تسلیم نہیں کرتے۔

اہلِ سنّت کی بھی کتنی ہی روایات اور کتنے ہی اعتقادات ایسے ہیں خصوصاً

وہ جن کا تعلّق اولیاء اور صُوفیاء سے ہے جو ناممکن اور کریہہ نظر آتے ہیں، لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں کہ اہلِ سُنّت کے عقیدے کی مذمّت کی جائے اور اس سے ڈرایا جائے۔

رَجعت کا ثبوت قرآن اور سُنّتِ نبوی میں ملتا ہے اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ناممکن اور محال بھی نہیں ہے۔ خُود قرآن شریف میں رَجعت کی کتی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے:

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ.

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا جسے ایک گاؤں میں جو اپنی چھتوں کے بَل گِر چکا تھا اتفاقِ گُزر ہوا تو اس نے کہا کہ اللہ اس بستی کے باشندوں کو مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا، تو اللہ نے اس کی رُوح قبض کرلی اور اس کو سو سال تک مُردہ رکھا، پھر زندہ کردیا۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۲۵۹)

یا ایک اور آیت میں ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ.

کیا تمھیں ان لوگوں کی خبر ہے جو شمار میں ہزاروں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے، تو اللہ نے ان سے کہا کہ مرجاؤ، پھر انھیں زندہ کردیا۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۲۴۳)

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو پہلے موت دے دی اور پھر انھیں زندہ کردیا:

وَاِذْ قُلْتُمْ یَا مُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ

بَعَثْنَا کُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔

اور جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰؑ! ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو سامنے نہیں دیکھ لیں گے۔ اس پر تمھارے دیکھتے دیکھتے بجلی کی کڑک نے آکر تمھیں دبوچ لیا۔ پھر موت آجانے کے بعد ہم نے تمھیں از سرِ نو زندہ کر دیا تاکہ تم احسان مانو۔

(سورۂ بقرہ - آیت ۵۶)

اصحابِ کہف تین سو سال سے زیادہ غار میں مُردہ پڑے رہے:

ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا۔

پھر ہم نے انھیں زندہ کر کے اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ ان دونوں گروہوں میں سے کونسا گروہ اس حالت میں رہنے کی مدت سے زیادہ واقف ہے۔

(سورۂ کہف - آیت ۱۲)

دیکھیے، کتاب اللہ کہتی ہے کہ سابقہ اُمتوں میں رَجعت کے واقعات ہوتے رہے ہیں، تو اُمتِ محمدیہ میں بھی ایسے کسی واقعہ کا وُقوع پذیر ہونا ناممکن نہیں ہے، خصوصاً جبکہ ائمۂ اہلِ بیت اس کی خبر دے رہے ہوں جو سچے ہیں اور باخبر ہیں۔

بعض بے جا دخل اندازی کرنے والے کہتے ہیں کہ رَجعت کو تسلیم کرنا تناسُخ (آواگون) کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے جو کہ کُفّار کا عقیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے اور اس کا مقصد محض شیعوں پر الزام تراشی اور انھیں بدنام کرنا ہے۔

تناسُخ کے ماننے والے یہ نہیں کہتے کہ انسان اسی جسم، اسی رُوح اور اسی شکل کے ساتھ دنیا میں واپس آتا ہے۔ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی جو مر جاتا ہے، اس کی رُوح ایک دوسرے انسان کے جسم میں جو دوبارہ پیدا ہوتا ہے داخل ہو جاتی ہے بلکہ اس کی رُوح کسی جانور کے جسم میں بھی داخل ہو سکتی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے یہ عقیدہ اس اسلامی عقیدے سے بالکل مختلف ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ مُردوں کو اسی جسم اور اسی رُوح کے ساتھ اٹھاتا ہے۔ رَجعت کا تناسُخ

سے قطعاً کوئی تعلّق نہیں - یہ ان جاہلوں کا کہنا ہے جو شِیعہ اور شیُوعِیّہ[1] میں بھی تمیز نہیں کر سکتے -

مہدیٔ منتظر علیہ السلام

مہدیٔ مَوعود کا مسئلہ بھی ان موضوعات میں شامل ہے جن کی وجہ سے اہلِ سُنّت شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ بعض تو اِس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ تمسخر و استہزاء سے بھی نہیں چوکتے - کیونکہ اہلِ سُنّت اس کو بعید از عقل اور محال سمجھتے ہیں کہ کوئی انسان بارہ سو برس تک زندہ مگر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے -

بعض ہمعصر مصنّفین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شیعوں نے امام غائب کا خیال اس لیے گھڑا ہے کہ انھیں مختلف ادوار میں کثرت سے حکمرانوں کے ظلم و ستم سہنے پڑے ہیں چنانچہ انھوں نے اس تصور سے اپنے دل کو تسلّی دے لی کہ مہدیٔ منتظرؑ کے زمانے میں) جو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے نہ صرف انھیں امن چین نصیب ہوگا بلکہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا بھی موقع ملے گا۔

پچھلے چند سالوں میں مہدیٔ منتظرؑ کے ظہور سے متعلق چرچا بڑھ گیا ہے، خصُوصاً ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد جب پاسدارانِ انقلاب نے یہ اپنا خاص طریقہ اور شِعار بنا لیا کہ وہ اپنی دُعاؤں میں امام خمینی کے لیے یہ دُعا کرتے تھے کہ

خُدایا خُدایا تا انقلابِ مہدیؑ خمینی را نگہدار!

اس وقت سے مسلمان اور خصوصاً تعلیم یافتہ مسلمان یہ پوچھنے لگے کہ مہدیؑ کی اصلیت کیا ہے - کیا اسلامی عقائد میں مہدی کا واقعی وُجود ہے یا یہ محض شیعوں کی من گھڑنت ہے۔

اگرچہ شیعہ علماء نے ہر دَور میں مہدی سے متعلق کتابیں لکھی ہیں اور

---

[1] شیُوعِیّہ کے معنیٰ ہیں کمیونزم -

دادِ تحقیق دی ہے۔ نیز شیعہ اور سُنّی عُلما، کو اکثر کانفرنسوں وغیرہ میں ایک دُوسرے سے ملنے اور عقائد سے متعلق مختلف مسئلوں پر گفتگو کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے، اس کے باوجود اہلِ سُنّت کے لیے یہ موضوع چیستان بنا ہوا ہے اس لیے کہ انھیں اس سے متعلق روایات سُننے کا کم ہی اتفاق ہوتا ہے۔

اسلامی عقائد میں مہدیٔ منتظرؑ کی حقیقت کیا ہے ؟

اِس بحث کے دو جزو ہیں :- پہلے جزو کا تعلق کتاب وسُنّت کے حوالے سے مہدی کی بحث سے ہے اور دوسرے کا تعلق مہدی کی زندگی، ان کے غائب ہونے اور دوبارہ ظاہر ہونے سے ہے۔

جہاں تک اس بحث کے پہلے جزو کا تعلق ہے، شیعہ اور سُنّی دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہؐ نے مہدی کی بشارت دی ہے۔ آپ نے اپنے اصحاب کو بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ مہدی کو آخری زمانے میں ظاہر کرے گا۔ مہدی کی احادیث شیعہ اور اہلِ سُنّت دونوں کی معتبر کتابوں میں ملتی ہیں۔

میں اپنی عادت کے مطابق صرف ان روایات سے استدلال کروں گا جن کو اہلِ سُنّت صحیح اور معتبر سمجھتے ہیں۔

سُننِ ابو داؤد میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اگر دُنیا کا فقط ایک دن باقی رہ جائے تو اس ایک ہی دن کو اللہ تعالیٰ اتنا طُول دے گا کہ اس میں ایک شخص کو بھیجے گا جس کا نام میرے نام پر ہوگا اور اس کی کنیت میری کنیت پر ہوگی۔ وہ زمین کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظُلم وستم سے بھری ہوئی ہوگی۔[1]

ابنِ ماجہ میں ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا : ہم اہلِ بیت کے لیے اللہ نے دنیا سے

---

[1] سُننِ ابو داؤد جلد ۲ صفحہ ۴۲۲ -

زیادہ آخرت کو پسند کیا ہے۔ میرے بعد میرے اہلِ بیت کو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا، انھیں دھتکارا جائے گا۔ پھر ایک قوم مشرق کی طرف سے آئے گی جس کے ساتھ کالے جھنڈے ہوں گے وہ لوگ بھلائی مانگیں گے مگر انھیں ملے گی نہیں۔ اِس پر وہ لڑیں گے اور کامیاب ہوں گے۔ پھر جو وہ مانگتے تھے اس کی انھیں پیشکش کی جائے گی مگر وہ قبول نہیں کریں گے۔ آخر وہ (حکومت) میرے اہلِ بیت میں سے ایک شخص کے حوالے کر دیں گے جو زمین کو جو ظُلم سے بھری ہوئی ہوگی، انصاف سے بھر دے گا۔[1]

سُنن ابنِ ماجہ میں ہے:

رسول اللہ ؐ نے فرمایا: مہدی ہم اہلِ بیت سے ہے، مہدی فاطمہ ؑ کی اولاد سے ہوگا۔

سُنن ابن ماجہ ہی میں ہے کہ

رسول اللہ ؐ نے فرمایا: میری اُمت میں مہدی ہوگا۔ اس کا زمانہ اگر کم ہوا تو سات سال ورنہ نو سال ہوگا۔ اس عرصے میں میری اُمّت کو وہ آرام واطمینان نصیب ہوگا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ غلّہ کی اتنی فراوانی ہوگی کہ ذخیرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جو شخص مہدی سے کچھ مانگے گا وہ اسے مل جائے گا۔[2]

صحیح ترمذی میں آیا ہے:

رسول اللہ ؐ نے فرمایا: ایک شخص میری اُمّت میں سے حُکمراں ہوگا۔ اس کا نام وہی ہوگا جو میرا نام ہے۔ اگر قیامت آنے میں ایک دن بھی باقی ہوگا تو اللہ اس دن کو اتنا طویل

---

[1] سُننِ ابنِ ماجہ حدیث نمبر ۴۰۸۲ -

[2] سُننِ ابنِ ماجہ حدیث نمبر ۴۰۸۶ -

کردے گا کہ یہ شخص حکمراں ہو سکے گا۔[1]

رسول اللہ ص نے فرمایا: دنیا اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک حکومت ایک عرب کو نہ مل جائے جو میرے اہل بیت میں ہوگا اور جس کا نام میرے نام پر ہوگا۔[1]

صحیح بخاری میں ابو قتادہ انصاری کے آزاد کردہ غلام نافع سے روایت ہے، کہ ان سے ابو ہریرہ نے کہا کہ

رسول اللہ ص نے فرمایا: کیسا ہوگا جب ابنِ مریم ع تم میں نازل ہوں گے اور تمھارے امام تم میں سے ہوں گے۔[2]

قاضی ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ

اس بارے میں متواتر احادیث ہیں کہ اس امت میں مہدی ہوں گے۔ اور عیسیٰ بن مریم ع آسمان سے اتر کر آئیں گے اور مہدی کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔[3]

ابن حجر مکی ہیثمی نے صواعقِ محرقہ میں لکھا ہے:

ظہور مہدی کی متواتر احادیث بکثرت آئی ہیں۔[4]

صاحبِ غایۃ المأمول کہتے ہیں کہ:

قدیم زمانے سے علماء میں یہ مشہور ہے کہ آخری زمانے میں اہل بیت میں ایک شخص کا ضرور ظہور ہوگا جسے مہدی کہا جائے گا۔ مہدی کی احادیث بہت سے صحابہ نے روایت کی ہیں اور اکابر محدثین نے انھیں اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، جیسے: ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، طبرانی، ابویعلیٰ، بزاز،

---

[1] جامع ترمذی جلد ۹ صفحہ ۷۴-۷۵

[2] صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۴۳ باب نزول عیسیٰ بن مریم ع۔

[3] فتح الباری جلد ۵ صفحہ ۳۶۲

[4] صواعق محرقہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۱۔

امام احمد بن حنبل، حاکم، وغیرہ - جس نے بھی مہدی سے متعلق تمام احادیث کو ضعیف کہا ہے وہ غلطی پر ہے۔

مُعاصِرین میں سے اخوانُ المسلمین کے مفتی سیّد سابق نے اپنی کتاب العقائدالإسلامیہ میں مہدی کی احادیث نقل کی ہیں۔ ان کے نزدیک مہدی کا تصوّر اسلامی عقائد کا جزُو ہے جس کی تصدیق واجب ہے۔

شیعہ کتابوں میں بھی مہدی کی احادیث کثرت سے نقل کی گئی ہیں۔ یہ تک کہا گیا ہے کہ احادیثِ مہدی سے زیادہ کوئی حدیث رسول اللہ ص سے روایت نہیں کی گئی ہے۔

محقّق لطف اللہ صافی گلپائیگانی نے اپنی مُفصّل کتاب منتَخَبُ الأثر میں مہدی علیہ السلام کے متعلق احادیث ساٹھ سے زیادہ سُنّی ماخذوں سے نقل کی ہیں، ان میں صِحاحِ سِتّہ بھی شامل ہیں اور نوّے سے زیادہ شیعہ ماخذوں سے نقل کی ہیں جن میں کُتبِ اربعہ بھی شامل ہیں۔ [1]

---

[1] اسلام میں مہدی پر اعتقاد کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ بعض علماء نے اس عقیدے کو دین کے واجبات میں شمار کیا ہے۔ مہدی کی خصوصیات اور شخصیت کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے متعلق زیادہ تر روایات صحیح ہیں اور جو خوشخبری ان کے بارے میں دی گئی ہے وہ متواتر ہے۔

اس سلسلے میں یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ جیسا کہ مشہور مؤرخ طبَری نے لکھا ہے:

> "مہدی کی غَیبت سے متعلق روایات شیعہ مُحدّثین نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی زندگی ہی میں (یعنی ولادتِ مہدی سے ۱۵۰ سال پہلے) اپنی کتابوں میں درج کردی تھیں۔ یہ امر بجائے خود ان روایات کی صحّت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔"

صحیح بُخاری اور صحیح مُسلم میں کئی مقامات پر مہدی کے بارے روایات بلاواسطہ نقل کی گئی ہیں اور اسی قبیل کی تقریباً پچاس احادیث دوسری معروف تالیفات میں بھی درج ہیں، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

دوسری بحث مہدی کی ولادت، ان کی زندگی، ان کی غیبت اور ان کی عدم وفات سے متعلق ہے۔

یہاں بھی علمائے اہلِ سُنّت کی ایک خاصی بڑی تعداد یہ مانتی ہے کہ مہدی، محمّد بن الحسن العسکری ہیں جو ائمۂ اہلِ بیت میں سے بارہویں امام ہیں وہ زندہ موجود ہیں اور آخری زمانے میں ظاہر ہو کر زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ ان سے دین کو کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ علمائے اہلِ سُنّت اس طرح شیعہ امامیہ کے اقوال کی تائید کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض علماء کے نام یہ ہیں:

۱۔ محی الدین ابنِ عربی	سنہ ۶۳۸ھ	فتوحاتِ مکیہ
۲۔ سبط ابن جوزی	سنہ ۶۵۴ھ	تذکرۃُ الخواص
۳۔ عبدالوہاب شعرانی مصری	سنہ ۹۷۶ھ	عقائدُ الاکابر
۴۔ ابن خشّاب	سنہ	تواریخ موالید الائمّہ و وفیاتہم
۵۔ محمد بُخاری حنفی	سنہ	فصلُ الخطاب

جامع ترمذی، سُنن ابنِ ماجہ، سُننِ ابو داؤد، مُسند احمد بن حنبل، مُعجم طبرانی، طبقاتِ ابنِ سعد مُستدرکِ حاکم، صواعقِ مُحرقہ، منہاجُ السنۃ النبویہ، ینابیعُ المودۃ، دلائلُ النبوۃ، فتُوحاتِ مکیہ، الملاحم تاریخ بغداد اور کتابُ الفِتَن۔

ان معتبر مآخذ میں رسولِ اکرم ص سے تقریباً پچاس ایسی احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں یوم قیامت سے پیشتر مہدی کے ظہور کے بارے میں واضح پیشین گوئی کی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر احادیث صحیح ہیں اور ان کو ۳۳ معروف صحابیوں اور صحابیات نے آنحضرت ص سے بلا واسطہ نقل کیا ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

امام علی - امام حُسین - ابو سعید خُدری - عبداللہ بن مسعود - ثوبان ابو ہُریرہ - اَنَس بن مالک - جُبیر بن عبداللہ - عُثمان بن عفّان - عَوف بن مالک - طلحہ بن عُبیداللہ - حُذیفہ بن یمان - عِمران بن حصین - عبداللہ بن عُمر - اُمّ سلمہ - اُمّ حبیبہ - عائشہ - عبدالرحمٰن بن عوف - ابو ایوب انصاری - عبّاس بن عبدالمطّلب - ابنِ عبّاس اور عمّار بن یاسر۔

(ناشر)

٦ - احمد بن ابراہیم بلاذری	ســ ھ	الحدیث المتسلسل
٧ - ابن الصباغ مالکی	٨٥٥ھ	الفصول المہمۃ
٨ - العارف عبدالرحمٰن	ســ ھ	مرآۃ الأسرار
٩ - کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی	٦٥٢ھ	مطالب السؤل فی مناقب آل الرسولؑ
١٠ - سلیمان ابراہیم قندوزی حنفی	١٢٩٤ھ	ینابیع المودۃ

اگر کوئی شخص تتبّع اور تحقیق سے کام لے تو ایسے علماء کی تعداد جو مہدیؑ کی ولادت، اور ان کے اس وقت تک زندہ باقی رہنے میں یقین رکھتے ہیں جب تک ان کا ظاہر ہونا اللہ کو منظور نہ ہو، اس سے کئی گُنا بڑھ جائے گی -

اس کے بعد وہ اہلِ سُنّت باقی رہ جاتے ہیں جو احادیث کی صحّت کا اعتراف کرنے کے باوجود مہدی کی ولادت اور ان کے زندہ باقی رہنے کا انکار کرتے ہیں، ان کا یہ انکار دوسروں پر حُجّت نہیں، کیونکہ ان کا ان باتوں سے انکار اور ان کو مستبعد سمجھنے کی وجہ محض ضد اور تعصب ہے، ورنہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں -

قرآن کریم کسی ایسے نظریے کی نفی نہیں کرتا بلکہ خود اللہ نے متعدد مثالیں بیان کی ہیں تاکہ جمُود کا شکار لوگ آزادی سے سوچ سکیں اور اپنی عقلوں کی باگ ذرا ڈھیلی چھوڑ دیں تاکہ انھیں یقین آجائے اور وہ مان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد معجزات اپنے پیغمبروں کے واسطے سے دکھائے ہیں تاکہ مُعانِدین صرف ان چیزوں کے ساتھ نہ چمٹے رہیں جو ان کی محدود اور ناقص عقلوں کے مطابق ممکنُ الوقوع ہیں یا وہ ایسے واقعات ہیں جو عام طور پر ہوتے رہتے ہیں -

لیکن !

☆ وہ مسلمان جس کا دل نُورِ ایمان سے روشن ہے اسے اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ اللہ نے عُزَیرؑ کو سو سال تک مردہ رکھنے بعد پھر زندہ کر دیا - حضرت عُزَیرؑ نے اپنی کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھا تو وہ ابھی تک خراب نہیں ہوتی تھیں، اپنے گدھے کو دیکھا تو اللہ نے اس کی ہڈیاں درست کر دیں اور ان پر گوشت چڑھا دیا - گدھا دوبارہ ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا - حالانکہ اس کی ہڈیاں گل سڑ چکی تھیں حضرت عُزَیرؑ نے یہ سب دیکھ کر کہا : میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے -

دیکھیے! کتنی جلدی حضرت عُزیرؑ کے خیالات بدل گئے - ابھی تو اُجڑی ہوئی بستی کو دیکھ کر انھوں نے حیرت سے کہا تھا کہ اسے موت کے بعد اللہ کیسے زندہ کرے گا؟

☼ جو مسلمان قرآنِ کریم میں یقین رکھتا ہے، اسے اس بات پر کوئی حیرانی نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے پرندوں کے ٹکڑے کرکے ان کے اَجزاء پہاڑوں پر بکھیر دیے اور پھر جب ان کو بُلایا تو وہ دوڑتے ہوئے آگئے۔

☼ وہ باایمان مسلمان جسے اس پر کوئی حیرانی نہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا، تو وہ آگ ٹھنڈی ہوگئی، اور اس نے حضرت ابراہیمؑ کو نہ جلایا اور نہ کوئی ضرر پہنچایا۔

☼ وہ باایمان مسلمان جسے اس پر کوئی حیرانی نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور وہ ابھی زندہ ہیں اور ایک نہ ایک دن زمین پر واپس آئیں گے

☼ وہ باایمان مسلمان جسے اس پر کوئی حیرانی نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور پیدائشی مبروص اور اندھے کو اچھّا کر دیتے تھے۔

☼ وہ باایمان مسلمان جسے اس پر کوئی حیرانی نہیں کہ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے لیے سمندر پھٹ گیا تھا اور یہ لوگ اس کے بیچ میں سے اس طرح گزر گئے تھے کہ ان کے بدن بھی گیلے نہیں ہوتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کا عصا سانپ بن گیا تھا اور دریائے نیل کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا تھا۔

☼ وہ باایمان مُسلمان جسے اس پر تعجّب نہیں کہ حضرت سلیمانؑ پرندوں، جنّوں اور چیونٹیوں سے باتیں کیا کرتے تھے، ان کا تخت ہوا پر اُڑتا تھا اور وہ لمحوں میں ملکۂ بلقیس کا تخت منگوا لیتے تھے۔

☼ وہ باایمان مُسلمان جسے اس پر کوئی تعجّب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو نو اُوپر تین سو سال تک مُردہ رکھا اور پھر زندہ کر دیا کہ پوتے کے پوتے کی عُمر دادا کے دادا سے زیادہ ہوگئی۔

☼ وہ باایمان مسلمان جسے اس پر تعجّب نہیں کہ حضرت خضرؑ جن کی ملاقات حضرت موسیٰؑ سے ہوئی تھی زندہ سلامت ہیں۔

☆ وہ باایمان مُسلمان جسے اس پر تعجّب نہیں کہ ابلیس ملعون زندہ ہے حالانکہ وہ حضرت آدمؑ سے بھی پہلے کی مخلوق ہے اور ساری تاریخ الانسانیت اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزری اور وہ ہر موڑ پر اس کے ساتھ رہا ہے۔ وہ خود پوشیدہ ہے۔ اس کی بداعمالیوں سے سب واقف ہیں، نہ کسی نے اس کو دیکھا ہے اور نہ کوئی دیکھے گا، وہ اور اس کے چیلے چانٹے سب لوگوں کو دیکھتے ہیں مگر ان کو کوئی نہیں دیکھتا۔

☆ پس جو مُسلمان ان سب باتوں پر یقین رکھتا ہے اور ان کے وقوع پذیر ہونے پر اسے کوئی حیرانی نہیں ہوتی، اس کے لیے اس میں کیا تعجّب کی بات ہے کہ مہدی ایک عرصے تک اللہ تعالیٰ کی کسی مصلحت کی وجہ سے پوشیدہ رہیں؟

جن واقعات کا ہم نے ذکر کیا ہے اس سے کئی گُنا زیادہ غیر معمولی واقعات قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ خارق العادت واقعات عام طور پر نہیں ہوتے، نہ لوگ ان سے مانوس ہیں بلکہ سب لوگ مل کر بھی چاہیں تو اس قسم کے واقعات پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہ سب اللہ کے اپنے کیے ہوتے کام ہیں اور اللہ کو کوئی چیز زمین میں ہو یا آسمان میں کسی کام کے کرنے سے نہیں روک سکتی۔ مسلمان ان باتوں کی تصدیق کرتے ہیں کیونکہ قرآن میں جو کچھ آیا ہے مسلمان اس پر بغیر کسی استثناء یا ذہنی تحفّظ کے ایمان لاتے ہیں۔

اِس کے علاوہ، مہدی سے متعلق اُمور سے شیعہ زیادہ واقف ہیں کیونکہ مہدی ان کے امام ہیں اور شیعہ ان کے اور ان کے آباء واجداد کے ساتھ رہے ہیں، مثل مشہور ہے کہ

اَھلُ مَکَّۃَ اَدرٰی بِشِعَابِھَا

مکے کی وادیوں کو اہلِ مکہ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا۔

شیعہ اپنے ائمہؑ کا احترام اور تعظیم کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ائمہ کی قبروں کو پختہ اور شاندار بنایا ہے جو زیارت گاہِ خلائق ہیں۔ اگر بارہویں امام حضرت مہدی علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہوتی تو آج ان کی قبر بھی مشہور ہوتی۔ شیعہ یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ مرنے کے بعد زندہ ہوں گے۔ کیونکہ دوبارہ زندہ ہونا ممکن ہے

جیساکہ قرآن میں متعدد ایسے واقعات کا ذکر ہے۔ اور شیعہ تو رجعت کے بھی قائل ہیں۔

لیکن شیعہ من گھڑت اور فرضی باتیں نہیں کرتے، نہ وہ بہتان باندھتے ہیں نہ خیالی دنیا میں رہتے ہیں، جیساکہ ان کے متعصّب دشمن سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کا اصرار اس پر ہے کہ امام مہدی علیہ السلام زندہ ہیں، ان کو اللہ کی طرف سے رزق ملتا ہے، وہ اللہ کی کسی مصلحت کے تحت پوشیدہ ہیں۔ ممکن ہے کہ راسخون فی العلم کو یہ مصلحت معلوم بھی ہو۔ شیعہ اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں:

عَجَّلَ اللّٰهُ تَعَالیٰ فَرَجَهٗ.

کیونکہ مہدی کے ظہور سے مسلمانوں کی عزّت و حرمت، کامیابی و کامرانی اور صلاح و فلاح وابستہ ہے۔

امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں شیعہ سُنّی اختلاف کوئی ٹھوس اور حقیقی اختلاف نہیں ہے کیونکہ اہلِ سُنّت کا بھی عقیدہ ہے کہ امام مہدی آخری زمانے میں ظاہر ہوں گے، زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے، ان کے دور میں مسلمان تمام روئے زمین کے مالک ہوں گے خوشحالی عام ہوگی اور کوئی غریب نہیں رہے گا۔

اختلاف فقط اس میں ہے کہ شیعہ کہتے ہیں کہ ان کی ولادت ہو چکی ہے جبکہ اہلِ سُنّت کہتے ہیں کہ وہ ابھی پیدا ہوں گے[1]

لیکن اس بات پر فریقین کا اتفاق ہے کہ ان کا ظہور قیامت کے قریب ہوگا اس لیے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے اور پرانے زخموں پر پھایا رکھنے کے لیے سب مسلمانوں کو چاہیے کہ مل کر کیا شیعہ کیا سُنّی خلوص سے اپنی دُعاؤں اور نمازوں میں اللہ تعالیٰ سے التجا کریں کہ وہ امام مہدی کے ظہور میں جلدی فرمائے،

---

[1] یہ اسی خیال کا شاخسانہ تھا کہ انڈونیشی خاتون زہرہ فونا نے مہدی کی والدہ ہونے کا ڈرامہ رچایا۔ اور یہ کہ متعدد لوگوں نے مختلف زمانے میں "مہدویت" کا جھوٹا دعویٰ کیا۔
(ناشر)

کیونکہ ان کے ظہور میں اسلام اور مسلمانوں کی عزّت ہے اور ان کے خُروج سے اُمّت محمّدیہ کی کامیابی و خوشحالی وابستہ ہے۔ بلکہ پوری انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے کہ مہدی آکر زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں۔

سب مسلمان کیا سُنّی اور کیا شیعہ امام مہدی کے آنے پر یقین رکھتے ہیں خواہ اہلِ سُنّت کے قول کے بموجب وہ پیدا ہوں یا شیعوں کے کہنے کے مطابق وہ غائب رہنے کے بعد ظاہر ہوں۔

اہم بات یہ ہے کہ یہ کوئی فرضی اور خیالی قصہ نہیں ہے جیساکہ بعض شرپسند ظاہر کرنا چاہتے ہیں، بلکہ مہدی کی شخصیت ایک حقیقی شخصیت ہے جس کی بشارت رسول اللہؐ نے دی ہے اور جواب پوری انسانیت کا خواب بن گئی ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ یہ عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی عقیدہ ہے کہ ایک مُنجی یا نجات دہندہ آئیگا جو دنیا کی اصلاح کرے گا۔ اس نجات دہندہ کے یہود و نصاریٰ بھی منتظر ہیں، اِسی لیے مہدی کے دادا نبیِٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کا نام "مہدیِٔ مُنتَظَر" رکھا ہے۔

اے اللہ! سب مسلمانوں کو خیر و تقوایٰ کی توفیق دے، ان کی صفوں میں اتّحاد اور دلوں میں اتفاق پیدا کر، ان کی خرابیوں کی اصلاح کر، اور انھیں دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی عطا کر۔

ائمہؑ کی محبّت میں غلُوّ

یہاں غلُوّ سے مراد حق کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کا اتباع کرنا اور محبوب کو معبود بنا لینا نہیں، ایسا کرنا تو کُفر و شرک ہے جس کا کوئی مسلمان جو اسلام کے پیغام اور حضرت محمدؐ کی رسالت پر یقین رکھتا ہو قائل نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہؐ نے محبت کی حُدود مقرر کر دی تھیں جب آپ نے امام علی علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ:

هَلَكَ فِيكَ اثْنَانِ مُحِبٌّ غَالٍ وَمُبْغِضٌ قَالٍ.

تمھارے بارے میں اپنے خیالات کی بنا پر دو طرح کے لوگ ہلاک ہوجائیں گے، ایک حد سے زیادہ محبّت کرنے والا اور دوسرا حد سے زیادہ بُغض رکھنے والا۔

رسول اللہؐ کا ایک اور قول ہے:

یَا عَلِیُّ اِنَّ فِیْکَ مَثَلاً مِّنْ عِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ اَبْغَضَتْهُ الْیَهُوْدُ حَتّٰی بَهَتُوْا اُمَّهٗ وَاَحَبَّهُ النَّصَارٰی حَتّٰی اَنْزَلُوْهُ بِالْمَنْزِلَةِ الَّتِیْ لَیْسَ بِهَا.

اے علیؑ! تمھاری مثال عیسیٰ بن مریمؑ کی سی ہے۔ یہودی ان سے اتنا بُغض رکھتے تھے کہ ان کی والدہ پر بُہتان باندھتے تھے۔ اور عیسائیوں نے ان سے ایسی محبّت کی کہ انھیں اس درجے پر پہنچا دیا جس درجے پر وہ نہیں تھے۔[1]

غلوّ یہ ہے کہ محبّت کسی پر اس طرح چھا جائے کہ وہ محبُوب کو معبُود بنا دے اور اس کو وہ درجہ دے دے جس کا اس سے کوئی تعلّق نہیں یا بُغض اس قدر غالب آجائے کہ بُہتان باندھنے اور جھوٹے اِتّہام لگانے لگے۔

شیعوں نے علیؑ اور اولادِ علیؑ میں سے ائمہ کی محبت میں غلوّ نہیں کیا بلکہ انھیں وہی درجہ دیا جو رسول اللہؐ نے دیا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ آپ کے وصی اور خلیفہ تھے۔ اُلوہیت تو کجا کوئی شیعہ ائمہ کی نبوت کا بھی قائل نہیں۔ فتنہ انگیزوں کو چھوڑیے جو یہ تک کہتے ہیں کہ "شیعہ تو علیؑ کو خدا مانتے ہیں"۔[2] اگر یہ صحیح ہے

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۳ - حافظ ابن عساکر تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۲۳۴ - امام نسائی خصائص امیر المؤمنین - امام بخاری تاریخ کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۸۱ - حافظ سیوطی تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۷۳ - محبّ طبری ذخائر العقبیٰ صفحہ ۹۲ - ابن حجر صواعق محرقہ صفحہ ۷۴۔

[2] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کو یہ بتا دیا جائے کہ جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ کی شخصیت کو اور یہودیوں نے حضرت عُزیرؑ کی شخصیت کو ایک سماوی جوہر بنا دیا تھا اسی طرح مسلمانوں میں سے کچھ بدعقیدہ لوگوں نے حضرت علیؑ کو خدائی کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ انسان کو خُدا بنانے کا

کہ کچھ لوگ واقعی ایسا مانتے ہیں تو ان کا تعلق نہ شیعوں سے ہے نہ خوارج سے۔ بہرحال یہ شیعوں کا قصور نہیں کہ قرآن کہتا ہے:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى

اے رسولؐ! اپنی اُمّت سے کہہ دیجیے کہ میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا بجز اپنے قرابتداروں سے مَودّت کے۔

یاد رہے کہ مَودّت کا درجہ محبّت سے بڑھ کر ہے۔ مَودّت کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے کے لیے کچھ قربانی دی جائے۔

یہ عمل حضرت علیؑ تک ہی محدود نہ تھا، ان کے جانشینوں کو بھی خدائی کا رتبہ دے دیا گیا تھا۔ ایسے بدعقیدہ لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام ثامن امام علی بن موسیٰ رضاؑ اپنی دُعا میں فرماتے ہیں:

"خُدایا! میں بیزار ہوں ان لوگوں سے جو ہمارے لیے ایسی بات کہتے ہیں جس کے ہم سزاوار نہیں۔ اور میں بیزار ہوں ان لوگوں سے جو ہم سے ایسی بات منسوب کرتے ہیں جو ہم نے کبھی کہی ہی نہیں۔

خُدایا! زندگی اور مَوت دینا تجھ سے مخصوص ہے اور روزی رساں بھی صرف تو ہے۔ میں تو فقط تیری عبادت کرتا ہوں اور تجھی سے مدد مانگتا ہوں۔ تو ہی میرا، میرے آباء واجداد کا اور میری اولاد کا خالق ہے اور ربوبیت تیرے سوا کسی اور کو زیبا نہیں۔"

پس جاننا چاہیے کہ جن لوگوں نے عَبد کو مَعبُود بنا دیا انھوں نے عَبد سے محبّت میں غُلو کیا جو کفر کی حدوں میں آتا ہے، جیسا کہ حضرت امیرالمومنینؑ کا قول ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"کُفر ان چار ستونوں پر قائم ہے: گناہ۔ شک۔ شبہ اور۔ غُلو۔"

علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں:

◐ جو شخص یہ مانے کہ "اللہ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ اور ان کے اولیاءِ باصفا کو خلق فرمایا اور پھر ساری مخلوق کی خلقت اور تربیت ان کو سونپ دی" وہ غالی ہے۔

اس میں شیعوں کی کیا خطا اگر رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے کہ
"علیؑ! تم دنیا میں بھی سردار ہو اور آخرت میں بھی سردار ہو، جس نے تم سے محبّت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے تم سے بُغض رکھا اس نے مجھ سے بُغض رکھا۔ تمھارا دوست اللہ کا دوست ہے اور تمھارا دشمن اللہ کا دُشمن ہے۔ خرابی اس کی ہے جو تم سے دشمنی رکھے!" (مُستدرکِ حاکم جلد ۳۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث علی شرط الشیخین صحیح ہے۔ ینابیع المودۃ۔ الریاض النضرۃ جلد ۲ صفحہ ۱۸۵)

◐ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں:
"جو شخص حضرت امیرالمومنینؑ یا آپ کی اولاد میں سے کسی امام کو خُدا یا نبی مانے وہ غالی ہے۔"

◐ شیخ صدوقؒ فرماتے ہیں:
"غُلات (جمع ہے غالی کی) یہودیوں اور نصرانیوں سے بدتر اور کافر ہیں۔"

غالی فرقوں میں سے (جن کا ذکر شہرستانی نے الملل والنحل میں، نوبختی نے فِرقُ الشیعہ میں اور مقریزی نے خِطط میں کیا ہے) اکثر تو مٹ گئے ہیں مگر کچھ اب بھی کسی نہ کسی شکل میں اور کہیں نہ کہیں باقی ہیں۔ انھوں نے ائمۂ اہلبیت سے محبّت وعقیدت ہی میں جوش اور مبالغے سے کام نہیں لیا بلکہ بہت سے ایسے عقائد بھی اختیار کرلیے جن کا اسلام سے دُور کا بھی تعلّق نہیں۔ جیسے تناسُخ اور حُلول وغیرہ۔ حتّیٰ کہ بعض نے تو حلال حرام کی تمیز ہی اُٹھا دی اور حشر نشر کا بھی انکار کردیا۔

غالیوں کا ایک فرقہ نصیری ہے جو محمد بن نصیر نمیری کی طرف منسوب ہے۔ یہ شخص حضرت امام حسن عسکریؑ کا صحابی تھا، بعد میں آپ کی امامت کا مُنکر ہوگیا اور اپنی امامت کا دعویٰ کر بیٹھا۔ نصیری فرقہ آج بھی غالباً ملک شام کے شمالی اطراف میں آباد ہے۔ یہ فرقہ حضرت علیؑ کی خُدائی کا قائل ہے۔ اس کے علاوہ ترکی کا تختاجی فرقہ اور ترکستان کا علی اللّٰہی فرقہ بھی آپ کی خُدائی کے مُعتقد ہیں۔ واللہ اعلم

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا :
علیؑ سے محبت ایمان ہے اور علیؑ سے بُغض نِفاق ہے۔
(صحیح مسلم جلد ا صفحہ ۴۸ - کنز العمال جلد ۱۵ صفحہ ۱۰۵)
آپؐ نے یہ بھی فرمایا :
"جو شخص آخر دم تک آلِ محمدؑ کی محبت پر قائم رہا وہ شہید مرا۔ یاد رکھو جو آلِ محمدؐ کی محبت پر مرا اس کی بخشش ہوگئی، یاد رکھو جو آلِ محمدؐ کی محبت پر مرا وہ گویا سب گناہوں سے توبہ کرکے مرا

شہرستانی الملل والنحل میں لکھتے ہیں کہ
"ایک غالی فرقہ دعویٰ کرتا تھا کہ حضرت علیؑ قتل نہیں ہوئے ہیں، وہ اب بھی زندہ ہیں۔ ایک اور دیو مالائی تصورات رکھنے والا فرقہ کہتا تھا کہ بادل حضرت علیؑ کی دیولوک ہے۔ یہ بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک آپ ہی کی آواز ہے۔"
ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں کہ
"ایک شخص مُغیرہ بن سعید کہا کرتا تھا کہ حضرت علیؑ اگر چاہیں تو عاد و ثمود اور ان دونوں قوموں کے درمیان کی صدیوں کے سب لوگوں کو زندہ کردیں۔"
غُلات کے ایسے ہی باطل عقائد کی بنا پر ائمہ اہلبیتؑ میں سے حضرت امام محمد باقر، حضرت امام جعفر صادق، حضرت امام علی نقی اور حضرت امام حَسَن عسکری علیہم السلام نے ان سے اپنی لاتعلّقی کا اظہار کیا بلکہ ان پر بارہا لعنت کی اور اپنے اصحاب سے بھی لعنت کرنے کو کہا۔

پس یہ کہنا صحیح ہے کہ غالیوں کا شیعہ اثنا عشریوں سے قطعاً کوئی تعلّق نہیں اور ان کے اقوال و عقائد کی وجہ سے ان پر اعتراض کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ شیعہ اپنے مَحبُوب کو مَعبُود نہیں کہتے، بلکہ ان کے لیے وہ کچھ کہتے اور مانتے ہیں جو ان کا حق ہے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ان کے مناقب میں کہا ہے۔ مختصر یہ کہ ائمہ اہلبیت کی ولایت شیعوں کی شناخت ہے، کیونکہ :

ائمہؑ اہلبیت اللہ کی حُجّت اور رسول اللہ ﷺ کی ذُرّیت ہیں۔ یہ نفوسِ قُدسیہ درود میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ ساری اُمّت سے افضل اور ممتاز ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ انھیں کو

یاد رکھو جو آلِ محمدؐ کی محبّت پر مرا وہ کامل الایمان مرا- یاد رکھو جو آلِ محمدؐ کی محبّت پر مرا اسے مَوت کا فرشتہ جنّت کی بشارت دے گا- (تفسیر ثعلبی، تفسیر زمخشری، تفسیر فخرالدین رازی)

اِس میں شیعوں کی کیا خطا اگر وہ ایسے شخص سے محبّت کرتے ہیں جس کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا:

کل میں عَلَم ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبّت کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کو اس سے

مُباھَلَہ میں لے کر گئے تھے - یہ اصحابِ کِساء اور آیۂ تطہیر کا مصداق ہیں- انھیں کے بارے میں رسول اللہؐ نے کہا تھا کہ ان کا دوست میرا دوست ہے اور ان کا دشمن میرا دشمن ہے - انھیں کی شان میں سورۂ کوثر بھی اُتری - اور سورۂ ھَلْ اَتٰی بھی اُتری - یہی رسول اللہؐ کے وہ قرابت دار ہیں جن کی مَوَدّت کو اللہ نے واجب کیا ہے- یہی ائمہ قرآن کے ترجمان اور رسالت کے پاسبان ہیں اور یہی ائمہ انسانیت کے لیے مَلجَا وماوٰی ہیں-

ائمۂ اہلبیت رسول اللہؐ کے بعد دین کی تبلیغ میں مصروف رہے کیونکہ رسول اللہؐ نے انھیں اپنی مِنّیَت میں قرار دیا تھا- انھوں نے ہی دُنیا کو عبادت کا ڈھنگ اور دُعاء کا آہنگ سکھایا اور حلال وحرام سمجھایا - یہی خانوادۂ رسالت شریعت کا امین ہے اور اس نے شریعت کو بدعت سے بچانے میں فعّال کردار ادا کیا - مسجدوں سے گونجتی یہ تکبیریں اور محرابوں سے اُٹھتی لَااِلٰہ کی یہ صدائیں انھیں کی محنتوں اور قربانیوں کے صدقے میں باقی ہیں - انھیں ہیں بابِ مدینۂ علم ہیں اور انھیں ہیں بابُ الحوائج ہیں - انھیں کا نام نا امیدی اور مایوسی میں مژدۂ جانفزا ہے - انھیں کے توسّل سے دُعائیں مستجاب ہوتی ہیں اور انھیں کی شفاعتیں باریاب ہوتی ہیں کیونکہ انھیں اذنِ شفاعت دیا گیا ہے-

ائمۂ اہلبیت ہی اُولِی الامر ہیں اور رَاسِخُونَ فِی الْعِلم ہیں - یہی لوگ تو ہدایت یافتہ اور ہدایت کرنے والے ہیں - یہی نجات کا سفینہ اور عُلومِ رَبّانی کا خزینہ ہیں - یہی لوگ تو ہیں جن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور جن کی مُخالفت اللہ کی مخالفت ہے- کیونکہ یہ اللہ کے چنیدہ اور برگزیدہ بندے ہیں - انھیں کے سرور وسردار حضرت علیؑ کو قرآن نے تاجِ ولایت پہنایا ہے - اور رسول اللہؐ نے ان کی ولایتِ کبریٰ کو اللہ کا حِصار بتایا ہے-

محبّت ہے۔ (صحیح مسلم جلد ۴)

معلوم ہوا کہ جس کو علیؑ محبوب ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہے اور وہ مومن ہے۔ اور جس کو علیؑ ناپسند ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہے اور وہ مُنافِق ہے۔

امام شافعی نے حُبِّ اہلِ بیت کے بارے میں کہا ہے :

یَا اَھْلَ بَیْتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ حُبُّکُمْ

فَرْضٌ مِّنَ اللّٰہِ فِی الْقُرْاٰنِ اَنْزَلَہٗ

اے اہلِ بیت رسولؐ ! تمھاری محبّت اللہ نے قرآن میں فرض کی ہے،

کَفَاکُمْ مِّنْ عَظِیْمِ الْقَدْرِ اَنَّکُمْ

مَنْ لَّمْ یُصَلِّ عَلَیْکُمْ لَاصَلٰوۃَ لَہٗ

تمھاری فضیلت کے بیان میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ جس نے نماز میں تم پر درود نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں ہوئی۔

کون ہے جو اس سے انکار کرے کہ

حضرت علیؑ سیّد المسلمین ہیں ، امیرُ المومنین ہیں ، امامُ المتقین ہیں قائدُ الغرِّ المحجّلین ہیں۔ یا یہ کہ آپ ہی بُت شِکن ، خیبر شکن اور یعسوبُ الدّین ہیں۔ لیلۃُ المبیت آپ نے بستر رسولؐ پر سو کر جاں نثاری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

حضرت علیؑ نہجُ البلاغہ میں ائمۂ اہلبیت کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں :

"اِس امت میں کسی کو آلِ محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دین کی بُنیاد اور یقین کے سُتون ہیں۔ حقِ ولایت کی خصُوصیات انھیں کے لیے ہیں اور یہی رسول اللہؐ کے وصی اور وارث ہیں۔"

بلاشبہ حضرت علیؑ علمِ رسولؐ کے وارث ہیں کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا : اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ اور خود حضرت علیؑ فرماتے ہیں : لَقَدْ عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ اَلْفَ بَابٍ کُلُّ بَابٍ یَفْتَحُ اَلْفَ بَابٍ۔ ایک موقع پر آپ نے اپنے سینہ

فرزدق اپنے مشہور قصیدہ میمیہ میں حُبّ اہلِ بیت کے بارے میں کہتا ہے:

مِنْ مَّعْشَرٍ حُبُّهُمْ دِيْنٌ وَّ بُغْضُهُمْ
كُفْرٌ وَّ قُرْبُهُمْ مُنْجِيٌ وَّ مُعْتَصِمٌ

ان کا تعلّق اس خاندان سے ہے جس سے محبّت کرنا دین ہے اور جس سے بُغض کُفر ہے اور جس سے قُرب میں نجات اور پناہ ہے۔

اِنْ عُدَّ اَهْلُ التُّقٰى كَانُوْا اَئِمَّتَهُمْ
اَوْ قِيْلَ مَنْ خَيْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ قِيْلَ هُمْ

اگر اہلِ تقویٰ کا شمار کیا جائے تو یہ ان کے امام ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ زمین پر بسنے والوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ تو کہا جائے گا: یہی تو ہیں۔

شیعہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبّت کرتے ہیں اور اسی محبّت کی وجہ سے

مُبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اِنَّ هٰهُنَا لَعِلْمًا جَمًّا۔

ایک دُوسرے موقع پر آپ نے کہا:

سَلُوْنِيْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِيْ۔

اور ایک بار آپ نے فرمایا تھا:

"میں زمین کے راستوں سے زیادہ آسمان کے راستوں سے واقف ہوں۔"

یہ بھی آپ ہی نے کہا تھا کہ:

"اگر میں مسند قضاوت پر بیٹھوں تو اہلِ تورات میں تورات سے، اہلِ انجیل میں انجیل سے اور اہلِ قرآن میں قرآن سے فیصلہ کروں۔"

آپ کی اَعلَمیّت کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت عُمر نے کہا تھا: لَوْلَا عَلِيٌّ لَّهَلَكَ عُمَرُ۔

آپ کی عِلمیت کے متعلق ہم یہ تو نہیں کہتے کہ آپ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ کا سارا علم

جانتے تھے لیکن یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ کچھ بھی علمِ غیب نہیں جانتے تھے۔ کیونکہ اللہ جسے چاہتا ہے امور غیب سے مطلع کر دیتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ۔ پس اگر حضرت علیؑ مستقبل کی کوئی خبر دیتے ہیں تو یہ رسول اللہؐ سے حاصل کیا ہوا علم تھا، کہانت نہیں۔ جیسا کہ فرعون کے نجومیوں نے حضرت موسیٰؑ کے پیدا ہونے کی خبر دی تھی۔

مولا الموحدین، امیرالمومنینؑ خود نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"اللہ ہی جانتا ہے کہ قیامت کب آئے گی اور یہ کہ شکموں میں کیا ہے نر یا مادہ، بدصورت ہے یا خوبصورت، سخی ہے یا بخیل، بدبخت ہے یا خوش نصیب اور کون جہنّم کا ایندھن بنے گا اور کون جنّت میں نبیوں کا رفیق ہوگا۔ یہ وہ علمِ غیب ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ رہا دوسری چیزوں کا علم، تو وہ اللہ نے اپنے نبی کو دیا اور نبی نے مجھے دیا۔"

خلاصہ یہ کہ شیعہ ائمہ کی ولایت، اَعلمیت اور عصمت کے قائل ہیں اُلوہیت یا ربوبیت کے نہیں۔ وہ غالیوں کی طرح انھیں ان کے درجے سے نہیں بڑھاتے اور نہ ہی ناصبیوں کی طرح انھیں ان کے مقام و مرتبے سے گراتے ہیں۔ وہ تو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو عزیز رکھتے ہیں کیونکہ ان کے ائمہ نے انھیں یہی سکھایا ہے کہ

"ہر چیز کو اسلام پر قربان کیا جاسکتا ہے مگر اسلام کو کسی بھی چیز پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔"

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ
وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ۔
(سورۂ احزاب۔ آیت ۳۹)

(ناشر)

اِس مضمون کی احادیث بے شمار ہیں جو اہل سُنّت کی احادیث کی کتابوں میں بھی موجود ہیں[1] اختصار کے پیش نظر ہم نے صرف چند احادیث نقل کی ہیں۔

اگر رسولؐ سے محبّت میں علیؑ اور اہلِ بیتؑ سے محبّت بھی شامل ہے تو ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم معلوم کریں کہ اہلِ بیت سے جو محبّت مطلوب ہے اس کی حد کیا ہے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ کیا شیعہ اہلِ بیت سے محبّت میں غُلوّ سے کام لیتے ہیں جیسا کہ اہلِ سُنّت کا خیال ہے :

رسول اللہؐ نے فرمایا :

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اپنے بیٹے ، اپنے والد اور کل خلائق سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔"[2]

اس بُنیاد پر یہ ضروری ہے کہ مسلمان علیؑ سے اور اولادِ علیؑ میں سے ائمہ طاہرینؑ سے دُوسرے سب لوگوں سے زیادہ محبّت کریں جن میں خُود ان کے بیوی بچے بھی شامل ہیں ، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو گا کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اُسے سب سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔"

اِس سے معلوم ہوا کہ شیعہ غُلوّ نہیں کرتے بلکہ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے خود فرمایا ہے کہ

"علیؑ کی مثال جسم میں سر کی سی ہے اور سر میں آنکھوں کی سی۔"

تو کیا کوئی شخص اپنی آنکھوں سے یا اپنے سر سے دست بردار ہو سکتا ہے ؟ اِس کے برعکس ، اہلِ سُنّت ضرور صحابہ کی مَحبّت میں غُلوّ سے کام لیتے ہیں

---

[1] اہلِ بیت کے فضائل ومناقب سے متعلق حدیثوں کو علامہ سیّد مرتضیٰ حُسینی فیروز آبادی نے فضائل الخمسۃ من الصحاح الستۃ میں جمع کر دیا ہے۔ (ناشر)

[2] صحیح بُخاری جلد اول صفحہ ۴۹ (باب وُجوب مَحبّۃِ رسولِ اللہؐ) یہ حدیث صحیح ترمذی میں بھی ہے۔

اور ان کو بے جا طور پر مقدس سمجھتے ہیں۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ردِّ عمل ہے اس کا کہ شیعہ سب صحابہ کی عدالت کے قائل نہیں۔

چنانچہ اُمویوں کی یہ پالیسی تھی کہ وہ صحابہ کی شان بڑھاتے تھے اور اہلِ بَیتِ نبوی کا درجہ گھٹاتے تھے، حتّٰی کہ محمدؐ و آلِ محمدؑ پر درود میں بھی وَعَلٰی اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ کیونکہ درود اہلِ بیت کی ایسی فضیلت ہے جس میں اگلے پچھلوں میں سے کوئی بھی ان کا شریک و سہیم نہیں، بنی اُمیّہ چاہتے تھے کہ صحابہ کو بھی اس بلند درجے تک پہنچا دیں۔ وہ یہ نظر انداز کر جاتے تھے کہ اللہ سُبْحَانَہٗ نے سب مسلمانوں کو جن میں صحابہ بدرجۂ اَولیٰ شامل تھے حکم دیا ہے کہ محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ اور حسنینؑ پر درود بھیجیں، اور جس نے ان پر درود نہیں بھیجا اور فقط محمدؐ پر اکتفا کیا[1]، اس کی نماز مقبول نہیں ہوگی، جیسا کہ صحیح بُخاری اور مُسلم سے ثابت ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اہلِ سُنت صحابہ کے معاملے میں غلوّ کرتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ سُنّت معقول حد سے تجاوز کر کے سب صحابہ کی عدالت کے قائل ہیں۔

اہلِ سُنّت کا غُلوّ اس وقت ظاہر ہو جاتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ غلطی کرتے تھے جس کی اصلاح کوئی صحابی کرتے تھے۔ یا وہ یہ کہتے ہیں کہ شیطان

---

[1] حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے دشمن عاص بن وائل سہمی نے آپ کو اَبْتَر یعنی بے اولاد ہونے کا طعنہ دیا تو خداوندِ عالم نے آپ کو کَوْثَر (آلِ محمدؑ) عطا فرمایا اور آپ کے دشمن کی نسل کو، جس پر اسے گھُمنڈ تھا، ختم کر دیا۔ اس لیے آنحضرتؐ نے فرمایا: مجھ پر صلوٰۃ بَتْرا، نہ بھیجو۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہؐ! صلوٰۃ بَتْرا، کیا ہے؟ فرمایا: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کہہ کر رُک جانا۔ لہٰذا مجھ پر یوں درود نہ بھیجو بلکہ کہو: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ۔ (صَواعق محرقہ)

پس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وغیرہ کہنا سب صلوٰۃ بَتْرا کے ذیل میں آتا ہے۔ (ناشر)

رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں تو ہنستا کھیلتا رہتا تھا لیکن ابنُ الخطاب کو دیکھ کر بھاگ جاتا تھا۔

غُلوّ اور بھی زیادہ واضح ہوجاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ سُنّت رسول اللہ ﷺ کی سُنّت کو چھوڑ کر صحابہ خصوصاً خلفائے راشدین کی سُنت کا اتباع کرتے ہیں۔

قارئینِ محترم!

حق و باطل اور ہدایت وضلالت کے دوراہے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو ڈاکٹر تیجانی نے اپنی اس بحث میں ایک راہ دکھا دی ہے۔ اب یہ حقیقت کے شیدائیوں اور ہدایت کے متلاشیوں کا کام ہے کہ وہ بھی تحقیق کا بیڑا اٹھائیں تاکہ جس طرح ڈاکٹر صاحب کا دل دس سالہ تحقیقِ عمیق کے بعد ایمان کی تجلّی سے پُرنور ہوا ہے، ان کے دل بھی منوّر ہوجائیں۔ البتہ ہدایت کے اس سفر میں یہ بات صادق آتی ہے کہ از تو حرکت، از خدا برکت یعنی ڈھونڈھنے والا حق کو ڈھونڈھے اور واقعی ظلمتُ الظلمات سے عزمِ ہجرت کرے کیونکہ ارشادِ ربّانی ہے: وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔

ظاہر ہے کہ تلاشِ حق کا یہ مُعاملہ انتہائی نازک اور سنجیدہ ہے کیونکہ اس کا تعلّق جنّت یا جہنّم سے ہے نجات یا عذاب سے ہے لہذا کون چاہے گا کہ وہ جہنّم کا ایندھن بنے۔ پس متلاشیٔ حق کو چاہیے کہ فرقہ واریت سے بالاتر ہوکر چراغِ عقل کی روشنی میں غور وفکر کرے اور اپنے ضمیر سے فیصلہ چاہے، کیونکہ ضمیر کی عدالت میں بندہ ہوتا ہے اور خُدا!

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

ناشر

مصادر

کتبِ تفسیر

التسهیل لعُلوم التنزیل	ابُو المُنذِر ہشام بن محمد سائب کلبیؒ	متوفّٰی ۲۰۴ھ
جامعُ البیان فِی تفسیرِ القرآن	امام ابو جعفر محمد بن جریر طبریؒ	۳۱۰ھ
احکامُ القرآن	ابو بکر احمد بن علی رازی جَصَّاصؒ	۳۷۰ھ
التفسیرُ الکبیر	امام ابو اسحاق احمد بن محمد ثعلبیؒ	۴۲۶ھ
نُزولُ القرآن	حافظ ابو نُعَیم احمد بن عبد اللہ اصفہانی	۴۳۰ھ
مَا نزَلَ مِنَ القرآنِ فِی علیؑ	" " "	۴۳۰ھ
اَسبابُ النزول	امام ابُو الحسن علی بن احمد واحِدی	۴۶۸ھ
شَواہدُ التنزیل لقواعدِ التفصیل	عُبیدُ اللہ بن عبد اللہ (حاکم حسکانیؒ)	۴۹۰ھ
الکشّاف عن حقائقِ غوامضِ التنزیل	امام جارُ اللہ محمود بن عمر زِمَخشریؒ	۵۲۸ھ
التفسیرُ الکبیر	امام فخر الدین محمد بن عُمر رازیؒ	۶۰۶ھ
زادُ المسیر فی عِلمِ التفسیر	شمسُ الدین یُوسف قزاوغلی (سبط ابنِ جوزیؒ)	۶۵۴ھ
الجامع لِاحکامِ القرآن	ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبیؒ	۶۷۱ھ
تفسیر القرآن الکریم	ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نَسَفیؒ	۷۱۰ھ
مُقدّمہ اُصولِ تفسیر	ابُو العبّاس احمد بن عبد الحلیم حرّانی (ابنِ تیمیہ)	۷۲۸ھ

تفسیر الخازن	علاءُ الدین علی بن محمّد بغدادی متوفّٰی	سنہ ۷۴۱ھ
تفسیر غرائب القرآن	نظامُ الدین حسن بن محمد نیشاپوری	سنہ ۸۵۰ھ
تفسیر جلالین	حافظ جلالُ الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی	سنہ ۹۱۱ھ
الدرُّ المنثور فی التفسیرِ بالماثور	〃 〃	سنہ ۹۱۱ھ
الفتحُ القدیر	قاضی محمّد بن علی یمانی شوکانی	سنہ ۱۲۵۰ھ
تفسیر المنار	شیخ محمد عبدہ مصری	سنہ ۱۳۲۳ھ
المیزان فی تفسیرِ القرآن	علامہ محمد حسین طباطبائی	سنہ ۱۴۰۲ھ
التحریر والتنویر	شیخ محمّد طاہر بن عاشور	سنہ ھ

کتبِ حدیث

مُوطّا	امام مالک بن انس بن مالک اصبحی	سنہ ۱۷۹ھ
صحیح مُسلم	امام ابوالحسن مسلم بن حجّاج قُشیری نیشاپوری	سنہ ۲۶۱ھ
مُسند	امام احمد بن حنبل شیبانی مروزی	سنہ ۲۴۱ھ
سُننِ دارمی	حافظ ابومحمّد عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی	سنہ ۲۵۵ھ
صحیح بُخاری	امام ابوعبداللہ محمّد بن اسماعیل بُخاری	سنہ ۲۵۶ھ
سُننِ ابنِ ماجہ	حافظ محمّد بن یزید بنِ ماجہ قزوینی	سنہ ۲۵۹ھ
سُنَنِ ابوداؤد	حافظ ابوداؤد سُلیمان بن اشعث سجستانی	سنہ ۲۷۵ھ
جامع ترمذی	حافظ محمد بن عیسیٰ سُلمی ترمذی	سنہ ۲۷۹ھ

سُنن نَسائی — حافظ ابو عبدالرحمن احمد بن شعیب نَسائی متوفی — ۳۰۳ھ

سُنن دارقطنی — حافظ ابوالحسن علی بن عُمر دارقطنی — ۳۸۵ھ

مُستدرک علی الصحیحین — ابوعبداللہ محمدّ بن عبداللہ حاکمِ نیشاپوری — ۴۰۵ھ

سُنن کبریٰ — حافظ ابوبکر احمد بن حُسین بیہقی — ۴۵۸ھ

جامع الاصول — ابوالحسن عزّ الدین علی بن محمدّ جزری (ابنِ اثیر) — ۶۳۰ھ

منہاجُ السنّۃ النبویّہ — ابُوالعبّاس احمد بن عبدالحلیم حرّانی (ابنِ تیمیہ) — ۷۲۸ھ

مجمعُ الزوائد ومنبعُ الفوائد — حافظ نورُالدین علی بن ابی بکر ہیثمی — ۸۰۷ھ

فتح الباری فی شرحِ صحیحِ البخاری — قاضی شہاب الدین احمد بن علی کنانی (ابنِ حجر عسقلانی) — ۸۵۲ھ

جمعُ الجوامع — حافظ جلالُ الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی — ۹۱۱ھ

کنزُ العمّال من سُنن الاقوال والافعال — علامہ علی بن حسام الدین متّقی ہندی — ۹۷۵ھ

کُنوزُ الحقائق فی حدیثِ خیرِ الخلائق — علامہ عبدالرؤف مناوی — ۱۰۳۱ھ

الجمعُ بینَ الصحاح الستّہ — عبدری — ھ

کتبِ سیرت

سیرتُ النبیؐ — عبدالملک بن ہشّام حمیری — ۲۱۸ھ

المعارف — ابومحمّد عبداللہ بن مُسلم (ابنِ قتیبہ) — ۲۷۶ھ

انسابُ الاشراف — احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری — ۲۷۹ھ

حِلیۃُ الاولیاء — حافظ ابونُعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی — ۴۳۰ھ

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب	حافظ یوسف بن عبداللہ نمری قرطبی (ابن عبدالبر) متوفی	۴۶۳ھ
اُسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ	ابوالحسن عزالدین علی بن ابی الکرم جزری (ابن اثیر)	۶۳۰ھ
الریاض النضرۃ فی مناقب العشرہ	امام ابوجعفر احمد بن عبداللہ (محب طبری)	۶۹۴ھ
الاصابہ فی تمییز الصحابہ	قاضی شہاب الدین احمد بن علی کنانی (ابن حجر عسقلانی)	۸۵۲ھ
انسان العیون فی سیرۃ الامین والمامون (سیرت حلبیہ)	علامہ علی بن برہان حلبی	۱۰۴۴ھ
سیرۃ النبویہ و آثار المحمدیہ	احمد بن زینی بن احمد دحلان	۱۳۰۴ھ
حیات محمدؐ	محمد حسین ہیکل	۱۳۷۷ھ
الفتنۃ الکبریٰ	طٰہٰ حسین	۱۳۹۳ھ

کتبِ تاریخ

الطبقات الکبریٰ	محمد بن سعد کاتب واقدی	۲۳۰ھ
تاریخ الکبیر	امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری	۲۵۶ھ
الامامۃ والسیاسۃ	عبداللہ بن مسلم دینوری (ابن قتیبہ)	۲۷۶ھ
تاریخ الیعقوبی	احمد بن ابی یعقوب (ابن واضح یعقوبی)	۲۹۲ھ
تاریخ الامم والملوک	امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری	۳۱۰ھ
العقد الفرید	ابوعمر احمد بن محمد بن عبد ربہ اندلسی	۳۲۷ھ
مروج الذہب ومعادن الجوہر	علی بن حسین مسعودی	۳۴۶ھ
تاریخ بغداد	حافظ ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی	۴۶۳ھ

تاریخ مدینۂ دمشق	ابوالقاسم علی بن حسن دمشقی (ابنِ عساکر) متوفّٰی	۵۷۱ھ
الکامل فی التاریخ	ابوالحسن عزالدین علی بن ابی الکرم جزری (ابنِ اثیر)	۶۳۰ھ
شرح نہج البلاغہ	عزالدین ابوحامد بن ھبۃ اللہ مدائنی (ابن ابی الحدید)	۶۵۵ھ
المختصر فی اخبارِ البشر	علامہ ابوالفداء اسماعیل بن علی (ابوالفداء)	۷۳۲ھ
البدایۃ والنہایہ	حافظ عمادالدین ابوالفداء اسمٰعیل بن عمر دمشقی (ابنِ کثیر)	۷۷۴ھ
العبر و دیوان المبتداء والخبر	ولی الدین عبدالرحمٰن بن محمد اشبیلی (ابنِ خلدون)	۸۰۸ھ
روضۃ المناظر فی اخبارِ الاوائل والاواخر	قاضی محب الدین محمد بن محمد حلبی (ابن شحنہ)	۸۱۵ھ

کتبِ متفرقہ

بلاغاتُ النساء	ابوالفضل احمد بن ابی طاہر مروزی (ابن طیفور)	۲۸۰ھ
خصائص امیرالمؤمنینؑ	حافظ ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی	۳۰۳ھ
دلائلُ الامامۃ	امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری	۳۱۰ھ
الولایہ	" " "	۳۱۰ھ
معجم الصغیر و معجم الکبیر	ابوالقاسم سلیمان بن احمد لخمی طبرانی	۳۶۰ھ
مناقب علی بن ابی طالبؑ	شیخ علی بن محمد بن مغازلی شافعی	۴۸۳ھ
سرّ العالمین	حجۃ الاسلام ابوحامد محمد بن محمد غزالی طوسی	۵۰۵ھ
احیاء علوم الدین	" " "	۵۰۵ھ
ربیعُ الابرار	امام جاراللہ محمود بن عمر زمخشری	۵۲۸ھ

الملل والنحل — ابوالفتح محمد بن عبدالکریم بن ابی بکر احمد شہرستانی — متوفّٰی ۵۴۸ھ

الفتوحات المکیّہ — ابوعبداللہ محی الدین محمد بن علی (ابن عربی) — ۶۳۸ھ

تذکرۃ السبط — شمس الدین یوسف بن قزاوغلی (سبط ابن جوزی) — ۶۵۴ھ

تذکرۃ خواص الامّہ — " " " — ۶۵۴ھ

مطالب السئول فی مناقب آل الرسول — ابوسالم کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی — ۶۵۲ھ

کفایۃ الطالب فی مناقب علی بن ابی طالبؑ — ابوعبداللہ محمد بن یوسف کنجی شافعی — ۶۵۸ھ

تلخیص — ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی — ۷۴۸ھ

سِرّ اعلام النبلاء — " " — ۷۴۸ھ

الفصول المہمّہ — نورالدین علی بن محمد بن صبّاغ مالکی — ۸۵۵ھ

الازدہار فی ما عقدہ الشعراء من الاشعار — حافظ جلال الدین سیوطی — ۹۱۱ھ

جامع الصغیر و جامع الکبیر — " — ۹۱۱ھ

ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری — ابوالعباس شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی — ۹۲۳ھ

صواعق المحرقہ فی الرد علی اہل البدع والزندقہ — شہاب الدین ابن حجر ہیثمی مکّی — ۹۷۴ھ

عقائد الاکابر — سیّد عبدالوہاب شعرانی — ۹۷۶ھ

احقاق الحق — قاضی نوراللہ حسینی تستری شہید — ۱۰۹۱ھ

اسعاف الراغبین — محمد علی صبّان مصری — ۱۲۰۶ھ

ینابیع المودّۃ — حافظ سلیمان بن ابراہیم قندوزی — ۱۲۹۱ھ

شرح نہج البلاغہ	شیخ محمد عبدہ مصری	متوفی ۱۳۲۳ھ
الصِّلۃُ بَینَ النصوصِ والتشیّعُ	شَیبی	ھ
اَعلام النساء	عُمر رضا	ھ
نورُالابصار	مومن بن مومن شبلنجی مصری	ھ
تواریخ موالیدِ الائمہ	ابنِ خشاب	ھ
فصلُ الخطاب	محمد بُخاری حنفی	ھ
الحدیثُ المتسلسل	بلاذُری	ھ
مراۃُ الاسرار	عارف عبدالرحمٰن	ھ
شرحُ المواہب	زرقانی	ھ
فضائلُ الخمسۃ من الصحاح الستّہ	علّامہ مرتضیٰ حسینی فیروز آبادی	ھ